

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور گفتہ تحریریں

سیارہ ڈائجسٹ

نومبر 2011

PDFBOOKSFREE.PK

عمران خان کے روحانی تجربات

القرآن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة المائدہ

مکروہ جنہوں نے توبہ کر لی۔ اس سے پہلے کہ تم قابو پا لو ان پر (ان کو معاف کر دیا جائے گا) اور خوب جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اسے ایمان والوں و اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ اور جدوجہد کرو اس کی راہ میں تاکہ تم قلاع پاؤ۔ بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر ان میں سے کسی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تاکہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) مذاب سے روز قیامت یہ قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کیلئے عذاب دردناک ہوگا۔ بہت چاہیں گے کہ نکلیں اس آگ سے اور وہ نہیں نکل سکیں گے اس سے اور ان کیلئے عذاب ہوگا ہمیشہ رہنے والا اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی کی (سزا یہ ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ بدل دینے کیلئے جو انہوں نے کیا (اور) عبرت لیں۔ اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ غائب ہے حکمت والا ہے پھر جس نے توبہ کر لی اپنے (اس) ظلم کے بعد اور اپنے آپ کو ستوا دیا تو بے شک اللہ تعالیٰ توجہ فرمانے والا ہے۔ اس پر بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔

(آیت 34 تا 39) (ترجمہ بحوالہ فیضان القرآن)

الحديث

بسم الله الرحمن الرحيم

تمتع قرآن اور حج مفرد کا بیان

آئمہ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ مدینہ سے طے اور ہمیں صرف حج کا خیال تھا (یعنی حج کا احرام باندھا تھا) پھر جب ہم مکہ پہنچے اور کعبہ کا طواف کر چکے تو نبی ﷺ نے حکم دیا کہ جس کیساتھ قربانی نہیں وہ (حج کے احرام سے باہر ہو جائے پس جس لوگوں کے پاس قربانی نہیں تھی وہ احرام سے باہر ہو گئے اور آپ ﷺ کی ازواج کیساتھ بھی قربانی نہیں تھی لہذا وہ احرام سے باہر ہو گئیں۔ آئمہ المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حاضر ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کا طواف نہ کر سکی جب صبح کی رات آئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ لوگ تو عمرہ اور حج دونوں کے کر لوئیں گے اور میں صرف حج کر کے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو جب مکہ آئی تھی تو طواف نہیں کیا تھا؟ میں نے کہا نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو اپنے بھائی کے ساتھ جمعہ تک جا، وہاں سے عمرے کا احرام باندھ لے پھر عمرے سے فارغ ہو کر فلاں جگہ پر ایسے ملنا۔ آئمہ المؤمنین صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اپنے آپ کو تم سب کا روکنے والا سمجھتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا قرآن پڑھ لی کیا تم نے قربانی والے دن طواف نہیں کیا؟ صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے عرض کیا ہاں کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر کچھ حرج نہیں چلو۔

(آیت 34 تا 39) (ترجمہ بحوالہ فیضان القرآن)

اسی شمارے میں

2	القرآن	ضیاء القرآن	قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے!
3	الحديث	ادارہ	شیخ قرآن بورج عسکر دیکھیں اور ہمیں بخش کر! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سچ کا لڑا لڑا لڑو! وہ لوگوں کے بدلے میں شہرہ فرمادیں گی! درست ہے
14	دستک	کاروان احمد خان	پاک امریکہ تعلقات فیصلہ کن موڑ پر
39	یوگان	عارف محمود علی	قوت فیصلہ کو جیت کر شمال ایک انتہائی دلچسپ کمیل
43	ایک سے ایک	انجم انصار	لیٹینون کے کرشمے جلوس کی صلیب تلوار کر کے کاسب بن جاتا ہے!
46	گواہوں میں برابری	ڈاکٹر ذکریا نیک	گواہی کیلئے عورت اور مرد میں برابری کے حوالے سے غیر مسلموں کے سوالات کے جواب میں ایمان فروغ دینا
49	خود جلس دیدار اخبار کو پھینک دیں	ظفر حسین	ایسی مثال خیر بردار کا گلدستہ نہیں بننے کیلئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی و کارروائی ہے!
69	لیبیا: شمالی افریقہ کا مسلمان ملک	سید وقار عظیم	لیبیا کی تاریخ اور موجودہ حالات کے متعلق تحقیقی مضمون!
75	آزادوں	تسلیم کرشنچیر	ایک ہندوئی کی کہانی جن کی حال اس کو بچپن کیے کشتی
91	پارس ہاتھ	رسول نبین	ایک شخص کی کہانی جو پوری ہستی کی امیدوں کا تھوڑا سا سندھی ادب سے انتخاب!
97	دولت	نواز خان	جرم و سزا پر اپنی خوشی کہانی جس کا آپ کو ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے!

17	عمران خان	☆ عمران خان کے روحانی تجربات ☆ وہ جس نے عمران کی زندگی کا صدا بول دیا ☆ اپنے ساتھ گریج پیڑی نہ لانا: والدہ کی ہدایت ☆ عمران خان کے متفرق خیالات کی جھلکیاں
169	سہارن گن کارڈ	☆ ہوس پک بیڑ پ ☆ پاس کی کتاب دل ☆ کھڑے سدا سوتی ملوہ ☆ گھاٹ کے کتاب

اسی شمارے میں

117	سیلاب کہانیاں	عالمی سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی اورنگ بگی کہانیاں! پرنس محمد خلیفہ
122	نجات	شیخ خالد
132	اولگا	عرفان جاوید
139	ازالہ	محمد سلیم اختر
145	جھوٹی روٹی	جیلانی بانو
150	احتیاط	ایس۔ احتیاء احمد
161	کو ما کہانیاں	مرزا مظفر بیگ
173	بٹنے تو پھٹنے	عارف صبح خان
181	بزم شاعری	ادارہ
186	ناگ دیوتا کا شکار	یوسف علی
197	ملکی عورت	نہیدہ کوثر

129	نیکانوری کی دنیا	☆ گناہ چمنس (ایسے تحقیق کا رجسٹر دنیا واقف نہیں) ☆ وہ بفرنگ کا ایک فیصلہ کن پیڈ پورٹ ☆ ڈاک کام۔ خدا حافظ ☆ ڈاک کا کارخانہ ختم ہونے لگا ہے
200	مکتبی ہے آرزو کی کئی	☆ ایک زندہ دل خوش فتنہ لڑکی کی کہانی ☆ دھڑکی کے کتب خانہ فزائے عجیب ☆ دور ہے پلا کڑا کرتے ہیں ☆ شہرت فضل کے قلم سے



اسلامی نمبرز

ہوں اور اپنی دو غزلیں بزم شاعری کے لیے بھیج رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں آپ حوصلہ افزائی فرمائیں گے تاکہ میں آئندہ بھی اس میں شامل ہوتی رہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ آپ کو اور آپ کی ساری ٹیم کو اپنی حفاظت میں رکھے (آمین) (دعا گو، عصمت اقبال عین۔ منگلا ڈیم) ☆☆

تمام سلسلے خوب رہے

جناب محترم کامران امجد خان صاحب السلام علیکم! امید ہے حراج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ اکتوبر 2011 کا سیارہ ڈائجسٹ ہمارے سامنے ہے۔ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکلز کا انتخاب لاجواب رہا۔ غزلیں عمدہ رہیں۔ اپنی تحریریں ہم آپ کو ارسال خدمت کر چکے ہیں جو یقیناً آپ کو دل کھلی ہوں گی۔ برائے مہربانی انہیں قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر شائق اور سیارہ ڈائجسٹ کے تمام خوبصورت کھینے والے راکٹرز اور تمام خوبصورت پڑھنے والوں کو دعا و سلام۔ برائے مہربانی اپنا خیال رکھیے گا۔ (انیس احمد اجمیر کراچی) ☆☆

محکمہ ڈاک والے

عزیزم کامران امجد خان صاحب السلام علیکم! خیریت مطلوبہ۔ خیریت موجود۔ ابورنگ کراچی کے حالات پر ایک قلم گزشتہ ماہ ارسال کی تھی۔ میں نے اپنے دل کی مجلس لکھی۔ اب کاش کوئی سرکاری

محترم و مکرم جناب کامران امجد خان صاحب سلام مسنونہ! سیارہ ڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں۔ ماشاء اللہ سیارہ ڈائجسٹ نے اپنی اشاعت کے روز اول سے اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے۔ سلیجے سلیجے موضوعات پر نکھری نکھری تحریریں سیارہ ڈائجسٹ کا طرہ امتیاز ہیں۔ آپ لوگوں نے جو ہم پر احسان عظیم فرمایا ہے وہ دور درجن کے قریب مختلف موضوعات پر سیارہ ڈائجسٹ کے نمبرز ہیں۔ ان نمبرز نے متوسط طبقہ کی بہت سی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ خداوند کریم آپ لوگوں کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے (آمین)۔ اپنی ایک تازہ ترین غزل بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کسی قریبی اشاعت میں جگہ ملے گی۔ (ریاض حسین قمر، منگلا ڈیم ضلع جہلم) ☆☆

انتظار رہتا ہے

السلام علیکم! امید کرتی ہوں آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میں پچھلے چند ماہ سے سیارہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ اس سے وابستگی کا یہ عالم ہے کہ ہر ماہ شدت سے اسکا انتظار رہتا ہے۔ ماشاء اللہ جلد سے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں۔ اگر کسی ایک کی بھی تعریف نہ کی جائے تو بے جا ہوگا۔ اس کے لیے آپ کا تمام شائق مبارکباد کا شوق ہے۔ جن کی انتہک منتوں اور کوششوں سے رسالہ آج آج مقام تک پہنچا ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو دن گیارہویں اور اورات بارہویں ترقی دے۔ میں سیارہ ڈائجسٹ میں جملگی بارشکرت کر رہی

جلد 47- شمارہ 11- نومبر 2011ء

نور ان پاشان عزیز و محترمانہ

www.facebook.com/sayaradigest
Email: editorsayara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayara@hotmail.com
Phone: 02-047245412
Mobile: 0300-4430206

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان
مدیر منتظم
کامران امجد خان

الاحور
سیارہ ڈائجسٹ

مجلس مشاورت

مدیر: محمد ثاقب

معاون مدیران: جویریہ کامران۔ رونی خان۔ فرحان امجد

سرکیشن منیجر: بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر: خرم احمد خان۔ 0333-4207684

نگران پرنٹنگ: خالد محمود محمد توفیق

طابع: اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائد اعظم لاہور

شعبہ اشتہارات: کراچی: محمد عابد مرزا۔ 0321-3758492

لاہور: طارق محمود۔ 0300-4144781

رفیق غوری ریاض آفندی

پروفیسر خالد پرویز فیاض عمر فارغ محمد دواپل

مجلس مشاورت

قیمت

55 روپے

امجد رؤف خان پبلیشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواڑ گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

صفات کو رونق بخشنی جہاں میں ان کی ہمت اور کوشش کو سلام کرنی ہوں اور ظہر کے ساتھ یہ دعا کرتی ہوں کہ یا آئین ہائیں اپنی ذات کا پیارا سا احساس دینے کے لیے ہمیشہ ہم میں موجود رہیں (آمین)۔

پروفیسر محمد ظریف خاں ذرہ نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے جس طرح میری تحریروں کو خاص توجہ سے پڑھتے ہیں یہ زیادتی ہوئی کہ میں ان کا ذکر نہ کروں۔ اس نقاشی کے دور میں کسی کی بے لاگ اور بے لوث تعریف کرنے کے لیے بھی جگر اور ظرف چاہیے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ان کا نام محمد ظریف کی طرح اعلیٰ ظرف خاں بھی ہوتا۔ اگرچہ گزشتہ کئی سالوں سے یہ اپنی مختلف علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پھر بھی وہ اوروں کی بھلائی سے غافل نہیں رہتے۔ ”جے“ میاں بیوی تو ہمہ صفت موصوف ہیں۔ انکی ہمت، حوصلہ، جدوجہد اور نینٹ کے بارے میں لکھنا تو سورج کو چار لکھنا ہے کہ سزاؤں سے۔

انکے علاوہ عمرہ حیدر جس خلوص سے میری کہانیاں پڑھ کر پڑ پڑائی بخشتی ہیں اس کے لیے بھی میں تہ دل سے ان کا شکر یہ ادا کرتی ہوں۔

بہترین خواہشات کے ساتھ طالب دعا۔

(شوکت افضل - اسلام آباد)

☆☆

آزادی سے آشتیا

مرامی القدر جناب مرامان احمد خان صاحب مدبر منتظم ”سیارہ ذابجست“ السلام علیکم ایارہ ذابجست شمارہ انویور زیت مطالعہ سے آپ نے اپنے صفحہ ”دینک“ میں ”مندھہ میں سیلاب کی تباہ کاریاں اور حکمرانوں کی حسنی“ کا جائزہ لیا ہے جو قابل داد ہے۔ آج ہمیں آزاد ہوئے 64 سال ہو

”ہاں دل“ (اگر کوئی ہو) تو اس شہر کے سگین، دل دوز اور غمگین، مضمون کائف پڑھ کر دل پر اثر لے۔ توقع تو یہی ہے کہ میرا تحریر کردہ گفتہ انسان ”ابا“ ہے، ”سینٹر کے شمارے کی زینت بن چکا ہوگا۔“ ”کتابستان“ تو محکمہ ذاک والے لی گئے۔

اس نظم کے سلسلے میں میری التجا ہے کہ ازراہ کرم اسے کسی علیحدہ صفحہ پر یکدم عطا فرمائیں اور غور میں بھی اس کا نام دے دیں تاکہ مستند رہے اور یہ بوقت ضرورت کام آئے۔

جمالی احمد ذوق خان کو سلام۔

(پروفیسر محمد ظریف خان، کراچی)

پروفیسر صاحب، آپ کے شہر کے اس زمانان کی حالت تو دیگر لوگ سے ہی کر لگتا ہے کہ شہر کراچی کے تختہ ذاک والے بھی کسی ”کم“ نہیں۔ آپ کی دونوں تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور دونوں بآپ کو اعزاز دی شاعر ارسال کئے گئے ہیں لیکن آپ کی لاطمی سے لگتا ہے کہ آپ تک یہ شمارے نہیں پہنچ پائے اور درمیان میں ہی ”گول“ کر لیے گئے۔

☆☆

نفسا نفسی کے دور میں

محترمی ایڈیٹر صاحب السلام علیکم انویور کا شمارہ موصول ہوا، اس کے لیے شکریہ سب سے پہلے میں شوق خانوہنی صاحب کو ان کی دونوں دعائیں قبول ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم ﷺ کو بدیہ تحریک پیش کرنے والوں پر اپنی خاص نظر رکھتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ شوق صاحب بھی مجھے اپنی قیمتی دعاؤں میں شامل رکھیں۔ شکریہ!

جس طرح محترمہ کنول صاحبہ اپنی گونا گوں قیمتی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ماہنامہ سیارہ کے

ماہرین کی ذہنی دشمنی ٹھن لایا ہور کے ایک ہسپتال میں مریضوں کی کیفیت دیکھنے پہنچی تو ان ڈاکٹروں کے علاوہ اردگرد کے مکلوں میں قیام پذیر ڈسٹیکو نے بھی اپنے انڈول سمیت ان کا استقبال کیا چنانچہ مہمان ٹیم نے ذہنی کی دیدہ دلیری پر سڑتے ہوئے حکومت پنجاب کی مستندی کو زیر بادوی۔

جس طرح عرصہ عرصہ پہلے شریف حکومت نے منگی جینی سستی کروانے کے لیے اسے جوش سے شکر گزار اور پرنچوں کی دکاؤں پر چھاپے اتارے کہ جینی سستی ہونے کی بجائے بازار سے غائب ہوگئی۔ جس طرح آٹھ روپے کی روٹی پانچ روپے میں فراہم کرنے کے لیے سستے سستہ دور کی سیم میں اربوں روپے جلا کر ہاتھ جھاڑ لیے گئے۔ اس طرح ذہنی سے غصے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ مرض دبا کی طرح پھیل رہا ہے اور اس موذی پھرنے کی کھروں کے چراغ گل کر دیے ہیں کیونکہ اس کے نمیت اور پھر علاج فیض کے بس کا روگ بھی نہیں ہے۔

آج کل الیکشن لسٹوں کے مکمل ہونے کا شورہ غوغا ہے۔ ہم میں جب تک ووٹ کی قدر و قیمت کا شعور نہ ہوگا ہمارے ہاں الیکشن میں جیت کر آنے والے لوگوں سے بننے والی آہلی کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شعور ہم میں تعلیم سے اجاگر ہوگا جس کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ”سیارہ ذابجست“ کو ہمہ پوری ٹیم عزت و توقیر دے۔ بڑے چلو بڑے چلو کہ ہماری منزل ابھی دور ہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

(قلندر حسین سید، احمد پور شرقیہ)

☆☆

خوابش پوری ہوگئی

محترم کا مرامان احمد صاحب! آپ نے گزشتہ

گمے ہیں۔ انفس کو ہم ہر سال آزادی کی سالگرہ بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں، کروڑوں روپے کا کاغذ محض رنگ برنگی چھٹیوں پر ضائع ہو جاتا ہے اور اتنا ہی پکڑا جھٹلے بنا کر ہارنے میں..... ہم آج تک لفظ آزادی سے نا آشنا ہیں۔ تاکہ اعظم محمد علی جناح جیسے عظیم انسان کی کوششوں سے 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا لیکن جلد ہی ہمارے حکمرانوں کی غامبات اندیشانہ پالیسیوں کی وجہ سے اس کا مشرقی حصہ ہم سے جدا ہو کر ایک علیحدہ ملک بنگلہ دیش بکھلا یا۔ کیا ہمارے حکمرانوں نے یہ سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ آج بھی ہمارے سرول پر وہی گدھ منڈلا رہے ہیں۔

ہماری حکمران پارٹی کے جد اعلیٰ ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کو روٹی پکڑا اور مکان کا گھرہ دے کر اپنا لوہا منویا۔ انفس کو آج وہ بھٹو ہے نہ اس کے بیٹے اور نہ اس کی دودھ خنجر ہونے والی بیٹی بینظیر بھٹو ہے..... ہاں بینظیر بھٹو کے شوہر نامہار آصف علی زرداری صدارتی عہدہ پر براجمان ہیں۔ ان کے چار سالہ دور میں مہنگائی، بیزدگاری، طویل لوڈ شیڈنگ اور سیلاب کی تباہ کاریاں ہیں، مرامان ذکیاں ہیں اور تو اور گلوگروں دور بین سے بھی نہیں دیکھی جاسکتی۔

یہاں پہلے لوگ طاغران، چچک اور ٹی بی جیسی وباؤں سے موت کو گلے لگاتے تھے۔ آج کل ایک نئی آفت ذہنی بخار نے لے لی ہے۔ یہ مرض بھی ایک جھمر کے کانٹے سے ہوتا ہے۔ یہ جھمر عام گھٹیا چمچروں کے برعکس صاف پانی پر پلتا ہے اور سرسبز ماحول میں رہائش پسند کرتا ہے۔ وقت بے وقت نہیں کاٹتا بلکہ طوع یا غروب آفتاب میں واردات کرتا ہے۔

چپکلے دنوں میڈیا پر آیا کہ جب سری لنگن

زریں وہ پیش کرتے ہیں وہ بے حد خاصے کی چیز ہیں۔ میری طرف سے انہیں اس قابلِ تحسین خدمت پر بہت شکر یہ اور مبارک پہنچا دیتے۔ ان سے ایک گزارش ہے کہ اگر وہ مختصر انتخابات کو زیادہ جگہ دیں تو اس سے قارئین کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہوگا اور انہیں مواد بھی زیادہ اور متنوع مل سکے گا۔ امید ہے محترم قلمندرسین صاحب اس تجویز سے اتفاق کریں گے۔

(نعمان خان، کراچی)

☆☆

خواتین کا راز

محترم جویریہ کارمن صاحبہ! السلام علیکم۔ سیارہ ذابجست میں خواتین کا شعبہ شروع کرنے اور اس میں معیاری مواد فراہم کرنے پر میں آپ کو اور آپ کی ٹیم کو بے حد مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اس سے ہم خواتین کو بہت کچھ نیا پڑھنے کو ملے گا یہی ساتھ ہی اپنے بچن کا احساس بھی بڑھے گا۔ کچن کا راز میں آپ کا انداز اور ترکیب جاننے کا طریقہ بہت خوب ہے۔ روایتی اور خشک اعجاز میں دیکھتے ہی دیکھتے بجائے آپ لوگ خوبصورت الفاظ کے ساتھ تراکیب بیان کرتی ہیں جو ذائقہ اور مزے میں مزید اضافہ کر دیتے ہیں۔ تمام Recipes بھی معیاری ہوتی ہیں جو آپ لوگوں کی محنت کا ثبوت ہیں۔ البتہ ایک شکوہ یہ ہے کہ آپ نے صرف ایک ماہِ خواتین کے کارناموں اور خدمات کے حوالے سے انٹرویوز شائع کئے اور اس کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا حالانکہ اس سے خواتین کو آگے بڑھنے اور کچھ کر دکھانے کی تحریک مل سکتی ہے۔ اب یہ سلسلہ جاری رکھیں بلکہ اسے مزید نمایاں کریں۔

(زاہدہ خالدہ، لاہور)

شارے میں ہماری پسندیدہ رائٹرشوٹ افضل صاحبہ کی تحریر کے ساتھ ان کی تصویر شائع کر کے ہماری دیرینہ خواہش پوری کر دی۔ کچھ عرصہ قبل ان کی کتابوں کے اشتہار میں ان کی تصویر شائع ہوئی تھی مگر وہ بہت غیر واضح تھی اور اس سے انکی شخصیت کے بارے میں تاثر قائم نہ کرنا ممکن نہ تھا تاہم تازہ تصویر واضح بھی ہے اور اس سے یقیناً ہمارے جیسے ان کے دیگر پڑھنے والوں کو ان کی شخصیت کا درست تاثر قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ تمام رائٹرز کی تصاویر شائع کیا کریں تاکہ پڑھنے والوں کو رائٹرز کی شخصیت کو جاننے اور ذہن میں موجود جھیمہ کو مزید واضح کرنے میں مدد مل سکے۔

(لانیہ رفیق۔ بذریعہ ای میل)

☆ لانیہ! آپ قارئین کے اصرار کو دیکھتے ہوئے ہی ہم نے شوٹ افضل صاحبہ کی تازہ تصویر کو نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ دیگر رائٹرز کی تصاویر بھی شائع کی جارہی ہیں۔

☆☆

”خود جلس ویدہ اغیار کو جینا کرویں“

قابلِ احترام امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔ سیارہ ذابجست کے ذریعے آپ اور آپ کی ٹیم جو قومی خدمت انجام دے رہی ہے وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے۔ میں یہاں خصوصی طور پر قلمندرسین صاحب کا ذکر کرنا چاہوں گا جو ہم قارئین کے لیے بے انتہا محنت اور کوششوں سے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی کر کے معلومات کا چھوڑ مہیا کرتے ہیں۔ یہ لاجواب خدمت ہے جس سے میرے جیسے بے شمار قارئین مستفید ہو رہے ہیں۔ مجھے خاص طور پر ستر ناموں سے لیا گیا انتخاب بے حد پسند ہے۔ اس کے علاوہ آغاز میں جو اقوال



پاک امریکہ تعلقات فیصلہ کن موڑ پر

امریکہ اور پاکستان کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات اب تشویشناک صورتحال اختیار کر گئے ہیں۔ دونوں طرف طویل خاموشی اور اپنے اپنے موقف کو لے کر ڈٹے رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ فریقین اب ایک دوسرے سے ڈیڑھ سو سال کے بغیر صاف بات کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات ہمیشہ سے مفادات پر مبنی رہے ہیں۔ سابق سوویت یونین کے خلاف افغانستان میں جنگ سے شروع ہونے والے یہ تعلقات دونوں ممالک کے لیے کسی نہ کسی طرح سودمند رہے اور باہمی مفادات کے حصول کی خاطر دونوں ممالک نے اختلافات کو پس پشت ڈالے رکھا۔ تاہم اب حالات ایسے موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ امریکہ اب کھلے عام پاکستان اور اس کی خفیہ ایجنسیوں کو دہشت گردوں سے رابطے اور ان کی امداد کا مجرم قرار دے رہا ہے۔ جبکہ پاکستان کو امریکی ایجنسیوں کی

ہٹکوک سرگرمیوں اور اتحادی قراردادیں کے باوجود بریتانیا امریکہ سے اپنے تعلقات میں ہٹکوک کے امریکہ سے تعلقات میں ہٹکوک کی ابتداء ریمینڈ ڈیویس کے واقعہ سے ہوئی تھی۔ اس وقت تک پاکستانی انجینئرس اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ کسی آئی اے کے اہلکار پاکستان میں انتہائی خطرناک خفیہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور اس بات کے باقاعدہ ثبوت موجود ہیں۔ ریمینڈ ڈیویس مقامی سی آئی اے چیف تھا اور اس پر پاکستانی انجینئرس کافی دیر سے نظر رکھے ہوئے تھے۔ ریمینڈ کی گرفتاری اور رہائی تک پاک امریکہ تعلقات میں دراڑیں واضح ہو گئی تھیں۔ ریمینڈ کے معاملے میں پاکستان کا شیڈنڈ اور امریکی دباؤ کے باوجود ایک مخصوص وقت تک امریکہ کو زنج کے رکھنا امریکہ کے لیے ایک دھچکا

تعلقات میں موجود تناؤ کا باعث ختانی نیٹ ورک کو تاراج کر رہا ہے۔ یہ نیٹ ورک القاعہ سرگرمیوں پر نظر رکھے اور اس کا توڑ کرنے کے لیے امریکہ نے خود ہی تشکیل دیا تھا اور پاکستانی انجینئروں کی مدد سے امریکہ ایک عرصہ تک اس نیٹ ورک کو خود بھی سپورٹ کرتا رہا ہے مگر یکا یک نیٹ ورک امریکہ کے لیے ایک دہشت گرد تنظیم بن گیا۔ اور اب تو یہ نیٹ ورک پاکستان سے تعلقات میں تناؤ کا باعث بھی بن گیا ہے۔ اس کی وجہ گشت و دوں کا نل میں امریکی سفارت خانے پر ہونے والا ایک حملہ تھا۔ یہ حملہ بالکل اسی نوعیت کا تھا جیسے پاکستان میں بنی این ایس نیوی جیس اور لاہور کے متاوا پولیس سٹور پر ہوا تھا۔ بالکل ویسے ہی جبریل حملہ آور اور اسی نوعیت کے منشی بھر دہشت گردوں نے کئی کھٹے امریکہ کے ٹرینڈ فوبیوں کو ان کے ہیڈ کوارٹر میں الجھائے رکھا اور جدید ترین ہتھیاروں اور تمام تر ذرائع کے باوجود امریکی فورسز کو ان دہشت گردوں سے چھکارا پانے میں کھنکھوں لگ گئے۔ اس حملے اور اس بڑی ہزیمت کے خلاف امریکی عوام اور ذرائع ابلاغ سخت اٹھے اور یہ سوال اٹھانے لگے کہ دس سال افغانستان میں رہنے کے باوجود امریکہ نے وہاں کیا حاصل کیا ہے۔ سینکڑوں فوجی مروانے کے باوجود وہ اسے ہیڈ کوارٹر کو بھی محفوظ نہیں بنا سکا۔

امریکی انتظامیہ اور میتھنگون نے اس ساری صورتحال سے بچنے کے لیے سارا الزام پاکستان پر دھرنے کا فیصلہ کیا اور توپوں کا رخ پاکستان کی طرف کر دیا۔ اس حملے کو ختانی نیٹ ورک کی کارستانی قرار دیا گیا اور اس کے پیچھے پاکستانی انجینیئروں کے ملوث ہونے کا الزام لگا دیا گیا۔ اب امریکہ کا مطالبہ ہے کہ پاکستان ختانی نیٹ ورک کے خلاف فوری کارروائی کرے اور چونکہ اس نیٹ ورک کے تانے بانے پاکستان میں وزیرستان سے ملتے ہیں لہذا وہاں فوری آپریشن کیا جائے یا امریکہ کو حملوں کی اجازت دی جائے۔

پاکستان اس وقت جن حالات سے گزر رہا ہے اور پاک فوج کو جن چیلنجز کا سامنا ہے اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ کوئی اتحاد کھول لے لیکن امریکہ بر حال میں شمالی وزیرستان میں اس پوزیشن پر پاک فوج کو مجبور کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے انکار کی وجہ سے امریکہ نے پاکستان کی فوجی امداد روک لی ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو بھی مزید قرضہ دینے سے روک دیا ہے اور عالمی سطح پر پاکستان کو تنہا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس حوالے سے ایک تشویشناک خبر یہ ہے کہ امریکہ اور بھارت مل کر افغانستان کے ساتھ مشترکہ جنگ معاہدے کر رہے ہیں جن کا مقصد پاکستان کے خلاف کارروائیاں کرنا اور افغانستان میں

پاکستان کے اثر و رسوخ کو ختم کر کے اس کے خلاف محاذ کھڑا کرتا ہے۔ امریکی حکام اب کھلے عام پاکستانی فوج کو دہشت گردوں کا مددگار قرار دے رہے ہیں اور امریکی صدر سمیت تمام امریکی عہدیدار پاکستان پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک بریفنگ میں امریکی وزیر دفاع لیون پنٹیا نے اس بات کا اعتراف کیا کہ کسی آئی اے پاکستان میں دہشت گردوں کے خلاف خفیہ آپریشن کر رہی ہے۔ انہوں نے ان خفیہ سرگرمیوں کی تفصیل بیان نہیں کی مگر یہ واضح ہے کہ اب بھی امریکی الحاکم پاکستان میں سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان کی جڑیں کہاں تک پہنچ چکی ہیں یہ کسی کو معلوم نہیں۔

دونوں ممالک کے تعلقات اب ایک فیصلہ کن موڑ پر ہیں اور آئندہ آنے والے دنوں میں یہ واضح ہو جائے گا کہ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات کا مستقبل کیا ہوگا۔ اب تک پاکستانی فوج نے ایک جرات مندانہ موقف اختیار کر رکھا ہے۔ یہ امریکی غلامی سے نجات کا ایک اہم موقع بھی ہے جسے ہاتھ سے نہیں گنونا چاہیے۔



عمران خان کے روحانی تجربات



عمران خان کے روحانی تجربات
☆ پہلا روحانی تجربہ

”چودہ برس کی عمر میں مجھے پہلا روحانی تجربہ ہوا، جب میں مذہب اور خدا کے بارے میں تھکاک کا شکار تھا۔ میری والدہ اپنی بی بی کی لاہور میں ہمارے گھر پہلی اور آخری بار آمد کی وجہ سے بہت زیادہ پر جوش تھیں۔ انہوں نے مجھے اس بزرگ خاتون سے متعارف کرایا تا کہ وہ مجھے دعائیں اور راہنمائی دے سکیں۔ وہ خاتون فرش پر اپنی تین چار مریدوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ان کا چہرہ چادر سے ڈھکا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی ای نے ان کا چہرہ دیکھا۔ چند منٹ وہ خاموش رہیں اور پھر اجا تک کہا کہ میں نے ناظرہ مکمل طور پر نہیں پڑھا۔ میں بالکل ششدر رہ گیا۔ میں نے قرآن پاک ختم نہیں کیا تھا مگر اس کے بارے میں صرف مجھے پڑھانے کے لیے آنے والے مولوی صاحب جانتے تھے۔ مجھے قرآن پاک کی تعلیم سکول سے آنے کے بعد دی جاتی تھی اور اس وقت میں قرآن پاک پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس وقت میری بس یہی خواہش ہوتی کہ زمان پارک میں اپنے کزنوں کے ساتھ کھلوں۔ ایک سال بعد بیچارے مولوی صاحب نے یہ جان لیا کہ میں ایک لاعلاج مسئلہ ہوں اور ہم نے ایک دن مل کر منصوبہ بنایا کہ



میں اور میرا پاکستان۔۔۔ عمران خان

ایڈیٹر

عمران خان..... اس وقت پاکستانی قوم کیلئے امید کی کرن بنے ہوئے ہیں۔ کرپٹ سیاستدانوں سے تنگ عوام عمران کو تبدیلی کا مرکزی کردار تصور کر رہے ہیں۔ کبھی وہ ایک سپورٹس مین اور شار کے طور پر پاکستانی عوام کے دلوں پر راج کرتے تھے، پھر ان کی شخصیت تبدیل ہوئی اور وہ اپنے ساتھ پاکستانی قوم کی تقدیر بدلنے کا عزم نگہریست کے میدان میں اترے اور اپنے حوصلے، ہمت، جرأت، شفاف کردار اور کرپشن سے پاک ریکارڈ کے باعث پاکستان کی امیدوں کا مرکز بن گئے۔ عمران خان کی شخصیت میں تبدیلی کے پس پردہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کی زندگی، اس کے عمل و کردار، شخصیت اور سوچ کو یکسر تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہ ایسے تجربات ہوتے ہیں جن کے اثرات انسان کی ساری زندگی پر محیط رہتے ہیں اور ان سے انسان کی منزل اور اس کے مقاصد طے پاتے ہیں۔ عمران خان بھی کچھ ایسے روحانی تجربات سے گزرے ہیں جو ان کی شخصیت میں تبدیلی اور انہیں ایک مختلف انسان بنانے کا باعث بن گئے۔ حال ہی میں ان کی کتاب ”میں اور میرا پاکستان“ انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔ ہم اس کتاب سے چند اقتباسات شائع کر رہے ہیں جن میں خاص طور پر ان کے روحانی تجربات شامل ہیں تاہم ان کے مشاہدات، تجربات اور تاثرات کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کتاب برطانیہ کے مشہور اشاعتی ادارے BANTAM PRESS نے شائع کی ہے۔ پاکستان میں اس کے ڈسٹری بیوٹر ریڈنگ بکس لاہور اور لہرنی بکس کراچی ہیں۔ ہم اس کتاب کے ناشر اور ڈسٹری بیوٹر کے ممنون ہیں اور سیارہ ذہن جست میں کچھ اقتباسات شائع کرنے کا مقصد اس کتاب کا تعارف ہے۔

میرے والدین کو بتا دیا جائے کہ میں نے قرآن پاک ختم کر لیا ہے۔
 پیر جی کے حقیقت بتانے کے بعد میری والدہ نے میری طرف دیکھا اور میرے حیران زدہ
 چہرے سے اس بات کو پالیا کہ ان کی پیر جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پیر جی نے میری والدہ کو بتایا کہ
 پریشانی کی ضرورت نہیں کیونکہ میں ایک نیک روح ہوں اور بالکل درست ہو جاؤں گا۔ میں نے اپنی
 والدہ کے چہرے پر اطمینان کا سانس دیکھا۔ پیر جی نے یہ بھی کہا کہ میں ایک مشہور انسان ہوں گا
 اور میری والدہ کا نام ایک جانا پہچانا نام بنے گا، انکس برس بعد جب میری والدہ کیسری وجہ سے دم
 توڑ گئیں تو میں نے ان کے نام پر شوکت خانم میموریل ہسپتال قائم کیا جو کہ آج گھر گھر میں جانا پہچانا
 نام ہے۔“

☆ بابا جھلا کی درست پیش گوئی

1987ء کے ورلڈ کپ سی فائنل میں شکست کے بعد عمران خان نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا
 اعلان کر دیا۔ اس فیصلے کے بعد وہ دوستوں کے ہمراہ لاہور کے سرحدی علاقے کے قریب شکار کے
 لیے مجھے جس سے فراغت کے بعد ان کے میزبان نے انہیں ایک روحانی پیر سے ملنے کی ترغیب
 دی۔ اس واقعہ کے بارے میں عمران لکھتے ہیں ”شکار کے بعد ہمارے میزبان نے تجویز کیا کہ مجھے
 اس روحانی بزرگ سے ضرور ملنا چاہیے جو میرے گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں آنے والے
 ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ مجھے اس کام کا کوئی خاص مصروف نظر نہیں آیا لیکن اوروں کے اصرار پر میں
 ان سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔ آدمی جس کا نام بابا جھلا تھا وہ لاہور کی سرحد سے چند میل پرے ایک
 گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کا قد چھوٹا، جگمگی لگائیں اور پرتمکنت چہرہ تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں
 کیونکہ گاؤں میں کسی کے پاس بی وی نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی ایسا شخص دیکھتا تھا جس کی کرکٹ میں دلچسپی
 ہو۔ اس نے یقینی طور پر میری ریٹائرمنٹ کے بارے میں نہیں سنا ہوگا۔ باوجودیکہ یہ خبر شرسرخیوں میں
 شامل رہی۔ میرے میزبان نے پوچھا کہ مجھے ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کرنا چاہیے؟ آدمی نے میری
 طرف نظر پھیری اور کہا کہ میں نے اپنا پروفیشن نہیں چھوڑا۔ سب نے اسے یہی بتایا کہ میں کرکٹ سے
 ریٹائر ہو چکا اور دوبارہ کھیلنے کا کوئی ارادہ نہیں مگر اس نے زور دے کر کہا یہ اللہ کی مرضی ہے کہ تم ابھی بھی
 کھیل میں ہو۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میری کتنی بہنیں ہیں اور ان کے نام کیا ہیں۔“

اس کے بعد عمران نے لکھا ہے کہ بابا نے ان کے دوست محمد صدیق کے کاروبار سے متعلق بھی
 باتیں بالکل درست بتا دیں۔ ان باتوں نے عمران اور ان کے دوستوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس
 واقعہ کے تین ماہ بعد ضیاء الحق نے قومی ٹیم کو دیئے گئے ایک عشائیہ میں جنرل ضیاء الحق نے عمران
 خان کو ملک کی خاطر ریٹائرمنٹ واپس لینے اور پاکستان کی کپتانی کے لیے کہہ دیا۔ ایک ہفتے بعد

جڑیں دکھا دیتا ہے لیکن بعض اوقات میں کسی چیز کے بارے میں علم دینے کی فریاد کر کے تھک جاتا ہوں لیکن وہ انکار کر دیتا ہے۔“

اگلے ایک دو سال تک میں کئی مرتبہ میاں بشیر سے ملا جنہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میری والدہ کی رہبری کی طرح وہ بہت منکسر المزاج اور بے ریا شخص تھے جو اپنی دانائی کے بارے میں عاجزی کا رویہ رکھتے تھے۔ وہ انتہائی غیر متکبر تھے اور انہوں نے مجھے بڑی مشکل سے یہ سمجھایا کہ ان کے پاس ماضی یا مستقبل میں جھانکنے کا کوئی فن نہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے مجھے بتایا کہ جب وہ مراقبہ کرتے ہیں اور اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ وہ ان کی مدد کرے تو وہ کبھی کبھی ”پودہ“ بٹا دیتا



ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ ہر ملاقات میں میرا خدا کے وجود پر ایمان پختہ ہوتا گیا۔ میں اپنی والدہ کے انتقال پر بہت غصے میں تھا اور یہاں پر ایک ایسا انسان موجود تھا جو میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب حاصل کرنے میں میری مدد کر رہا تھا۔ دو تین سال کے عرصے کے دوران انہوں نے میرے ایسے کیسوں کو حل کر دیا جو میرے ایمان کی راہ میں رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے ان سے اسلام کو جس طرح سیکھا اور جس طرح مجھے سکول میں پڑھایا تھا بتایا جس طرح مولوی مجھے گھر میں آکر قرآن پاک پڑھاتے تھے اس میں یہ فرق تھا کہ میاں بشیر صاحب نے

ویسٹ انڈیز کے دورے کے لیے عمران ٹیم کی قیادت کر رہے تھے اور ان کے دوست کا کاروباری بابا جھلا کی پیش گوئی کے عین مطابق رخ اختیار کر رہا تھا۔

☆ وہ جس نے عمران کی زندگی کا دھارا بدل دیا

عمران خان پر جس روحانی شخصیت کا سب سے زیادہ اثر رہا وہ میاں بشیر ہیں۔ اس کتاب میں عمران خان نے ان کے حوالے سے بہت کچھ بتائیں بیان کی ہیں۔ کرکٹ، کینسر ہسپتال کی تعمیر، سیاست، یوتھ سے بال ٹیمز کے مقدمے سمیت کئی معاملات میں ان کے روحانی کمالات کا ذکر کیا ہے۔ عمران خان کی کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے میاں بشیر کی روحانی شخصیت کو سمجھیں اور عمران خان پر ان کے اثر کی بابت پڑھنے والوں کو خاصی معلومات ملیں گی۔ عمران خان لکھتے ہیں:

”میری ایک ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی جس کے بارے میں میں کہنا چاہوں گا کہ مجھ پر ہونے والا وہ واحد انتہائی طاقتور روحانی اثر تھا جس نے میری زندگی کا رخ مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ لاہور میں ایک دوست نے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ وہاں پر ایک تیرے صاحب بھی تھے جو دبے پتلے اور کلین شیو تھے۔ ساٹھ کے پینے کے ان صاحب کا نام میاں بشیر تھا۔ ان کے چہرے پر موجود جھریوں سے پتہ چلتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں بہت سے مصائب جھیلے ہوں گے۔ وہ ایک جونیئر ریٹائرڈ سول سروٹ تھے جن کے بارے میں مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑی مشکل کے ساتھ اپنی معمولی پشٹن پر گزارا کر رہے ہیں۔ کھانے کے دوران وہ صاحب بالکل خاموشی سے بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے پر عدم دلچسپی کا تاثر نمایاں تھا۔ کھانے کے بعد ان صاحب نے ملائمت کے ساتھ مجھ سے پوچھا کہ کیا میں قرآن کریم کی فلاں آیت کو تاتر کے ساتھ پڑھتا ہوں؟ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو اس آیت کے بارے میں جانتا تک نہیں۔ میرے اس جواب پر وہ گہرے غور و فکر میں ڈوب گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور یوں لگا جیسے وہ کسی نکتے پر مرکوز ہو چکے ہیں۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور کہا: ”مذرت، یہ تو تمہاری والدہ تھیں جو تمہاری حفاظت کے لیے یہ آیت پڑھتی تھیں۔“ میں حیران رہ گیا کیونکہ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میری ماں قرآن کریم کی ایک آیت تین بار پڑھ کر مجھ پر پھونکا کرتی تھیں۔ ان صاحب نے مجھے کہا کہ میں اسی آیت کی وجہ سے محفوظ رہا ہوں۔ پھر انہوں نے مجھے میرے خاندان میں پیش آنے والے کچھ واقعات کے بارے میں بتایا جن کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ انتہائی ذاتی نوعیت کے واقعات تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے یہ فن کہاں سے سیکھا جس پر ان کا جواب تھا ”یہ سب اللہ کی رضا ہے۔ بعض اوقات وہ مجھے میرے کبے بغیر کچھ

خود کو ڈھاننا نامکن ہوگا۔ اس معاملے میں بھی میاں بشیر عمران کی مدد کو آئے اور ان کی راہنمائی کی۔ جہانما سے ملاقات سے قبل تک وہ پاکستانی لڑکی سے ہی شادی کرنے کا ارادہ کئے ہوئے تھے لیکن جہانما سے مل کر وہ اتنا متاثر ہوئے کہ اپنا خیال بدل دیا۔ جہانما سے تعلق کی وجہ سے ان پر سیاست میں یہودی لابی کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا جبکہ عمران خان کے بقول جب انہوں نے جہانما سے شادی کی تو ان کے ذہن میں سیاست میں حصہ لینے کا بالکل بھی خیال نہیں تھا۔ عمران خان کے بقول ان سے شادی سے قبل جہانما کو پاکستانی معاشرے میں خواتین کو درپیش مشکلات کا سنا کر بہت ڈرایا گیا لیکن وہ ثابت قدم رہیں۔ جہانما پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے اشارے پر میڈیا میں اپنے خلاف بے بنیاد پراپیگنڈہ سے بہت آزرده رہتی تھیں۔ سیاست میں بہت زیادہ مصروفیت کے باعث جہانما کو مناسب وقت نہ دینے کو عمران نے علیحدگی کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔

اقبال کے علاوہ جن اسلامی دانشوروں سے متاثر ہوئے

جدید اسلامی مفکرین میں عمران خان اقبال کی فکر سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب میں انہوں نے اقبال کے خیالات کو جس طرح سمجھا، بڑھے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کے علاوہ جن اسلامی دانشوروں کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے ان میں گانے اٹھن، محمد اسد اور ڈاکٹر فضل الرحمن شامل ہیں۔ گانے اٹھن سوئٹزر لینڈ میں پیدا ہوئے۔ ڈیپلومیٹ، صحافی اور براڈ کاسٹر رہے۔ سفارتی حیثیت سے کام کرنے سے قبل وہ معلم اور صحافی کے طور پر جیہا اور مصر میں قیام پذیر تھے۔ مصر میں قیام کے دوران وہ مسلمان ہوئے۔ ان کا اسلامی نام سہدی حسن شاذلی ہے۔ اس کی معروف کتابوں میں Islam and the King of the Castle اور The

Destiny of Man Richest Vein شامل ہیں۔ مؤرخ

الذکر کتاب 1949ء میں شائع کی گئی۔ فیئر اینڈ فیئر نے ٹی ایس ایلٹ کی سفارش پر چھاپی۔ عمران خان نے بتایا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اسلام کے روحانی پہلو پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور مشرق اور مغرب کے درمیان پلی قائم کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ گانے اٹھن کی طرح محمد اسد بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وہ بھی اتفاق



کبھی ظاہری مذہبی رسومات پر زور نہیں دیا۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں پانچ وقت نماز پڑھوں، رمضان میں روزے رکھوں۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ میں قرآن پاک پڑھوں۔ اس کے بجائے انہوں نے مجھے ان کے پیچھے جو اس کے بارے میں بتایا۔ وہ جانتے تھے کہ کسی کو ظاہری رسومات کے مظاہرے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور اگر ایسا کیا جائے گا تو یہ محض خالی خوبی رسومات ہوں گی، سب سے پہلے اندرونی تبدیلی آتی ہے۔ انہوں نے میرے اندر ایمان کی جوت چکا دی۔ بعض اوقات مجھے ان کی بات سمجھنے میں چھ چھ لگ جاتے تھے لیکن انہوں نے مجھے بھی جلدی کے لیے نہیں کہا۔“

عمران نے جوا کھیل کر پارٹی کا قرضہ اٹارا

”اپنے خاندان کے ساتھ میں انگلینڈ میں تھا اور میرا برادر سستی بار بار مجھ سے کہہ رہا تھا کہ انگلینڈ بمقابلہ جنوبی افریقہ ٹیسٹ میچ کا کیا بنے گا۔ مجھے معلوم ہو کر اس کی دلچسپی بچ پر اس کے شرط لگانے کی وجہ سے ہے۔ میں نے میچ دیکھنے کا فیصلہ کیا اور جانا کہ وہ پہلے ہی دس ہزار پاؤنڈ ہار چکا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ مشورے دینے کے لیے مجھے میچ دیکھنا ہوگا اور اس کی ڈوبی رقم کی تلافی کے بعد جیتا جائے والا ہر پاؤنڈ میرے پارٹی قرضوں کی ادائیگی کے لیے ہوگا۔ میں نے زندگی میں کبھی جوا کھیلنا نہ ہی کبھی اس طرف رغبت کی وجہ جان سکا لیکن اب کہ میں نے اپنی پارٹی کے قرضوں کو اٹارنے کے لیے دو دن بن گولڈ سمٹھ کے ساتھ میچ دیکھا تاکہ اسے بتا سکوں اسے کب کیا کرنا ہے۔ میرے مشوروں کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ اپنے ذمہ رقم ادا کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ میرے پاس بھی اتنی رقم آگئی کہ پارٹی کا قرضہ اٹار سکوں۔ ایک موقع پر ایک جواری نے اس سے کہا کہ ستر سمٹھ تم کہیں اپنے بھتیگی کے ساتھ تو نہیں بیٹھے ہوئے؟“

اپنے ساتھ انگریز بیوی نہ لانا: والدہ کی ہدایت

”جب اٹھارہ برس کی عمر میں پہلی بار انگلینڈ روانہ ہو رہا تھا تو والدہ نے مجھے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی کہ اپنے ساتھ انگریز بیوی مت لانا۔

”عمران خان نے چوبیس برس اس حکم سے سرتابی نہیں کی لیکن بالآخر جہانما سے شادی کر کے وہ نا فرمائی کے مرتکب ہو ہی گئے۔ عمران خان کے دماغ میں یہ خیال ہمیشہ رائج رہا کہ ان کی بہنوں اور کزنوں کی طرح ان کی شادی بھی ارشد ہوگی لیکن وقت نے ایسا رخ اختیار کیا کہ انہیں انگریز بیوی ہی لانا پڑی اور شادی بھی ارشد نہیں بلکہ پسند کی تھی۔ جہانما اور ان کی علیحدگی سے ان کی والدہ کی وہ پیش گوئی پوری ہو گئی جس میں انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کسی مغربی خاتون کو ہمارے کلچر میں

سے ڈپلومیٹ اور صحافی رہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن کی طبیعت کے بھی عمران خان بہت محترم ہیں۔ وہ ان کے اس اصول سے اتفاق کرتے ہیں کہ قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اس کی آیات کو انفرادی حیثیت میں دیکھنے کی بجائے کلیت میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں آیات کو کلیت میں نہ دیکھنے کی روش سے مبلغ حضرات لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر انفس کا اظہار کرتے ہیں کہ روایتی علماء کے باوجود پرانیوں پاکستان چھوڑنا پڑا۔ عمران خان ایوب خان کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب ان کی شخصی کوکھی جانتے ہیں۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمن کی تین معروف کتابیں ”قرآن کے بنیادی موضوعات“، ”اسلام اور جدیدیت“ اور ”اسلام“ کا اردو میں ترجمہ عربی عالم جہم کاظم کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول ڈاکٹر فضل الرحمن، اقبال کے بعد اسلامی فکر کے دوسرے بڑے شارح ہیں۔

آصف علی زرداری سے واحد ملاقات

”1989ء میں کراچی میں بینظیر بھٹو کے گھر بلاول باؤس ملے گیا تا کہ انہیں ہسپتال کے لیے فنڈ ریزنگ کے سلسلے میں تعاون کا کہہ سکوں۔ بینظیر مصروف تھیں اس لیے ہمیں آصف علی زرداری سے ملنے کا موقع دیا۔ آسکفورد میں بینظیر کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے میں توقع کر رہا تھا کہ مجھے ہمدردانہ سنا جائے گا۔ آصف زرداری میرے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے اور میری نمائندگی تحریف کرتے رہے۔ تاہم انہوں نے مجھے کسی مدد کی پیشکش نہ کی بلکہ اس کی بجائے وہ میرے ہمراہ جانے والے دوست طارق شفیع سے زیادہ دیر محو کلام رہے۔ طارق کا تعلق پاکستان میں نیکیاں اٹھانے والے بڑے گھرانوں سے تھا، زرداری اسے پہچان پارتی کے گڑھ سندھ میں دو غیر مسلم لگانے کا کہتے رہے، ان کا کہنا تھا کہ وہ صوبے میں کچھ لوگوں کو روزگار سمیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ہسپتال کے لیے مستقبل میں کبھی بھی بینظیر اور ندان کے شوہر کی طرف سے کسی قسم کی مدد کی گئی۔ شوکت خاتم کے افتتاح کے موقع پر بینظیر اور آصف علی زرداری نے ہسپتال کے افتتاح کی خواہش ظاہر کی جو مجھے قبول نہیں تھی کیونکہ یہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا کہ یہ افتتاح ہسپتال کی پہلی کینسر مریمہ غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی 10 سالہ میرا یوسف کریں گی۔“

عمران خان کے متفرق خیالات کی جھلکیاں

”پاکستان نژاد برطانوی صحافی طارق علی کے برعکس ہمارے ہاں بائیں بازو کا میڈیا اور طبقہ دانشوراں پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں انسانی حقوق کی بہت سی خلاف ورزیوں پر سینیٹر لینے میں ناکام رہا۔ اس کے پیچھے بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ حقیقی طور پر سمجھتے اور محسوس کرتے تھے کہ پاکستان میں طالبان تازہ نہیں کا مکہ خطرہ ڈرون حملوں اور پاکستان فورسز کے قبائلی علاقوں میں آپریشن کے

باعث انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ وہ صحافی اور کالم نویس جو پہلے خود کو سامراج مخالف لبرل کے طور پر متعارف کراتے تھے اچانک دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہمارے ہتھیار ڈالنے کے حمایتی بن گئے۔ ان کی پاکستان کی خودمختاری کو پیش خطرے اور اسے ہم دونوں پر بمباری پر خاموشی حیران کن تھی۔ این بی او نے اس ضمن میں کچھ نہیں کیا کہ ان کو مغربی ڈونرز فونڈ دیتے ہیں۔ بڑی سیاسی جماعتیں اس لیے خاموش رہیں کیونکہ وہ امریکہ کی حمایت کھونے سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس صورتحال میں میری پارٹی اور مذہبی جماعتیں ہی باقی تھیں جنہوں نے سینیٹر لیا۔“

”اقبال جن تاریخی حالات میں رہتے تھے، وہ کئی اقتدارات سے آج سے مختلف تھا تاہم جو کچھ انہوں نے کہا وہ ہم سے اور ہمارے عہد سے مکمل طور پر مطابقت رکھتا ہے۔ حقیقت میں اقبال کا پیغام ماضی اور حال کے کسی بھی دوسرے مسلمان مفکر سے آج زیادہ متعلقہ اور اہم ہے نہ صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے روایتی اور جدید دونوں قسم کے چیلنجز کا سامنا کیا بلکہ زیادہ اہم طور پر یہ کہ وہ قرآن پاک جس کو انہوں نے اپنی فکر کی بنیاد بنایا تھا اس کے اجتماعی تصور کا واضح ادراک رکھتے تھے۔ اقبال کی چند معروف نظموں کو زیادہ تر اگ سے پڑھا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری کا بنیادی پیغام، جو ان کی انقلابی روح کا عکاس، بے خوف خیال اور انصاف کے لیے پرجوش دانشگری اور خود شناسی کی عظمت سے بھر پور ہے، اس کو عوامی حلقوں سے دور رکھا گیا۔ اقبال کے خیال میں اسلامی دانشورانہ فکر کو گھن گنا اور زوال آج سے پانچ سو سال قبل اس وقت شروع ہوا جب اجتہاد، جس کا مطلب ہے مذہب اور اس سے جڑی روایات کے بارے میں دانشورانہ غور و فکر ہوتا ہے، کے دروازے بند کئے گئے۔“

”پاکستان کے مغرب زدہ طبقہ کا ایک حصہ امر موجود ہے جو محض سیکولرزم بلکہ دراصل اسلام مخالف ہے اور وہ ملایا بنیاد پرستی کو اسلام پر حملے کے لیے علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ سابق ترک وزیر اعظم نجم الدین اربکان نے ترکی میں اسلام مخالف اشرفیہ کے بالکل ایسا ہی رویے کے متعلق گفتگو کی تھی، ایک انٹرویو میں انہوں نے بیان کیا کہ ترک پارلیمنٹ میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر لبرل لوگ شور مچاتے اور تلخک کے طور پر ڈیک پیٹتے تھے۔“

بینظیر بھٹو سے پہلی ملاقات کا قصہ

”بینظیر سے میں پہلی بار اس وقت ملاجہ وہاں سے انہیں کے چھوٹے بھائی عمران خان نے ان کے سوشلسٹ ہونے کی معیثی کے بارے میں سوال کی جرأت کی تھی۔ آسکفورد میں ملاجہ علم کی حیثیت سے میرا خیال ملک کے ساتھ ایک گھر میں مشترکہ قیام تھا۔ ایک روز جب میں گھر پلانا اور گھر کے باہر موٹر سائیکل کو تالا چڑھا رہا تھا تو بجٹ کرتی خاتون کی آواز میں میں سنا تھا۔ خیال ملک نے

مرحطہ درویش ہوتا اور یہ نواز شریف تھے جو اس سطح کی کرکٹ کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے اور چلے تھے بغیر خانقاہی سامان پہنے اس ہلکے بولنگ کا سامنا کرنے۔ چھوٹے چھوٹے کچے دیٹ انڈین بولر نے پہلی گیند بھیجی تو ہم نے دیکھا کہ اس سے پہلے کہ نواز شریف بلا اٹھائے، گیند وکٹ کپر کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔ ٹیم نے اس پر سکون کا سانس لیا۔ نواز شریف کے حق میں بہتر یہ ہوا کہ دوسری گیند سیدھی پڑی اور اس سے قبل کہ وہ حرکت میں آئے، وہ ٹیس میں پرتکرار چکا تھیں۔

اسے شکست نہیں دی جا سکتی

”بوڑھا اور مسند روا“ نوبل انعام یافتہ امریکی لکھاری ہمنگ وے کا شہرہ آفاق ناول ہے۔ اس ناول میں ایک بوڑھے پھیرے کی کہانی بیان ہوئی ہے جو کئی روز مچھلی جال میں نہ آنے کے باوجود امید کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور اپنی ذہن میں کُن کام میں جتا رہتا۔ ایک مقام پر بوڑھا جس کا نام سانچا گو ہے، ایسا فقرہ کہتا ہے جو انسانی عزم و ہمت کے واسطے ایک منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ ”انسان شکست کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ انسان کو فو تو کیا جا سکتا ہے، اسے شکست نہیں دی جا سکتی۔“ وہ شخص جس کا قصہ حیات ہم اس کی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب کی مدد سے سنانے جا رہے ہیں، اس کی تمام زبست ہمنگ وے کے مذکورہ بالا فقرے کی عملی تجسیم نظر آتی ہے۔ یہ صاحبِ عمران خان ہیں جنہیں بلا خوف و تردید پاکستان کا سب سے معروف چہرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیاست میں وارد ہونے سے قبل عمران خان کی شخصیت کے دو بنیادی حوالے تھے۔ پہلے کرکٹ اور دوم شوکت خانم میموریل ہسپتال۔ اور سماجی راجھا کی حیثیت سے وہ جس مقام بلند پر فائز ہیں اس تک جن حالات سے گزر کر وہ پہنچے ہیں، انہیں جان کر اس علو ہمت شخص کے حوصلے اور عزم کی داد دینا پڑتی ہے اور آدمی بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے، ہمت کرے انسان تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا۔ کرکٹ سے دلچسپی بچپن میں ہی قائم ہو گئی تھی، دو کزن پاکستان کرکٹ ٹیم کا حصہ تھے۔ کپتان بھی رہے۔ عمران خان نو برس کی عمر میں والدہ کے ہمراہ لاہور میں پاکستان اور ایم سی سی کا میچ دیکھنے گئے جس میں ان کے کزن جاوید برکی نے چٹری سکوری تھی، اسی دن انہوں نے قصد کر لیا کہ انہیں بھرپور ٹیمٹ کر کرکٹ بنانا ہے۔ اس ارادے کے بعد انہیں کبھی یہ شک نہ گزرا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی نہیں کریں گے۔ عمران خان نے یہ بات اس کتاب میں شامل نہیں کی لیکن وہ اپنے ایک انٹرویو میں بتا چکے ہیں کہ انہیں بچپن میں ہمیشہ یہ احساس دلایا گیا کہ کرکٹ میں وہ اپنے دونوں کزنوں سے کمتر صلاحیت کے حامل ہیں۔ پہلے پہلے ٹیمٹ میں بری طرح ناکامی کے بعد، ان کے ساتھی کھلاڑی یہ کہتے پائے گئے کہ وہ آئندہ انٹرنیشنل کرکٹ کا خیال دماغ سے رفع کر دیں۔ ایسی باتوں سے وہ بددل نہیں ہوئے، اور جلد ہی کرکٹ میں اپنا نام اور مقام بنالیا۔ انگلینڈ میں ڈیش لئی کی حیرت راز کرکٹ کے کمالات

آکسفورڈ سے تعلق رکھنے والے دوسروں پاکستانیوں سے بینظیر کھیلوانے کے لیے بلایا تھا تاہم وہ یہ بات کر کے مزید زرعی اصلاحات کو سندھ میں پورے طور پر نافذ نہیں کیا گیا خود ہی مہمان کو شیشل کر چکا تھا۔ لازمی طور پر یہ بینظیر بھٹو کے لیے حساس موضوع تھا، جس کے والد نے 1972ء میں محدود زرعی اصلاحات کے ساتھ جاگیرداروں کی طاقت کو کم کرنے کی علامتی کوشش کی تھی۔ میں نے بینظیر کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی اور اس پہلی ملاقات کے بعد ہم اچھے دوست بن گئے۔ بینظیر انگریزوں کے ساتھ نرم خور اور پاکستانیوں کے ساتھ حاکمانہ رویہ روا رکھنے کی شہرت رکھتی تھیں۔ 1974ء میں جب ان کی عمر تقریباً 20 برس تھی، میں نے انہیں ہالینڈ میں پاکستانی سفارتخانے میں کرکٹ ٹیم کے اعزاز میں دینے گئے استقبالیہ میں دیکھا، وہ ادھر موجود سفیر پر ایسے حکم ہمارا تھیں جسے وہ ان کا ذاتی ملازم ہو۔ یہ بھی بالکل واضح ہے کہ بینظیر دور جوانی سے ہی جاہ پسند تھیں۔ وہ میرے آکسفورڈ چھوڑنے کے ایک سال بعد تک ادھر رہیں، میرا ہمیشہ یہ مفروضہ رہا ہے کہ انہوں نے ایسا اس واسطے کیا کہ وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی صدر بننے کے لیے پرعزم تھیں۔“

ویسٹ انڈیز کے فاسٹ بولرز اور بھیر ہیلمٹ نواز شریف

1987ء کے خزاں میں ہونے والا ایک واقعہ نواز شریف کے مائنڈ سیٹ کی عکاسی کرتا ہے۔ ورلڈ کپ سے ذرا پہلے اکتوبر 1987ء میں جب ٹیم کا کپتان تھا، ہم نے ویسٹ انڈیز کے خلاف فوڈائی سٹیڈیم لاہور میں واپس آ کر میچ کھیلا۔ میچ سے چند لمحے قبل کرکٹ بورڈ کے سیکرٹری شاپرڈ نے مجھے بتایا کہ وزیر اعلیٰ پنجاب آج پاکستان ٹیم کی قیادت کریں گے۔ میں حیران ہوا لیکن پھر خود ہی تصور کر لیا کہ ان کا مکمل میں ناشرکی قسم کا کردار ہوگا اور وہ ڈریبنگ روم میں بیٹھ کر میچ دیکھیں گے لہذا جب میں نے انہیں کرکٹ کے سفید لباس میں ملیں ویسٹ انڈیز کپتان ویوین رچرڈ سے ٹاس کرنے جاتے دیکھا تو حیران رہ گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ حیرانی کا آنا ابھی باقی تھا۔ وہ ٹاس جیت گئے اور واپس آ کر گلے اپنے پیٹے باندھتے۔ ٹیم میں کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا جو وہ دیکھ رہے تھے، نواز شریف کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین بولنگ ایک کے خلاف مدثر کے ساتھ اوپننگ کرنے جا رہے تھے۔ مدثر نے بیٹنگ پیٹ، تھا پیٹ، جسٹ پیٹ، آرم گارڈ، ہیلمٹ اور گلوڈ پہنے ہوئے تھے جبکہ نواز شریف نے محض بیٹنگ پیٹ اور فلانی ہیلمٹ پہنا اور چہرے پر مسکراہٹ کو ساتھ رکھا۔ وہ لوگ جو کرکٹ کی تاریخ سے آگاہ نہیں، ان کے لیے یہ جاننا اہم ہوگا کہ یہ ایسا بولنگ ایک تھا جو دنیائے کرکٹ نے اس سے پہلے دیکھا نہ بعد میں، نوے گلوبل ٹی وی گھنٹی کی رفتار والے چار بولرز، یہ تھا ویسٹ انڈیز کا تھمکے خیز بولنگ ایک، جس نے بہت سے اصلاحیت کھلاڑیوں کا کیریئر تباہ کر ڈالا۔ تین الاقوامی ٹیمیں اور پروفیشنل کرکٹرز کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی جب انہیں ان بولروں کو سامنا کرنے کا

دیکھ کر ایسے محزون ہوئے کہ میڈیم پیئر سے فاسٹ بولر بننے کی تمنا جاگئی۔ عمران خان لکھتے ہیں: "1972ء میں پہلی بار فاسٹ بولر ڈینس لٹی کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا اور اس کی تقلید کرتا میری اُمگ بن گئی۔ سینئر کلاڈی اور ورسٹر شائر میں میرے کوچ مصر رہے کہ نہ تو میری جسمانی ساخت اور نہ ہی میرا بولنگ ایکشن ایسا ہے کہ میں فاسٹ بولر بن سکوں اور اگر میں نے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کی تو میں اپنا کیریئر جاہ کر لوں گا۔ یہ آئیڈیل ازم ہی ہے جس نے مجھے خطرات مول لینے کی جرأت عطا کی۔ میں نے فاسٹ بولر بننے کے لیے نہ صرف اپنا بولنگ ایکشن تبدیل کیا بلکہ فاسٹ بولنگ کرنے کے لیے میرا جسم اور بھی زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ بین الاقوامی کرکٹ میں کوئی دوسرا نہیں جس نے میری طرح مکمل طور پر بولنگ ایکشن تبدیل کیا ہو۔" یہ تو کرکٹ کے ابتدائی دور کی ایک مثال ہے، ان کے عزم و ہمت کی داستان کیریئر کے آخری دنوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ 1992ء ورلڈ کپ میں پے در پے ناکامیوں کے بعد ان کی قیادت نے جس حیران کن انداز میں ٹورنامنٹ میں واپس آ کر کامیابی اپنے نام کی وہ کرکٹ کی تاریخ کا زریں باب ہے۔ کرکٹ میں ان کی کامیابیوں کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ بھارت اور انگلینڈ کو ان کی سرزمین پر چٹ کرنا انہم کا نامہ ہی سہی لیکن جس کا رتا سے کوہ کرکٹ میں اپنا سب سے اہم کارنامہ تصور کرتے ہیں وہ ویسٹ انڈیز کی ٹیم سے مسلسل تین سیریز برابر کرنا ہے۔ 1988ء میں پاکستان چندہ برسوں میں ویسٹ انڈیز کی سرزمین سے سیریز ہارے بغیر لوٹنے والی پہلی ٹیم تھی۔ ویسٹ انڈیز کے امپائرز اگر بے ایمانی نہ کرتے تو پاکستان یقینی طور پر یہ سیریز اپنے نام کر لیتا۔ اس دور میں عمران خان کے بقول ویسٹ انڈیز سے جیت کے لیے سوچا ہی نہ جاتا تھا بلکہ قابلِ عزت شکست کی فکر کی جاتی۔ کرکٹ کے بعد عمران کا دوسرا کارنامہ شوکت خانم میموریل ہسپتال کا قیام ہے۔ پاکستان جنوبی ایشیا کا پہلا ملک ہے جہاں پریکٹس ہسپتال قائم ہوا۔ یہ مجبورہ کس طرح رونما ہوا، اس کے پیچھے کیا کہانی ہے اس کا مختصر احوال اس کتاب کی مدد سے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔

عمران خان شوکت خانم میموریل ہسپتال کے بورڈ آف گورنرز تشکیل دے چکے تو لاہور میں چوٹی کے عیسٰی ڈاکٹروں کا اجلاس بلا یا تاکہ ان کی آرام کی روشنی میں پیش قدمی کی جاسکے۔ اس اجلاس کا نتیجہ نہایت مایوس کن رہا۔ عمران لکھتے ہیں: "ایک سے سوا تمام ڈاکٹروں کے خیال میں پاکستان میں قطعی طور پر یہ منصوبہ قابلِ عمل نہیں۔ ایک ڈاکٹر نے کہا کہ یہ ممکن ہے لیکن ایسا راستہ نہیں ہے کہ ہم غریبوں کا مفت علاج کرنے کے قابل ہو سکیں کیونکہ کینسر کے مریض پر اوسط لاکھ بہت زیادہ ہے۔ اس اجلاس کے بعد ہمارا مودال ڈاؤن ہو گیا۔ اس صورتحال سے نمٹنے کا میرے پاس کوئی تصور نہیں تھا۔ میں اس منصوبے سے دامن نہیں چھڑا سکتا تھا، کہ صرف میں کھلے عام اس بارے میں اعلان کر



چکا تھا بلکہ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں پہلے ہی رقوم اٹھی کرنا شروع کر چکا تھا۔ میرے کزن، کرکٹر جاوید برکی نے تجویز کیا کہ مجھے والدہ کے نام پر ڈپنٹری قائم کر کے، اس خیال کو نبھ دینا چاہیے۔ میری بہنیں جو میرے بارے میں بہت زیادہ فکر مند رہتی تھیں انہوں نے مجھے منصوبہ ترک کرنے کا کہا، ان کے خیال میں وگرنہ میں کرکٹ سے ملنے والی ساکھ اور عزت سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا لیکن اب تاخیر ہو چکی تھی اور اگر میں ایسا کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ میں لوگوں کے عملیات کس طرح واپس کر سکتا تھا؟ مایوسی کے ان دنوں میں پاکستان ایسوسی ایشن آف ڈاکٹرز ہاتھ امریکہ کے ڈاکٹروں کے ساتھ اجلاس نے مجھے امید دلانی۔ "مرحوم خان اب تھوڑے مطمئن تھے لیکن کچھ عرصہ بعد اعازہ ہوا کہ منزل ابھی بہت دور ہے۔ اس صورتحال میں ایک واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کام میں تاخیر یا ردی کو دخل کس قدر تھا۔ نیویارک میں کینسر سیشلسٹ ڈاکٹر تو صیف سے ہسپتال کی قبر میں حائل رکاوٹوں کا ذکر ہوا۔ ڈاکٹر موصوف نے انہیں بتایا کہ کینسر ہسپتال کی قبر کے لیے ایک ڈاکٹر ایسا ہے جو آپ کے بہت زیادہ کام آ سکتا ہے۔ جس ڈاکٹر کا نام انہوں نے تجویز کیا وہ کوئی اور نہیں مرحوم خان کے کزن ڈاکٹر نوشیرواں برکی تھے۔ وہ اب اس پراجیکٹ سے وابستہ ہو گئے اور اپنے فرائض کو کمال ذمہ داریوں کے ساتھ نبھایا۔ مرحوم خان نے کتاب میں ہسپتال کے لیے ان کی خدمات کو بڑے سچے سچے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کینسر ہسپتال کی قبر کے دوران مرحوم خان کو بہت سی ایسی ناگوار باتوں کو بھی برداشت کرنا پڑا جن سے وہ پہلے انحراف کرتے۔ مثلاً زندگی بھر اپنے والد سے بیویوں کا تقاضا کرنے سے گریزاں رہے لیکن مٹن کی تکمیل کے لیے اب جگہ جگہ پیسے مانگنے پر مجبور ہوئے۔ دولت کے مل بوتے پر مشہور لوگوں سے میل جول کے خواہش مند حضرات کے دھمکے سے وہ ہلکا دیا کرتے تھے لیکن اب انہیں یہ کڑوا محنت بھی پینا پڑتا۔ کینسر ہسپتال کے لیے بعض ناپسندیدہ ممالیوں کے سامنے ہجڑا بننا بھی ان کے لیے ذہنی اذیت کا باعث رہا کیونکہ ایک حتیٰ معمولی سے کینسر ہسپتال کو لاکھوں روپے کی امداد سے محروم ہونا پڑ سکتا تھا۔ کینسر ہسپتال کے منصوبے سے ان کی شخصیت میں ایک نمایاں تبدیلی بچوں سے قریب ہونا تھا۔ بچوں سے کس اعزاز میں پیش آتا ہے، ان کے لیے ہمیشہ مسئلہ رہا تھا۔ والدین بچوں کو ملوانے کے لیے گھر آتے تو ان کے کہنے پر بہنوں کو ان کے گھر نہ ہونے کی غلط بیانی کرتا پڑتی جس پر ان کی والدہ خاتون بھی ہوتیں۔ کینسر ہسپتال کے لیے بچوں کے سکولوں میں جا کر امداد جمع کرنے کے خیال سے بھی وہ خوفزدہ تھے لیکن انہیں یہ کرنا پڑا اور یوں بچوں سے ان کے مضبوط تعلق کی بنیاد پڑی۔ کرکٹ اور ہسپتال کی قبر کے بارے میں ان کی کدو کاوش سے آپ کو مختصر اہم نے بتا دیا۔ اب تھوڑا مرحوم خان کے حالات زندگی کا ذکر ہو جائے۔

مرحوم خان نے زمان پارک لاہور میں قیام پاکستان کے پانچ برس بعد آنکھ کھولی۔ بچپن میں وہ

عام بچوں کی طرح آوارہ گرد اور پڑھائی سے کٹی کڑانے والے تھے۔ مگر سے باہر جانے کے لیے ہر وقت آمادہ، گرمیوں کے دنوں میں بھی والدہ کے لیے انہیں باہر جانے سے باز رکھنا خاصا مشکل ہو جاتا۔ عمران خان کی شخصیت پر ان کی والدہ کا گہرا اثر ہے۔ کتاب میں جب ان کے بارے میں واقعات ملتے ہیں۔ ماں سے محبت کا جذبہ ان کے ہاں اتنا شدید تھا کہ وہ ہر اس کام سے بچنے کی کوشش کرتے جس سے ان کی خشکی کا اندیشہ ہی ہوتا، اسی لیے بچپن میں مالی کے خوف سے درخت سے چھلانگ لگانے سے چوٹ آئی تو اس کو والدہ سے صاف چھپا گئے۔

عمران خان نے اس کتاب میں اپنی نانی اماں کا ذکر بھی کیا ہے جو خاندان بھر کے بچوں میں ہر دلعزیز تھیں اور وہ ان سے ایسی باتیں کر لیتے تھے جنہیں والدین سے کرنے میں انہیں خوف لاحق ہوتا۔ عمران خان کی کنفیال میں کرکٹ کا بڑا چم تھا اس لیے بچپن میں ہی اس کیل سے متعلق ہو گئے۔ عمران خان کی والدہ ہوم ورک کے بارے میں زیادہ تردد کرتیں، اس کے علاوہ بیٹے کی مرضی کے برعکس کسی اور کام پر مجبور نہ کرتیں۔ سکول تو عمران چلے ہی جاتے تھے کہ بجواس کے اور چارہ ہی کیا تھا لیکن مگر آنے والے مولوی صاحب کو بل دے کر وہ زمان پارک میں جا کر کزنوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتے۔ عمران خان کے والدین مذہبی رجحان رکھتے تھے۔ والدہ کا بڑی فقیری پر بھی اعتقاد تھا۔

اس زمانے کے عمران خان کا خود مذہب کے بارے میں رویہ کیا تھا وہ بتاتے ہیں ”میری والدہ ہمیشہ سے جانتی تھیں کہ وہ چیزیں جن سے مجھے شدید نفرت ہے ان میں سے ایک کسی کام کو بڑور کروانا ہے۔ مجھ کو بھٹنا زیادہ خوف اور دباؤ کے ذریعے بہتر مسلمان بنانے کی کوشش کی جاتی میں اتنی ہی زیادہ حراست کرتا۔ قرآن پاک صراحت سے بیان کرتا ہے ”دین میں جبر نہیں“ والدین کے خیالات کے زیر اثر ان میں تو آبادیاتی نظام سے نفرت نے جنم لیا۔ والدہ رات میں انہیں انگریزوں کے خلاف نیر و آزار پہنے والے دلاوروں کے قصے سناتیں۔ ٹیپو سلطان کا قول ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیلڈر کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“ والدہ کی زبانی انہیں بار بار سننے کو ملا۔ بچپن میں ماحد خان ان کے کرکٹ ہیرو تھے، اسے حالات کی ستم ظریفی جانے کہ کپتان بننے کے بعد عمران خان کو انہیں ڈراپ کرنے کا مشکل فیصلہ کرنا پڑا جس سے دونوں کے تعلقات ظاہری سی بات ہے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ماحد خان کے سچے ہیرو بننے کا یہ فائدہ انہیں البتہ ہا کہ وہ ان کی تھلید میں شراب پینے سے بہرہ گیریاں دے رہے۔ پاکستان سے 1974ء میں ایسے لیول کرنے کے بعد وہ انگلینڈ سدا رہے۔

یہاں شروع شروع میں ان کا جی نہیں لگا۔ والدہ سے اس بابت بات ہوئی تو انہوں نے فرزند ولید کو وطن لوٹ آنے کا مشورہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کسی اور وقت میں جا کر تعلیم مکمل کر لیں یا پھر اگر چاہیں تو پاکستان میں ہی رہنے کو ترجیح دیں۔ عمران خان کہتے ہیں، ماں کی اس محبت اور حمایت نے

انہیں ہمیشہ احساس تحفظ دیا۔ ان کے یقین نے مجھے خود شہاسی کی وہ قوت دی جو کامیابی کے لیے بنیادی شرط ہے۔ بعد ازاں عمران خان نے خود کو انگلیڈ کے ماحول میں ڈھال لیا۔ اس زمانے کے ان کے قریبی ساتھیوں میں بینظیر بھٹو اور کرم مہتا شامل تھے۔

بھارت کے ساتھ دونوں جگہوں کو ایک نوجوان کی حیثیت سے انہوں نے دیکھا۔ اپنے مشاہدات انہوں نے مختصر اکتساب میں بیان کئے ہیں۔ 1965ء کی جگہ میں زمان پارک کے تحفظ کے لیے سول وٹینس کے تعاون سے ایک فورس بنائی گئی جس کا حصہ بننے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ کم عمر ہونے کے باعث موقع نہ ملنے پر انہیں مایوسی ہوئی۔ اس موقع پر قوم کے جذبے اور یکتائی سے وہ از حد متاثر ہوئے۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ ان کے لیے گہرے صدمے کا باعث بنا۔ فوجی آپریشن سے قبل مشرقی پاکستان جانے والی آخری پرواز میں وہ مغربی پاکستان انڈر 19 ٹیم کے رکن کی حیثیت سے سوار تھے۔ ادھر عام عوام ہی نہیں بلکہ کلکٹروٹوں کے روپے میں بھی انہیں تھکاؤ نظر آیا۔ مغربی پاکستان انڈر 19 کے کپتان اشرف الحق جو بعد میں عمران خان کے قریبی دوست بنے، انہوں نے عمران کو وہاں کے لوگوں کے خدشات اور چلنے والی آزادی کی تحریک کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے سرشار شدہ سرکاری میڈیا کی خبروں پر وہ اعتبار کرتے رہے تھے جس کے مطابق سب اچھا ہی رپورٹ کیا جا رہا تھا۔ اس سب کے باوجود ان کے حاشیہ خیال میں بھی تھا کہ پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ 1974ء میں عمران خان کو اشرف الحق دوبارہ ملے تو انہوں نے بتایا کہ کتنے زیادہ بنگالی سولین اس جگہ میں جان سے گئے۔ عمران خان کے خیال میں فریقین کے اعداد و شمار کی پڑتال مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ اس جگہ میں ہزاروں سولین مارے گئے۔ اشرف الحق سے ملاقات سے قبل جب بھی ان کے انگریز اور ہندو جاننے والے مشرقی پاکستان میں بڑی تعداد میں سولین اموات کی بات کرتے تو وہ اسے پاکستان اور پاکستانی فوج کے خلاف پراپیگنڈا قرار دیتے لیکن اب ان کا زاویہ نگاہ بدل چکا تھا۔ ان باتوں سے عمران نے یہ سبق حاصل کیا کہ آئندہ کبھی بھی وہ حکومتی پراپیگنڈا پر یقین نہ کریں گے نہ ہی اپنے عوام کے خلاف فوجی آپریشن کی حمایت کریں گے۔ بلکہ دیش کے قیام کے بعد دو انتظامی ہفتہ قرار میں آئے۔ عمران خان ان کی ذہانت اور حفاظت کے متصرف اور انہیں پکٹیشنٹ قرار دیتے ہیں۔ بطور ایک نوجوان 1965ء میں سلامتی کونسل میں بھونکی تقریر سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ ان کے خیال میں بھونکوم کے لیے وہ کچھ نہ کر سکے جس کی ان میں اہمیت موجود تھی۔ ان کی ناکامی کی وجہ ان کے نزدیک جاگیردارانہ سوچ ہے جس میں جانفین کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ عمران خان کے خیال میں صنعتی اور تعلیمی اداروں کو تو میاں نے ان کی پالیسی نے ملک کو شدید نقصان پہنچایا۔ 1979ء میں بھونکو چھائی ہوئی تو ان کو

یہ خبر سری لنکا میں ملی جس پر انہیں انسوس ہوا۔ اسی سال ایران میں انقلاب آیا اور روسی فوج بھی افغانستان میں داخل ہوئی۔ عمران خان نے اس ساری صورتحال کا بڑے مدلل انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ضیاء الحق اب پاکستان کے بلاشرکت غیرے بکراں تھے۔ عمران خان کی پاکستان ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ان کی ملاقات رہتی۔ 1987ء میں ضیاء الحق نے ٹی وی پر آکر عمران خان سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ عمران کو حکمران کی حیثیت سے وہ دوسروں کی طرح اقتدار کو بڑھاوا دینے والے لگے جو اپنے پیچھے جہاں کہ وہ چھوڑ گئے۔ جو نوجو حکومت ختم کرنے کے بعد ضیاء الحق نے انہیں کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی جس کو عمران خان نے رو کر دیا۔ اس پیشکش کے چند دن بعد جب وہ فرانس میں تھے، انہیں ضیاء الحق کے طیارے کے تباہ ہونے کی اطلاع ملی۔ بھونکی طرح ضیاء الحق کی موت کا بھی انہیں بہت دکھ ہوا۔ مبین قریبی کی نگران حکومت نے بھی انہیں وزیر بننے کی آفر دی جو انہوں نے حسب سابق مسترد کر دی۔ اس زمانے میں وہ ملکی سیاست میں دلچسپی لینے لگے تھے لیکن سیاسی جماعت تشکیل دینے سے زیادہ وہ نواز شریف اور بینظیر کے متبادل کسی قوت کی حمایت کے خواہاں تھے۔ بینظیر بھٹو اور آصف زرداری نے عمران خان کو ان کے ہاتھوں ہسپتال کا افتتاح نہ کرانے پر انتقامی کارروائی کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ عمران خان کے بقول ان کے فون ٹیپ کئے جاتے اور ایک گاڑی بھی ان کے پیچھے لگائی گئی۔ اس صورتحال میں عمران خان کے پاس دو راستے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے سیاسی حریف نواز شریف کے ساتھ مل سکتے تھے یا پھر اسلام آباد حاضر ہو کر حکمرانوں سے ہسپتال کا افتتاح نہ کرانے کی گستاخی پر معافی مانگ سکتے تھے۔ ان کے قریبی دوست اور علامہ اقبال کے نواسے یوسف صلاح الدین نے انہیں پیپلز پارٹی کی حکومت سے صلح کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ بصورت دیگر حکومت ہسپتال کو تباہ کر دے گی۔ عمران نے اس مشورے پر کان نہ دھرے اور پیپلز پارٹی حکومت کی کرپشن کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ نواز شریف بھی یہی کام کر رہے تھے لیکن عمران کے بقول وہ چونکہ خود کرپٹ تھے اس لیے عوام نے ان کی بات پر زیادہ یقین نہ کیا۔ 1996ء میں عمران خان نے پارٹی کی بنیاد رکھی اور اگلے ہی برس تحریک انصاف نے انتخابات میں حصہ لیا جس میں اسے عبرتناک شکست ہوئی۔ عمران خان کے خلاف مسلم لیگ نواز نے سینا وائٹ کا سینیٹر خوب اچھالا۔ یہودی لابی کے عمران خان کی حمایت پر کمر بستہ ہونے کی خبروں نے بھی انہیں نقصان پہنچایا۔

نواز شریف نے بھی ان کے ہسپتال کے امدادی کاموں میں روڑے اٹکائے اور ایک بار تو ان کو ارجنٹائن کے صدر کی جانب سے مفت ادویات کا عطیہ اس لیے نہیں سکا کہ اس کام کے لیے مطلوبہ خط رفیق تارڑ نے لکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ عمران نے بہت نہیں باری اور پارٹی کو منظم کرتے

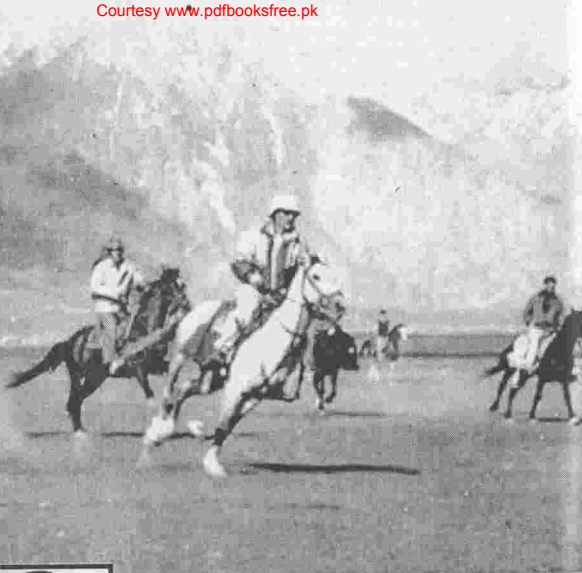
رہے۔ نواز شریف کے جانے کے بعد جنرل پرویز مشرف اقتدار میں آئے۔ عمران خان سمجھے کہ وہ ملک کے ساتھ تخلص ہیں اور ان کا سات نکاتی ایجنڈا ملک کے مفاد میں ہے لیکن بعد ازاں ان پر یہ راز کھل گیا کہ وہ ملک سے تخلص نہیں اور انہیں کرپٹ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا رہے ہیں جن کے خلاف کارروائی کے وعدے پر اقتدار میں آئے تھے۔ عمران خان نے مشرف کی حمایت پر قوم سے معافی بھی مانگی۔

2002ء کے الیکشن میں میانوالی سے رکن قومی اسمبلی بننے کے علاوہ ان کے پارٹی کے اکا دکا افراد ہی انتخاب جیتنے میں کامیاب ہوئے۔ 2008ء کے الیکشن میں انہوں نے اے پی ڈی ایم کے ساتھ مل کر انتخابات کا بیٹاٹ کیا۔ عدلیہ کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ سیاست میں عمران خان ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ان کے عزیم میں کمی نہیں آئی۔ کچھ عرصہ سے وہ سیاست میں بہت زیادہ متحرک ہیں اور خیال ظاہر کر رہے ہیں کہ آنے والا وقت ان کا ہے۔ اس خود اعتمادی کی بنیاد ان کے خیال میں قوم کے نوجوانوں میں ان کی بے پناہ تجویز ہے۔

حال ہی میں بی بی سی کے ایک اخبار نویس جنہوں نے عمران خان سے ملاقات کی ہے ان کے بقول ”تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے ساتھ چند گھنٹے کی گفتگو کے بعد جب کسی نے مجھے پوچھا کہ کیا محسوس ہوا تو میرا جواب تھا کہ ”عمران خان کا انتخاب جیتنے سے متعلق اعتماد دیکھ کر مجھے مزید خوف محسوس ہوا۔“ اس کتاب کے آخری صفحے پر بھی وہ قوم کو باور کراتے ہیں کہ اب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے جب وہ اقتدار میں ہوں گے۔ اس حوالے سے وہ اپنے روحانی گرو کی پیش گوئی کا بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے عمران خان کے ایک دوست عمر فاروق کے استفسار پر کی۔

عمران لکھتے ہیں: عمر فاروق نے پوچھا ”ہماری پارٹی کب اقتدار میں آئے گی؟“

”میاں بشیر نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تقریباً پانچ منٹ استغراق میں گئے اور پھر آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھ کر کہا کہ اس وقت جب میں ذمہ داری اٹھانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ جب انہوں نے یہ کہا تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں تیار نہیں ہوں۔ پارٹی کے قیام کے چند سال بعد، میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اور میری پارٹی نہ صرف یہ کہ تیار ہے بلکہ میری پارٹی ہی وہ واحد پارٹی ہے جو ملک کو اس موجودہ مایوس کن بحران سے نکال سکتی ہے۔ چودہ برس کی میری زندگی کی مشکل ترین جدوجہد کے بعد اب میری پارٹی آخر کار مائل پر دوازہ ہے، ملک بھر میں اس کا پھیلاؤ جنگل میں آگ کی طرح ہے۔ آج یہ تیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں میں ستر فیصد کی پہلی چوٹ ہے۔ اس بات کی تصدیق حالیہ دنوں میں ہونے والے دوسروے رپورٹس سے ہوتی ہے۔ پہلی بار میں نے محسوس کیا ہے کہ تحریک انصاف وہ خیال ہے جس کا وقت آچکا ہے۔“



چوگان

قوت فیصلہ کو تیز کرنے والا ایک انتہائی دلچسپ کھیل



عارف محمود پٹیل

سرزمین تبت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا ماخذ ”ٹیڈیو“ ہے جس کے معنی گیند کے ہیں۔ یہ کھیل تبت سے دوسرے ممالک میں رائج ہوا۔ تاہم تحقیقین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ کھیل ایرانی الاصل

فی الاصل ایک خالص مشرقی کھیل چوگان نہایت قدیم زمانے سے کھیلا جا رہا ہے۔ دونوں کے ساتھ یہ کہتا انتہائی مشکل ہے کہ کھیل کی شروع ہوا۔ چوگان کا لفظ دلائی لامہ کی پراسرار اور افسانوی

کے ساتھ ہی برصغیر میں چوگان بھی معدوم ہو گیا۔ تاریخیکہ 19 ویں صدی میں برٹش آرمی نے اس کو دوبارہ فروغ دیا۔ نکلنے میں جو اس زمانے میں انگریزی تہذیب کا اولین مرکز تھا پہلی بار برٹش آرمی کے افسروں نے 1863ء میں یہ کھیل کھیلا۔ ان ہی افسروں نے 1869ء میں اس کھیل کو برطانیہ میں متعارف کرایا اور پھر وہاں سے یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پہنچا۔ 1874ء میں پہلی بار کھیل کے قواعد و ضوابط مرتب کئے اور نیم میں کھلاڑیوں کی تعداد دس سے گھٹا کر پانچ کر دی گئی جو بعد میں چار ہو گئی۔ پولو امریکہ میں بہت مقبول ہے۔ سکولوں اور کالجوں تک میں کھیلا جاتا ہے۔ 1995ء کے بعد سے اس کو وہاں بہت عروج حاصل ہوا ہے۔

امریکہ اور ارجنٹائن نیز برطانیہ اور امریکہ کے درمیان چوگان کے انٹرنیشنل میچ ہوتے رہتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے شروع ہونے تک کھیل میں امریکہ اور ارجنٹائن کو برتری حاصل تھی لیکن اب کھیل میں برطانیہ کو برتری حاصل ہے۔ ارجنٹائن نے اولمپک مقابلوں میں ایک مرتبہ پولو کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ کھیل کے لیے گھوڑوں کو خاص طور پر سداہیا جاتا ہے۔ 1930ء کی دہائی میں ارجنٹائن کے گھوڑے زیادہ مقبول تھے تاہم تیکساس اور کینیڈا میں پالے جانے والے گھوڑوں کو بھی مقبولیت حاصل تھی۔

کھیل: کھیل کا میدان 300 گز لمبا اور 200 گز چوڑا ہوتا ہے۔ چوگان بالکل ہاکی اور فٹ بال کی طرز پر کھیلا جاتا ہے۔ ہر ٹیم میں چار چار سوار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بید کی بنی ہوئی بلایاں ہوتی ہیں جن کی لمبائی 48 انچ سے 72 انچ تک ہوتی ہے جس سے وہ گولڈ کی سفید گیند کو ضرب لگاتے ہیں۔ گیند کا قطر سوا تین انچ اور وزن سوا چار

ہے۔ اس امر کے شواہد ملتے ہیں کہ یہ کھیل ایرانی شہنشاہ دارا کے دور میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد والے دور میں یہ کھیل مصر، عرب اور ایران میں کھیلا جاتا تھا۔ شجرہ آفاق عربی ادیب و فاضل الجاحظ نے 860ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ الجاحظ نے اپنے سے تقریباً 800 سال پہلے کی تاریخ لکھی ہے۔

ایتھانی دور میں ایک ٹیم میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے۔ دیگر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ٹیم میں ہزاروں افراد کی شرکت کھیل کے لیے نہیں تھی بلکہ محض مذہبی رسومات تھیں جنہیں وہ لوگ موسم بہار میں اپنے زیتونوں کو خوش کرنے کے لیے بہا لاتے تھے تاکہ ان کی فصلیں اچھی ہوں۔

تبت اور چین کی سیاست کے دوران مشہور سیاح مارکو پولو کو معلوم ہوا کہ چوگان کا کھیل چین میں 600ء سے کھیلا جا رہا ہے تاہم اس کھیل کا پہلا تذکرہ مشہور چینی شاعر سن چوان چی (متوفی ۱۳۷۱ء) نے کیا ہے۔ چین سے یہ کھیل جاپان اور ہندوستان میں پہنچا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں خاندان غلاماں کی حکومت سے کافی عرصہ قبل کھیلا جاتا رہا ہے۔ برصغیر میں شانی سرپرستی کے باعث اس کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جوہر و سخا، فیاضی اور علم پروری کے لیے مشہور خاندان غلاماں کے اولین بادشاہ قطب الدین ایبک کا انتقال چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر نومبر 1210ء میں لاہور میں ہوا تھا۔ عظیم مغل شہنشاہ اکبر نے تو اس کو بہت اہمیت دی۔ ایک شانی فرمان کے ذریعے اپنے وزراء اور درباریوں پر پولو کھیلنا لازم قرار دیا۔ سرکاری حکام کو صبح، بروقت اور فوری فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ چوگان کا کھیل ان میں یہ سب صلاحیتیں پیدا کرتا ہے۔ مغل سلطنت کے زوال

انمول موتی

ہم غم چھوٹے آدمی کو توڑ دیتا ہے۔ اگر غم میں غم دینے والے کا خیال رہے تو پھر انسان بہت بلند ہو جاتا ہے۔

☆ دنیا کے اندر سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ یہ دنیا گناہ کے ستارشی کے لیے گناہ دیتی ہے اور فضل کے ستارشی کو فضل دیتی ہے۔

☆ جس کو صداقت اور نیکی کا سفر کرنے کی خواہش ہے وہ جان لے کہ یہ منگوری کا اعلان ہے۔ جس کو منگور نہیں کیا جاتا اس کو یہ شوق ہی نہیں ملتا۔

☆ جو بات آپ کے دل میں اتر گئی وہی آپ کا انجام ہے، اگر آپ کو موت آ جائے تو جس خیال میں آپ مریں وہی آپ کی عاقبت ہے۔

☆ جو آدمی موت سے نہیں نکل سکتا وہ خدا سے کیسے نکل سکتا ہے۔

☆ اپنی ہستی سے زیادہ اپنا نام نہ پھیلاؤ، نہیں تو پریشان ہو جاؤ گے۔

☆ استعداد سے زیادہ کی جتنا ہلاکت ہے اور استعداد کے کم خواہش آسودگی ہے۔

☆☆☆

پاکستان میں کھیل: گلٹ اور سرحد و ایجنسیوں کے لوگ کھیل کود کے بہت شوقین ہیں۔ وہاں پولو کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ تقریباً ہر گاؤں میں کھیل کا میدان ہوتا ہے اور چوگان بڑے جوش و خروش، جذبے اور ولولے سے کھیلا جاتا ہے۔ کھیل کے دوران بیٹڑ بنایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بھی ان علاقوں میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اپنی منہی منی بلیوں سے چوگان کھیل رہے ہوں گے۔

جب یہ بڑا بڑے ہوتے ہیں تو ٹوٹوں پر کھیتے ہیں اور رفتہ رفتہ بالکل نوجوانی میں ہی بہترین کھلاڑی اور سوار بن جاتے ہیں۔ ہر سال نومبر کے پہلے ہفتے میں گلٹ میں سالانہ چشمن مٹایا جاتا ہے۔ اس موقع پر پولو کے زبردست مقابلے ہوتے ہیں جن میں ہر علاقے کی ٹیم حصہ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ تاردرن سکاؤٹ اور گلٹ سکاؤٹ کی ٹیمیں بھی کھیل میں حصہ لیتی ہیں۔

نومبر میں اس کھیل کو دیکھنے کے لیے دروازے سے لوگ آتے ہیں حتیٰ کہ تمام شائقین کو ہوائی جہاز کے ذریعے روٹین پروازوں میں گلٹ لے جاتا ہے آئی اے کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے پی آئی اے عموماً اضافی پروازیں کرتی ہے۔ یہ شمار سیاح کھیل دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اس طرح پاکستان کو کافی زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

شمالی علاقوں کے علاوہ پاکستان کے دوسرے حصوں میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ حال ہی میں لاہور پینٹل چیمپئن شپ کے لیے مقابلے ہوئے تھے جس میں کرچی اور ملک کے دیگر حصوں کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا۔ خیال ہے کہ جلد ہی پاکستان کی پولو ٹیمیں فرانس اور امریکہ کا دورہ کریں گی۔

اوس اور پونے پانچ کے درمیان ہوتا ہے۔ کھیل ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔ درمیان میں پانچ منٹ کے لیے وقف ہوتا ہے۔ گول آٹھ گروچڑا ہوتا ہے کھلاڑی نمبر 4 کا مقام بہت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ اس کو نہ صرف مدافعت کرنا ہوتی ہے بلکہ گول کھیر کے فرائض بھی سرانجام دینا پڑتے ہیں۔ جب گول کھل جاتا ہے تو تین میدان میں اپنی جگہ بدل جاتی ہیں۔ کھیل میں دو ہینڈ پوز ہوتا ہے لیکن یہ بھی متناہوں میں ایک ریفری بھی ہوتا ہے تاکہ اگر ہینڈزوں میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو وہ فیصلہ کرے۔

ایک سے ایک

انجم انصار

ڈراما نگ روم ویا کا ویسا ہی تھا، سوائے ٹیلی فون کے اضافے کے، یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے سامنے ہی کوئی فون بھی آ گیا۔ سلمان بھائی بھی کی سرعت سے پیکر مگر بھائی نے ڈاج دے کر ریسپونڈ کرک کر ڈھالیا۔

ٹیلی فون کے کرشمے جو لوگوں کی اصلیت ظاہر کرنا کہ غیب میں جاتا ہے

اب کیا کہیں اور کس سے کہیں، بعض دفعہ تو صورت حال عجیب سی ہوتی ہے۔

بہر حال یہ بات تو طے ہے کہ اس میں سارا قصور حنگہ ٹیلی فون کا ہے کہ ان چند ماہ میں کرچی کے شہریوں کو اس قدر ٹیلی فون پانے کے پیسے روڑیاں بٹ رہی ہوں، وہ لوگ جو درختا میں دے کر کب کے ببولے پیٹے تھے، ان کے ہاں تک فون



سکتی۔“ ان کے ہم جہاں، ہاں لگال اعادہ نہیں ہو رہا تھا کہ بات کس موضوع پر ہو رہی ہے۔

”ہائی گاڈ، ان کا تو نام بھی مت لیتا، ورنہ میں نہیں یاد نہیں۔“

”کیا کھانا ٹھیک ہے اوکے، جان، دل خوش کر دیتا تم نے تم پر دردی نہیں جائیں گے تو کس پر۔“

وہ بھائی کس، اچھا بھائی ہوئی، اترائیں۔ چلو سلمان سے بات کرو۔“

”کس کا ہے ٹیلی فون؟“ بند ہونے کے نالے میری ساری ہی تپریاں ماتھے پر آ موجود ہوئیں۔

”ہاں، ہاں، کس کا ہے یہ ٹیلی فون؟“ سلمان بھائی بھی صورتحال سے پریشان ہو گئے۔

”نہیں، آپ خود بات کر لیں۔“ بھائی نے ریسپورڈر سلمان بھائی کو پکڑا دیا۔ انہوں نے کالوں سے لگایا، استفسار یہ نفلوں سے دیکھا۔

اور وہ فیس پڑیں۔

”اس میں تو کوئی نہیں بول رہا۔“ سلمان بھائی بڑبڑاتے۔

”میں ایسے ہی ٹیوننگی تھی، میں نے اٹھایا تو کوئی تھا ہی نہیں، ایک ہنڈ ہو گیا فون لگے ہوئے،

ابھی تک دو ٹیون فون کالوں کے سوا کسی کال فون نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ چلو، خود ہی اپنا دل خوش کر لیا جائے۔“ وہ منگراتے ہوئے بولیں۔

”مگر یہ تصوراتی باتیں کس سے کر رہی تھیں؟“ میں نے مسکراتے منہ پر کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی بھائی سے کہہ رہی تھی کہ اگر دعوت میں مجھے بلانا چاہتی ہو تو چھوٹی بھائی کو انوائٹ مت کرنا،

اور وہ میری بات مان لیں۔“

تب کمرے میں ہاتھ دے کر میں نے سوچا یہ بھائی تو جتنی سے بھی زیادہ چھوٹی نہیں!

سے بات کرو، ہاں فون بند مت کرنا۔ آبا جیکم بھی بات کریں گی۔ ابھی چچی کی بھی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کا کچھ آم مانگنے بھی آ گیا اور ہم یہ حاضر دیکھ کر کھسکی ہوئی ہو گئے۔ کیا کھانا، اور کیا ٹھہرنا فوراً ہی کمرے آ گئے۔

سلمان بھائی کے ہاں جاتے ہوئے، یہ خیال تھا کہ ان کے ہاں یہ چھوٹی کمرین دیکھنے کو نہیں میں کی، مگر ابھی بیٹھے دس منٹ نہیں ہوئے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ بھائی کی مذکورہ صورت، ہمیں اپنے ڈرائنگ روم سے لے کر جانا چاہتی ہیں۔

شاہد یونس فون لیا ہے یا پردے تبدیل کیے ہیں جس کا خیال کر کے کے بجائے وہ ہمیں حکم شاک پھینچنا چاہتی ہیں۔ کافی دیر تک ہم ان کی مکارانہ چالوں پر پانی پھیرتے رہے کہ ڈرائنگ روم میں

قدم رکھ کر نہیں دیا، مگر پچھلے وقت نہ جانے کیسے وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے جانے میں کامیاب ہو گئیں کہ اندر جا کر ان کی اس کامیاب

کوشش پر خود ہی داد دے دی کہ ہمیں گھٹ دے دی تھی۔ ڈرائنگ روم دیا کا دیا ہی تھا،

سوائے ٹیلی فون کے اٹھانے کے، یہ بھی ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے سامنے ہی کوئی فون بھی آ گیا۔

سلمان بھائی بھی کی سرعت سے لپکے مگر بھائی نے ڈانچ دے کر ریسپورڈر لپک کر اٹھالیا۔

”بھولہ میں زمین بول رہی ہوں۔“ لہجہ ان کا غراؤ نہ ٹھک کر تھا (یہ پچیس سال کی عمر میں،

سولہ سال کی کیسے بنتی ہیں۔ آج اس کا مکمل مظاہرہ ہم خود دیکھ رہے تھے)

”اللہ ٹھیک، ایمان سے۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ اب وہ صوفے پر کھولپھرے شاگل میں لیٹ چکی تھیں۔

”خواتون! یہ میں، اوں ہوں، میں نہیں مان

ٹیلی فون ہے۔

”اب بڑی چچی کے ہاں، خوب خوش کیوں میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔ کھانا بھی بے حد لذت تھا کہ

بھلی سی فرن ٹن کر چچی یوں اچھل کر بھاگیں کہ ہم کچھ بقیہ کسی چھوٹے انٹیں کاٹ لیا ہے۔ یوں بھی

فرشی نشست پر کھانا کھایا جا رہا تھا۔ برسات کے بعد کپڑے کوڑے اور کھیاں تو ڈیکوریشن کی طرح گھر

میں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چچی کے پیچھے چچی بھی ساتھ کا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر جس بدحالی سے

کمرے میں بھاگے تو ہمیں پورا یقین نہ کیا کہ وہ شاید چچی کے مہم لگانے گئے ہیں۔ توڑی دیر

بھی دم سامنے زبردستی نوالہ چپائے رہے مگر چند ہی منٹوں میں دونوں کی ہنسی کی آواز آئی تو ہم بھی

ششدر سے اس کمرے میں کھینچ گئے۔

”ہاں بھائی، اس وقت تو کھانا کھا رہے ہیں۔ آؤ تم بھی کھاؤ۔“ بوئے جینے کی جھلکی لڑکی تو فورے

کی خوببوٹھ کر کے ہمارے ہاں آ گئی ہیں۔ انہوں نے ہمارا تذکرہ کرتے ہوئے فون پر چپک کر کہا۔

”لاؤ، مجھے دھو، میں بات کروں گا۔“ چچانے فون چچی سے صحبت کر کہا۔

”ہاں بھی فریڈ کو بلاؤ، دفتر کے علاوہ بات ہی نہیں ہوتی، آپ تھارے

ہاں بھی فون لگ گیا ہے، ہمارے ہاں بھی۔ کم از کم ملاقات تو ہوتی رہتا چاہیے۔“ چچا قصداً جس

رہے تھے۔

”اللہ آپ یہ پوچھیں ناں! کد اب دوبارہ کب فون کریں گے، بھئی اور شاہزبہ کیل رات کی طرح

روٹیں گی، اگر ان کی بات مڑیا اور منی سے نہیں ہوئی۔“ چچی نے ٹھوکا دے کر چچا سے کہا۔

”ہاں فریڈ، آم کھاؤ گے، آجاء، سستی کی کیا بات ہے، دو گھر چھوڑ کر تو تمہارا گھر ہے خود آجاء،

ورنہ بچے کو کچھ دو، دے دیں گے۔ اچھا چلو اماں

سنہری باتیں

☆ غم چاہے کتنی عین ہونڈ سے پہلے تک ہے
☆ کائنات کا کوئی غم ایسا نہیں ہے جو آدمی

برداشت کر سکے۔

☆ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی خوشی صرف اسی شخص کو ہوتی ہے جو اس زندگی میں کوئی کام

کر رہا ہو۔ جو اس زندگی میں کوئی کام کر رہا ہو تو اسے مرنے کا خوف نہیں ہوتا۔

☆ ایک انعام سولہ سال کی عمر کا نام نہیں، ایک اعزاز مگر کا نام ہے، ایک اعزاز زندگی کا نام ہے، ایک کیفیت کا

نام ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص سولہ سال میں بڑا ہو اور ایک شخص ساٹھ سال میں جوان ہو۔

☆ سانس کی موت سے پہلے بہت سی موتیں ہو چکی ہوتی ہیں، ہم سانس کو موت سمجھتے ہیں

حالانکہ سانس تو اعطال ہے ان تمام موتوں کا جو آپ مر رہے ہیں۔

☆ جس انسان کی آنکھ میں آنسو ہیں وہ انسان اللہ سے کچھ نہیں سکتا، انسان کا اللہ سے قریب ترین رشتہ آنسوؤں کا ہے۔

☆ دور کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو قریب نہ آ سکے۔

☆ جب آپ اپنے ماضی کو حال پر فوقیت دیتے ہیں تو آپ مذہبی آدمی بن جاتے ہیں، جب

مستقبل کو فوقیت دیتے ہیں تو پھر سائنسی آدمی ہو جاتے ہیں۔ سائنس ماضی سے نجات پاتی ہے جبکہ

مذہب ماضی کی طرف رجوع کرتا ہے۔

☆☆☆

لگا دینے والے حالانکہ اس مستعدی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لوگ پہلے ہی پیٹ بھر کے پھوڑے تھے،

اب طبقہ بھر کے ہو گئے اور اس کا ذمہ دار صرف ٹھکر

پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کا معاملہ ہونے چار گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے:
”جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگا میں پھر چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں 80 کوڑے لگاؤ اور کسی بھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ یہ فاسق لوگ ہیں۔“ (4:24)

2- دو عورتوں کا ایک مرد کے برابر ہونا صرف اس گواہی سے متعلق ہے جس میں کوئی مالی لین دین ہو۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیشہ دو عورتیں گواہی کے لیے ایک مرد کے برابر تصور ہوتی ہیں۔ ایسا چند مخصوص معاملات میں ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں پانچ آیات ایسی ہیں جن میں گواہوں کا ذکر ہے۔ ان میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں دی گئی۔ قرآن پاک میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس میں گواہی کے لیے دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر بتایا گیا ہے۔ یہ سورۃ البقرہ کی آیت 282 ہے۔ یہ قرآن پاک کی طویل ترین سورہ ہے جس میں مالی معاملات زیر بحث آئے ہیں۔

ارشاد ہوا:

”اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے بیعہ مقررہ پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ بدلے لکھے۔ کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔ پس اسے لکھ دینا چاہیے اور جس کے ذمے حق ہو وہ لکھوائے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں، ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوا دے اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرو تاکہ ایک کو کوئی الجھاد ہو یا وہ غلامی کرے تو دوسری یاد دلا دے۔“ (البقرہ 282:2)

اس آیت میں صرف مالی معاملات کے بارے میں بات ہوئی ہے۔ ایسے معاملات میں فریقین میں تحریری بیعہ کر لیا جائے اور دو گواہوں کو شال کر لیا جائے، ترجیحاً دونوں مرد ہوں تو بہتر ہے۔ اگر دو مرد نہیں تو دو عورتیں اور ایک مرد گواہ بنالو۔

مثال کے طور پر کوئی شخص کسی بیماری کی وجہ سے آپریشن کرائے جا رہا ہے۔ علاج کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے وہ ترجیحاً دو سہ یا تین معتمدین اور سر جوئے سے رجوع کرے گا۔ اگر وہ نہیں تو وہ ایک سرجن اور دو عام معتمدین سے رائے لے گا جو صرف ایم ایس ڈی ایس ڈاکٹر ہوں گے۔

اسی طرح مالی معاملات اور لین دین میں دو مردوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اسلام مردوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنے مال بچوں کے لیے کما کر لاتے ہیں۔ مگر کی مالی ذمہ داری چونکہ مرد کی ہوتی ہے اس لیے ان سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مالی معاملات میں تجربہ کار ہوں گے۔ دوسری صورت میں گواہی کے لیے ایک مرد اور دو عورتیں ہوں گی تاکہ ایک عورت کو الجھاد ہو جائے تو وہ غلطی کرے اور دوسری اسے یاد دلا دے۔

قرآن پاک میں عربی کا لفظ ”تقین“ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے الجھاد، غلطی کرتا۔ بہت سے مترجمین نے اس کا ترجمہ ”بھول جانا“ کیا ہے جو غلط ہے۔ یہی صرف مالی معاملات میں دو خواہن

گواہوں میں برابری

ڈاکٹر ذاکر نایک



ڈاکٹر ذاکر نایک نامور سکالر اور محقق ہیں۔ انکا شمار ایسے محققین میں ہوتا ہے جنہیں دلیل اور علمی شہادتوں پر اپنی تقاریر اور خطابات کے باعث غیر مسلموں میں بھی بے حد شہرت حاصل ہے۔ وہ غیر مسلموں کے دلوں میں اسلامی تعلیمات کے حوالے سے پائے جانے والے تمام سوالات کا دلیل جواب دہ اسلام کی تعلیمات کی درستگی اور دین اسلام کی عظمت اور بلندی ثابت کرنے کا مشن لیے ہوئے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں بھی وہ غیر مسلموں بالخصوص امریکی اور مغربی میڈیا کے اس پراپیگنڈا کا بھرپور جواب دے رہے ہیں جو وہ اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق کے حوالے سے مسلمانوں پر عائد کرتے ہیں۔

سوال: گواہی کے لیے دو عورتیں ایک مرد کے برابر کیوں ہیں؟

جواب 1: دو خواتین بطور گواہ ہمیشہ ایک مرد کے برابر نہیں ہوتیں۔

قرآن پاک میں تین آیات ایسی ہیں جن میں گواہوں کا ذکر ہے مگر مرد اور عورت کی تخصیص کے بغیر.....

الف: وراخت کی تعلیم کے لیے وصیت کرے وقت دو عادل انسانوں کی بطور گواہان ضرورت ہوتی ہے۔ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر 106 میں قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

”اے ایمان والو! تمہارے آپس میں انھیں کا گواہ ہونا مناسب ہے جبکہ تم میں سے کسی کو وصیت آنے لگے اور وصیت کرنے کا وقت ہو۔ وہ دو انھیں ایسے ہوں کہ ہندار ہوں خواہ تم میں سے ہوں یا غیر لوگوں میں سے دو انھیں ہوں اگر تم کہیں سفر میں شیعے ہو اور انھیں موت آجائے۔“ (البقرہ 2:106)

طلاق کے معاملے میں بھی عدل و انصاف کرنے والے دو انھیں کی ضرورت ہوتی ہے:

”اور آپس میں سے دو عادل انھیں کو گواہ کرو اور اللہ کی رضامندی کے لیے ٹھیک ٹھیک گواہی

دو۔“ (البقرہ 2:65)

گواہوں کی ضرورت ہوگی جو ایک مرد گواہ کے برابر تصور ہوگی۔

3- گواہوں کے گواہوں میں بھی دو خواتین گواہ ایک مرد گواہ کے برابر نہیں تھیں۔ ایسے معاملات تاہم کچھ علماء یہ رائے دیتے ہیں کہ گواہوں کے گواہوں میں زنانہ گواہ کا بھی اثر ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں عورت مرد کی نسبت زیادہ ڈری ہوئی ہوتی ہے۔ وہ اپنی جذباتی حالت کی وجہ سے الجھا دے کا شکار ہو سکتی ہے لیکن کچھ فقہاء کے خیال میں گواہوں کے معاملات میں بھی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہو سکتی ہے۔ دوسرے تمام معاملات میں ان کے خیال میں ایک خاتون گواہ ایک مرد گواہ کے برابر تصور ہوگی۔

4- قرآن پاک میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ ایک عورت گواہ ایک مرد گواہ کے برابر ہے۔ کچھ علماء ایسے ہیں جن کے خیال میں دو خواتین گواہوں کا ایک مرد گواہ کے برابر ہونا تمام معاملات میں قانوناً درست سمجھا جائے۔ مگر اس سے اتفاق اس لیے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قرآن پاک میں سورۃ النور کی آیت 6 میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ایک خاتون گواہ ایک مرد گواہ کے برابر ہے۔ ”جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی گواہی دے اور ان کا کوئی گواہ بجز خود ان کی ذات کے نہ ہو تو ایسے لوگوں میں سے ہر ایک کا فیوض یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ وہ سچے ہیں۔“ (النور 6:24)

5- حضرت عائشہؓ کی واحد گواہی کافی ہے دالی اس حدیث کو مان لیا جائے

حضرت عائشہؓ جو ان محضوین کی محبوبہ تھیں، انہوں نے 2220 احادیث بیان فرمائی ہیں۔

صرف ان کی واحد گواہی پر ان احادیث کو مستحکم سمجھا جاتا ہے۔

بہت سے فقہاء کے خیال میں محکم کے جامعہ کے نظر آنے کے بارے میں ایک عورت کی گواہی کافی ہے۔ بڑا تصور کیجئے کہ روزہ اسلام کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے جس کے جامعہ کے نظر آنے کے بارے میں ایک عورت کی گواہی کافی بھی جارہی ہے اور تمام مسلمان اس کی گواہی کو درست مانتے ہیں۔ فقہاء کی رائے میں رمضان کا آقا زونے پر نظر آنے والے جامعہ کی گواہی کے لیے ایک عورت کافی ہے جبکہ رمضان کے اختتام پر عید الفطر کے لیے نظر آنے والے جامعہ کی گواہی کے لیے دو عورتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گواہ مرد ہوں یا عورتیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

6- بعض معاملات میں خواتین گواہوں کو ترجیح دی جاتی ہے

بعض معاملات میں صرف خواتین گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے اور مردوں کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی۔ مثال کے طور پر خواتین کے مسائل سے منظر کے لیے، جیسے مرگ پر عورتوں کو غسل دینے کے لیے گواہ عورت ہونی چاہیے۔

مالی معاملات میں جہاں مردوں اور عورتوں کی گواہی کے لیے تعداد کا فرق ہے یہ اس لیے نہیں کہ اسلامی مرد و زن میں کوئی عدم مساوات کا تصور ہے بلکہ یہ صرف اس لیے ہے کہ مرد اور عورت دونوں کی فطرت مختلف ہے، اسلامی معاشرے میں دونوں کا کردار مختلف ہے۔

”خود جلیس دیدہ اغیار کو بیٹا کر دیں“



husain.8@hotmail.com

قاسم رضا حسین سید سیارہ ذابجست کے مدیرین قاری اور مستقل قلم کار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جارہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سید نے قارئین سیارہ ذابجست کیلئے اپنے گھر سے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیا تھا ساتھ دنیائے ادب کی چندیہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد بیسی مٹھاس، لیوں کی گھٹاس، کوڑ تھامی کڑواہٹ اور ہر بلال کی آئینہ ہے۔!!

عالمانہ باتیں

☆ ”آپ (حضرت محمد ﷺ) تمام قلوب کے لیے رحمت مجسم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔“ (القرآن)

☆ عجائبات دہر میں سب سے بڑا عجوبہ انسانی آنکھ ہے۔

☆ ہر عمل کے اندر اس کا انجام یوں چھپا ہوتا ہے جیسے بیج کے اندر درخت۔

☆ انسان کس حد تک قائل بخدا ہے اور کس حد تک واقعات کا مکھڑا ہے۔ تدبیر کہاں پکٹی ہے اور تقدیر کہاں تک قفل دیتی ہے۔ یہ سب مجید ہیں اور ہمیشہ مجید ہی رہیں گے۔

☆ بچوں کو ماں باپ سے صرف صورت شکل ہی نہیں

بلکہ ذہنی اور اخلاقی صفات بھی وراثت میں ملتی ہیں۔

ماحول کا بھی ایک حد تک اثر ہوتا ہے۔

☆ وہیل کو انسانی فطرت سے واقف ہونا چاہیے۔

اس میں یہ قابلیت ہونی چاہیے کہ انسان کی سیرت کو اس کی صورت سے پہچان لے۔ میں نے شیپیر کے قیافے کا بہت غور سے مطالعہ کیا مگر مجھے یہ ڈھب نہ آیا کہ ان لوگوں میں سے جو لندن کی سڑکوں پر پھرتے تھے شیپیر کو پہچان لوں۔ (گاندھی)

☆ جب ہم مٹھی بھر تھے تو دنیا مسلمانوں کی مٹھی میں تھی۔ آج ہم ڈیڑھ ہار ہیں اور عربوں سمیت دنیا کے قدموں میں ہیں تو ایسا کیسے ہو گیا؟ ممکن کیسے ہوا؟ (حسن نثار)

☆ ہمارے تاجر کی بچکان کیا ہے؟ چور، جھانڈا، جھوٹا منافع خور، ذخیرہ اندوز.....

☆ ایسا شخص سنے سندھو میں سر نہیں کر سکتا جو ساحل کا چھوڑنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو۔

☆ قائد اعظمؒ کیا کرتے تھے کہ تعلیم کے بغیر اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور تعلیم ہی روشنی کو ابھار سکتی ہے۔

☆ میں امید کرتی ہوں کہ آپ بچے کی تعلیم کی طرف بے حد متوجہ رہیں گی۔ (محترمہ فاطمہ جناحؒ)

☆ تعلیم کا عام اور سستا ہونا ضروری ہے۔

☆ سائنسی معرکہ ہو گیا..... ایک نیا سیارہ دریافت..... جس میں نہ پانی ہے نہ گیس نہ تیل..... (کہیں دور بین کا زرخ پاکستان کی طرف تو نہیں)

(کارٹون جنگ ڈاٹ کام)

☆☆☆

ہم الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں

بعض اوقات صداقت کی زبان بھی اتنی تلخ ہوتی ہے کہ بس خدا کی پناہ۔ اگر کسی انسان کی ایک آنکھ کام نہ کرتی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ اس کے منہ پر ہی اسے کاٹا کہہ دیا جائے۔ ہر چند کہ یہ صداقت ہے لیکن یہ ایک بدبیزاری کا مظاہرہ ہے۔ صداقت کا غیر محتاج اعتبار کسی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔

ایک دفعہ ایک بادشاہ نے ایک دست شاس دستارہ شاس انسان کو بلایا، اس سے اپنا احوال پوچھا۔ مجمع نے حساب لگایا۔ زائچہ بتایا اور بادشاہ کو اطلاع دی ”جہاں پناہ! آپ کے سب عزیز آپ کے سامنے مر جائیں گے.....“ بادشاہ اتنی بری خبر پر بڑا پریشان ہوا۔ اسے غصہ کیا کہ مجمع نے کیا خبر دی ہے اس نے مجمع کو گرفتار کر دیا۔ سلطنت میں منادی کر دی گئی کہ کوئی اور مجمع بادشاہ کے لیے حساب لگائے۔ ایک آدمی حاضر ہوا۔ اس نے بھی زائچہ بتایا۔ حساب لگایا اور کہا ”جہاں پناہ!

آپ کی عمر طویل ہے۔ آپ اپنے سب عزیزوں سے زیادہ عمر بیاں گے۔“ بادشاہ خوش ہو گیا۔ ”یلا ناگ کیا مانگتا ہے۔“ مجمع نے کہا ”جہاں پناہ! بس میرے استاد کو رہا کر دیں۔“ سلطان نے وضاحت چاہی تو مجمع نے کہا ”میرے استاد میرا استاد ہے اس نے مجھے ہی بتایا تھا جو میں نے بتایا لیکن وہ الفاظ کے انتخاب میں محتاط نہ ہو سکا۔ آپ اپنے عزیزوں سے زیادہ عمر بیاں یا آپ کے عزیز آپ سے پہلے مر جائیں بات ایک ہی ہے لیکن اس کو مختلف ہے۔“ اور یہی چیز اہم ہے کہ ہم الفاظ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

الفاظ بھی خاندان رکھتے ہیں۔ قیدیے کے الفاظ اور دھرمے ہیں اور سرگرمی کے اور، عقیدے کے اور، توصیف کے اور، مذہب اور عقیدے اور غزل کے الفاظ اور ہیں، مثنوی کے اور۔ کیا مجھے کی ضرورت نہیں کہ شرافت کے الفاظ کون سے ہیں؟ بد مزاج ہونا اتنا خطرناک نہیں جتنا بدبیز ہو جانا کیونکہ بدبیز آدمی الفاظ کے غلط استعمال کا مجرم بھی ہے۔

الفاظ کے صحیح استعمال کی توفیق نعمت ہے۔ یہ نعمت بھی کم انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔ الفاظ سے ماحول کو خوشگوار بنانے کا کام لیا جائے تو بڑی بات ہے۔ خالی الفاظ لگنے اور الفاظ اگٹنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ الفاظ سے ماحول روشن کیا جائے۔

الفاظ سے دلوں کو خوش کیا جائے۔ الفاظ سے قہر ملت کے عظیم کام میں شامل ہونے کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔ الفاظ حقیقت ہیں۔ الفاظ امانت ہیں۔ الفاظ دولت ہیں۔ الفاظ طاقت ہیں۔

(”دافعل علی دافع“ کی کتاب حرف حرف حقیقت سے)

☆☆☆

عالمی یوم حجاب

جکارتہ کے خوبصورت مراکو ریسٹوران میں

مسلمان خواتین نے یہ دن منانا شروع کیا ہے مغربی دنیا میں بوجھال سا آ گیا ہے اور یورپی یہود و نصاریٰ اس ایک نقطہ پر متحد و متفق ہو گئے ہیں کہ مسلمان خواتین کو کسی بھی صورت حجاب پہننے سے روکنا ہے۔ اپنے اس گھناؤنے عزم کو کبھی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے کالے قوانین بنانے شروع کر دیے اور کئی ملکوں میں برقع پوش خواتین پر حملے کئے گئے اور پھر ان پر جرمانے بھی عائد کئے گئے۔ کہیں انہیں ملازمتوں سے نکال باہر کیا گیا اور کہیں ان پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ اپنی جان تک ہار گئیں۔

حقوق انسانی، حقوق نسواں جیسی تحریک کے علمبرداروں نے اپنے ہی قانون ان تحریکوں کے گلے پر چھری پھیرتی شروع کر دی۔ فرانس، سنیٹیم، اٹلی، ڈنمارک، ناروے، سویٹزرلینڈ اور امریکہ و برطانیہ و دیگر یورپی ملکوں میں فرانس پہلا حجاب ملک ہے جس نے اسلام دشمنی میں اس قدر اعتبار کر دی کہ مسلمان خواتین کے عام مقامات پر حجاب پہننے پر پابندی عائد کر دی اور جرمانے کی سزا کے ساتھ ساتھ سزا یوم قیدی سزا بھی رکھ دی۔ اس کی تقلید میں سنیٹیم نے بھی یہی منصوبہ رویہ اپنایا۔

شرم و حیا عورت کا زیور ہے۔ بالخصوص مسلمان خواتین کے لیے جو ایمان ہے۔ اسلام عورتوں کو غیر مردوں سے اپنے اعضاء چھپانے کا حکم دیتا ہے۔ خود آکر ان کریم میں اس حکم کو تائید کیا گیا ہے جبکہ مغربی عورت مرد کے سامنے عریاں ہے اور یہی عریانی عورت مرد، مسلمان عورتوں میں پھیلاتا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ کالے قوانین کا سہارا لے رہا ہے۔ اس طرح وہ عالمی قوانین کی مذمتی آزادی، شخصی آزادی اور مسلم ثقافت کی ششوں کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ عالمی قانون تمام اقوام کو ان

اردن کی شہزادی ہشہ بن طلال کے اعزاز میں انٹرنیشنل کی ایک تنظیم ”حجاب کرلو“ نے اپنے خوبصورت حجاب کی نمائش منقذہ کی تھی اور اس میں انٹرنیشنل مسلم ویدین یونین کے ایڈیٹر جین کی نگران کی حیثیت سے ڈاکٹر سمیرہ راضی صاحب صدر ویدین اینڈ فمیلی لکیشن کو مدعو کیا گیا۔ وہاں کی براہماد کا حجاب بچیوں کے ساتھ گفتگو کے دوران ہی میں نے اپنی پاکستانی بچیوں کے لیے کچھ منصوبہ بندی کی تھی جس پر عملدرآمد کا موقع غزالی انجکشن ٹرسٹ کے زیر اہتمام مری میں 15 تا 22 جولائی 2011ء کو ایک انٹرنیشنل یوتھ فیسٹ کے انعقاد کی صورت میں ملا۔

نائٹ الیون کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ نے جہاں اسلام کے خلاف کل کھل کر آرائی کی وہیں شہکار اسلام اور خاص طور پر حجاب کے خلاف ان کا تعصب بڑھتا گیا اور مسلم معاشرے میں حجاب کے پڑھنے ہوئے رجحان سے ذرائع ابلاغ کا بیخودہ نظر آئے۔ گئے۔ حجاب کے خلاف اس بیڑی میں ہوتی ہم کے پیش نظر 2004ء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں عالم اسلام کے ممتاز رہنما علامہ یوسف القرضاوی نے 4 تجر کو ”عالمی یوم حجاب“ منانے کا اعلان کیا۔ چونکہ ستمبر 2003ء میں ہیڈ اسٹارک پر پابندی کا قانون آسٹری میں پیش ہوا تھا اور اس بات پر مسلمانوں کے اندر بہت کم غصہ پایا جا رہا تھا اس لیے اس کے جواب میں عالمی یوم حجاب کا اعلان کیا گیا اور اس دن سے اسے پوری دنیا میں حجاب کے تحفظ کے عزم کو کے طور پر 4 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔

☆☆☆

عالم اسلام میں خواتین کے حوالے سے ”عالمی حجاب ڈے“ پہلا اسلامی اینٹ ہے جو عالمی سطح پر خواتین کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔ جب سے

تمام گھوڑے گرد و نواح میں موجود پہاڑی چٹروں کو چاٹ رہے ہیں اور گھوڑوں کی اس انوکھی حرکت پر، قافلے کے ہم راہیوں کا بس، دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کانوں کے سلسلے کی دریافت کا باعث بنا۔ جس علاقے میں سکندر اعظم کے قافلے نے پڑاؤ ڈالا تھا آج وہ صوبہ پنجاب کے ضلع جہلم کا علاقہ کیڑوہ ہے۔ اس جگہ کا نام لیجئے ہی منہ کا ڈانڈہ نکلتا ہو جاتا ہے۔ ہمارے کھانوں کا لازمی جزو نمک صرف ڈانڈے ہی کا ضامن نہیں بلکہ اس نعمت خداوندی سے انسانی صحت اور دیگر ضرورتوں کے علاوہ تزیین و آرائش کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔

(جگ سنگھ سٹریٹس سے)

☆☆☆

قوموں کی شکست و زوال کے اسباب کا مطالعہ

۱- روما

مملکت روما (Roman Empire) تاریخ کی عظیم ترین اور طویل ترین مملکتوں میں سے ایک ہے۔ یہ مملکت کوئی ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ عظمت اور طویل عرصہ حکومت کے لحاظ سے اہل روما (Romans) کا صرف مسلمانوں ہی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے جن کی حکومت کم و بیش اسی قدر طویل عرصے تک مہذب دنیا کے مختلف حصوں میں قائم رہی۔ مملکت روما اور مسلمانوں کی حکومت میں ایک تاریخی تسلسل یوں بھی نظر آتا ہے کیونکہ مملکت روما نے یونانی تہذیب کے زوال کے تہذیبی خلا کو پر کیا اور اسلام نے اس تہذیبی خلا کو پر کیا جو مملکت روما کے زوال سے پیدا ہوا تھا۔ دونوں آخر کار زوال پذیر ہوئیں اور زوال کے بعض اسباب مملکت روما اور مسلمانوں کے زوال کی تاریخ میں مشترک ہیں۔

3 2 3ء میں کسٹنٹائن اعظم

کے مذاہب کی مکمل روح (تہذیب و ثقافت) کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے لیکن مصعب مغربی ممالک کے یہود و نصاریٰ ایک قانون کے تحت سونگ مسک (Smoking Mask) کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کے لگانے سے بھی چہرے کی شناخت مٹ جاتی ہے لیکن وہ مسلم دشمنی اور اسلام کی عداوت میں اس قدر اندھے ہو چکے ہیں کہ وہ اس طرز پر مسلم خواتین کے حجاب پہننے سے اس قدر خوفزدہ ہیں گویا یہ حجاب ہم بن کر پھٹ پڑے گا۔

(”اشاعت خصوصی“ جگ ڈاٹ کام۔ پاک

4 نومبر 2011ء سے اقتباس)

☆☆☆

ایک پھیلی

امیر خسرو کی ایک کہانی کی وجہ سے یہ ہے کہ ایک گاؤں ایسا تھا جس کے کیتھوں نے بھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا۔ رات بارش ہوئی اور ایک ہاتھی کا ادھر سے گزر ہوا۔ صبح گاؤں والوں نے ہاتھی کے پاؤں کے نشان دیکھے تو اس حوالے سے قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں کہ کون سا جانور تھا، جس کا رات کو ادھر سے گزر ہوا؟ میاں لال جھکو بھی وہاں موجود تھے۔

امیر خسرو کی معروف کہانی کے بول یوں ہیں:

لال جھکو بوجھ گئے اور بوجھ نہ پادا کوئی پاؤں میں پچکے بانہ کر ہرنا کودا کوئی

☆☆☆

نمک

326 قبل مسیح میں سکندر اعظم اور رابندر پورس کے مابین دریائے جہلم کے کنارے ہونے والی جنگ کے بعد سکندر اعظم کے قافلے نے رات تمک پار کر آرام کی غرض سے پڑاؤ ڈالا۔ صبح آکھ کھلنے پر قافلے کے محافظ عجیب منظر دیکھتے ہیں کہ قافلے کے

معمم ہوتے تھے اور شب وروز اپنے آقا کی خدمت کرنے کے ساتھ بچوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ غلاموں کو سزا میں دینا اور کوڑے مارنا عام تھا۔ اس لیے اکثر اوقات شاگرد کچھ دیر غلاموں سے پڑھتے تھے اور باقی وقت اکثر اپنے غلام استادوں کو کوڑے مارتے تھے۔ علم و حکمت کی اس توفیق کے اثرات کیا ہوئے، مغربی مؤرخین مگن سے لے کر مانگیل گرانٹ اور جوزف نک متھن جی کہ مملکت روما کے زوال میں خاص نظام تعلیم، علم سے بے اعتنائی اور شوقِ خطابت کو بہت دخل ہے۔ خالص ادنیٰ تربیت اور شوقِ خطابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل روما علم و عقلیت کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ کوئی بڑا فلسفی، سیاستدان، ماہر اقتصادیات یا سائنسدان پیدا نہ سکا۔ شعر و ادب اور شوقِ خطابت کے علاوہ صرف ایک موضوع ایسا ہے جس پر اہل روما نے توجہ دی اور اس میں امتیاز حاصل کیا۔ وہ موضوع قانون ہے۔ ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ رومن قوم میں عقل و فراست کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنے لیے فوری مسائل کا حل تلاش کر لیتے تھے لیکن قوموں کے زعمہ رہنے کے لیے صرف فوری مسائل کا فوری حل تلاش کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ قوم کے اہل فکر کی نظر بہت دور بین ہوتی چاہیے تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ آئندہ دس میں یا پچاس برسوں میں کیا ہونے والا ہے یا ہو سکتا ہے۔ یہ دور بنی تجربے، حقیقت پسندی اور ان علوم کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے جو فکر انسانی کا ماحصل ہیں اور تجربے اور عقل کا نچوڑ۔ شعر و ادب، موسیقی، خطابت وغیرہ روح انسانی کی غذا ہیں اس لیے ضروری ہیں لیکن اگر ان کی خاطر علم و عقلیت کی طرف توجہ نہ دی جائے تو اس کے نتائج تباہ کن ہوتے ہیں۔ اہل روم نے ان عوامل میں توازن نہیں پیدا کیا اس لیے اعلیٰ عظیم مملکت زوال آمادہ ہوئی اور پھر

دھوکہ اور دھنی، علمیت کے بجائے خطابت اور بلاغت کا اثر اور بے چارے عوام کا بھولپن۔ مملکت روما کے زوال کی داستان کے بیان میں ان پہلوؤں کی وضاحت ہو جائے گی۔ مملکت روما حضرت مسیح کی پیدائش سے ذرا پہلے قائم ہوئی اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت سے قبل زوال آمادہ ہو کر ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے باقی رہ گئے جو صدیوں بعد ایک قائم رہے۔ رومن امپائر ایک ایسی مملکت تھی جس کے عروج کے زمانے میں سارا جنوبی یورپ، شمالی افریقہ (مصر وغیرہ) اور مغربی ایشیا کا کچھ حصہ ایک شہنشاہ کے زیرِ تسلط آ گیا تھا جس کا دارالخلافہ روما تھا۔ لیکن اس قدر عظیم، وسیع، طاقتور اور پرشکوہ مملکت کو زوال کیسے آیا اور وہ کیسے ٹوٹ گئی؟ سب سے پہلے میں ایک دلچسپ بات کا ذکر کروں گا جو مجھے مملکت روما کے زوال کے مطالعے میں نظر آئی۔ اہل روما خصوصاً اپنے زوال کے دور میں علم و حکمت میں کم دلچسپی رکھتے تھے اور سپر گری، فنون لطیفہ، شاعری، خطابت، موسیقی، فنِ تعمیر اور کھیل نمائش کی طرف زیادہ راقب ہو گئے تھے۔ چنانچہ معلیٰ پیشہ جو یونانی تہذیب میں چند ترقی ترین پہلوں میں شمار کیا جاتا تھا، اب ایک حقیر پیشہ تصور کیا جانے لگا۔ جب علم ہی کی قدر کم ہو گئی تو عقلی کی قدر کیا رہی لہذا اہل روما کے بہترین سیاسی، اعلیٰ افسر، شاعر، مقرر اور مختلف قسم کے ایگزٹر اور کھلاڑی بن گئے اور تعلیم و تدبیر کا کام غلاموں کے سپرد کر دیا گیا۔ جی ہاں! اس زمانے میں ہر حکماتے پیشہ مگر علم غلام ہوتے تھے۔ ان اکثر غلام اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے تھے کیونکہ یہ کام بڑے لوگ نہیں کر سکتے۔ کھیتے پڑھنے کا کام اکثر غلاموں کے سپرد تھا چنانچہ غلام ہی

پہلوا زیادہ اہم ہے جس پر تاریخ میں طعنا ہے۔ میں نے وہ اکھاڑے بھی دیکھے جہاں رومن انسانوں کو انسانوں سے لڑواتے تھے اور اس طرح لڑواتے تھے کہ دو آدمی اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک ایک دوسرے کو گل نہ کر دیں۔ میں نے وہ مقامات بھی دیکھے ہیں جہاں انسانوں کو شہر دے آگے ڈال دیا جاتا تھا۔ میں نے وہ فورم بھی دیکھا ہے جہاں روما کے اہم سیاسی مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں اور عوام کے نمائندے الکی موثر تقریریں کرتے تھے جو تاریخ اور ادب کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں نے وہ مقام بھی دیکھا ہے جہاں جولیوس سیزر کو گل کیا گیا تھا اور سیزر نے دوئی اور کوڑھی ساری المیہ داستان ایک جملے میں بیان کر دی تھی۔ بات یہ تھی کہ شہنشاہ جولیوس سیزر پر قاتلانہ حملے کے وقت بہت سے لوگ وار کر رہے تھے لیکن جب سیزر کے دوست بروٹس (Brutus) کی کھوار نے بھی اس کے جسم کو زخمی کیا تو جسم کے مقابلے میں سیزر کے دل کو زیادہ تکلیف ہوئی اور اس نے کہا:

”بروٹس کیا تم بھی؟“

سیزر کے قتل کے بعد بروٹس نے ایک تقریر کی تھی جس میں اس نے دلیل پیش کی تھی کہ اس نے سیزر کو یوں قتل کیا تھا۔ بروٹس نے سیزر کو ایک مطلق العنان شاہ طلب کران قرار دیا تھا اور کہا تھا: ”میں سیزر سے کم محبت نہیں کرتا لیکن روم سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔“

عوام بے چارے بھولے عوام!! جو آج بھی اسے بھولے ہیں جتنے آج سے دو ہزار سال قبل مملکت روما کے عروج کے زمانے میں تھے یا اس سے بھی بہت پہلے!

اہل روما کے کردار کی کئی جھلکیاں، شہنشاہ کا عروج و زوال، امراء کی سازش، دوئی، منافقت،

(Constantine the Great) تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا دار الحکومت روما سے تبدیل کر کے بازنطیہ میں قائم کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد مملکت روما کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک حصے پر مغرب سے حکومت کی جاتی تھی اور دوسرے پر مشرق سے۔ اس کے نتائج ظاہر ہیں۔ ہر طرف سے بیرونی حملے اور زیادہ شدت اختیار کر گئے۔ اٹلی کو بربر قبائل نے پامال کیا اور روم کی اینٹ سے اینٹ بنی دی۔ آخر کار 455ء میں آخری رومن بادشاہ رومولس آکٹس (Romulus Augustus) تخت سے دستبردار ہوا اور اس طرح مملکت روما تقریباً ختم ہو گئی۔

اقبال نے کہا تھا: ع سواد روستہ الکبریٰ میں دلی یاد آئی میں نے سواد روستہ الکبریٰ کی کوو بار دیکھا ہے اور مجھے دلی بہت یاد آتی تھی۔ دلی کسی زمانے میں میرا وطن تھا لیکن اب وہ تقابلی تاریخ (Comparative History) کے مطالعے میں میرے لیے ایک دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ روما کے آثار قدیمہ کو دیکھ کر دلی اس طرح یاد آتی ہے کہ یہ دونوں شہر تاریخ کی نہایت عظیم مملکتوں کا مرکز رہ چکے ہیں۔ غالباً مشرق میں دلی سے بڑی مملکت کبھی قائم نہیں ہوئی اور مغرب میں روما سے بڑی مملکت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ان دونوں شہروں سے علم و فضل اور تہذیب تمدن کی کرینیں پھوٹیں جنہوں نے مشرق اور مغرب کو صدیوں تک منور کیا اور دونوں شہروں نے عقلیت کا زوال بھی دیکھا اور اس طرح جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس وقت دلی اور روما کی تاریخ کا قابلِ مقصدو نہیں۔ یہ صرف روما کا کچھ ذکر کروں گا۔ سواد روستہ الکبریٰ میں میں نے جو کچھ دیکھا اس میں وہ

بیش کے لیے قسم ہوگی۔

(ڈاکٹر آغا حسین کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

قدرت نے انسان کو بے حساب نعمتوں میں سے کوئی نعمت ایسی نہیں دی جس کے غلط استعمال سے انسان کو نقصان نہ پہنچ سکا ہو۔ ہوا اور پانی کو لیجیے۔ یہ نعمتیں عواما کسی کاوش کے بغیر انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں اور ان کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا لیکن ہوا یا پانی ضرورت سے زیادہ مقدار میں انسان کے جسم میں داخل ہو جائیں تو بھی نعمتیں موت کا سبب بن سکتی ہیں۔ انسان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ اور باطل تاریخ کے دور میں انسان نے قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ بھی اٹھایا اور ان کے غلط استعمال سے نقصان بھی مثلاً انسان نے آگ کے فوائد بھی دیکھے اور نقصان بھی۔ آج بھی دیکھیں کہ بجلی جو ہر انسان کو روشنی اور حرمت عطا کرتی ہے ذرا سی بداحتیالی کی وجہ سے فوری موت کا سبب بن جاتی ہے۔

قدرت کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت دین اور مذہب بھی ہے۔ بلا منافہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے کردار کو سوار کرنے اور اسے مہذب زندگی کے آداب سکھانے اور دینی سکون عطا کرنے میں جتنا حصہ مذہب کا ہے کسی اور فکری عمل کا نہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ حضرت انسان نے مذہب جیسی نعمت کو بھی اکثر اپنی جگہ بھی، تنگ نظری اور خود غرضی سے آلودہ کیا اور مذہب سے وہ کام لیا جو مذہب کا مقصد بھی نہ ہو سکتا تھا یعنی مذہب کو احمال، ظلم و تشدد، جہل، منافقت، تاریک جوئی، رجعت پسندی، استعمار اور زرگری کے لیے استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات تو مذہب اور ریاست دونوں تباہ ہو گئے اور بعض اوقات مذہب کو

عروج حاصل ہوا اور ریاست تباہ ہو گئی۔ مملکت روما کا زوال مؤخر الذکر تباہی کی ایک نہایت عبرتناک مثال ہے۔

مکمل طور پر اپنی مشہور کتاب (Decline and Fall of the Roman Empire) میں مملکت روما کے زوال کے اسباب میں مسیحیت کی غلط تعبیر کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور اہل کلیسا پر جانبا ایا لطف طعنے لگائے کہ بہت سے مذہبی راہنما اور مؤرخین مکمل طور پر غلط رہے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

اس بارے میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے کہ مسیحیت (یا اس کی غلط تعبیر) کا عروج کس حد تک مملکت روما کے زوال کا سبب ہوا لیکن اس کی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں مملکت روما کے زوال کے بعد ایک ہزار سال تک یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا رہا اور اس تاریک دور میں مسیحیت کو آہستہ آہستہ اندرون عروج حاصل ہوا کہ پندرہویں صدی یا اس کے آس پاس پاپائے روم یورپ میں سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا اور یورپ کے بادشاہ ہر اہم مسئلے پر اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔ پاپائے روم کے اقتدار اعلیٰ سے اہل کلیسا نے زرگری میں خوب فائدہ اٹھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر عالمگیر مذہب کی طرح مسیحیت کے مبلغین اور دیگر اہل مذہب نے انسان کو بڑی تعداد میں افراد کی حقیقت کو اپنے عقل و فہم، منکر المذہب، وہ رعب و تہمت اور خلوس کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کے لوگ تھے۔ انہوں نے نہ صرف انجیل مقدس کی تبلیغ کے ذریعے مملکت روما کے بت پرستوں کو خدا کی واحدانیت کی طرف دعوت دی بلکہ خود اپنی سادہ اور مقدس زندگی سے ایسی مثالیں پیش کیں کہ روما کی جاہل اور قدامت پرست قوم

مذہب میں ملتی تھی اور نہ خود رومن مفکرین ہی نے اس تصور کو تقویت دی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قانون یعنی عہد نامہ موسیٰ (توریت) میں آخرت کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ قدیم بیزر شہنشاہوں کے دور میں اہل ظلم میں بھی موت کے بعد زندگی کا تصور نہیں ملتا تھا۔ اب صورتحال یہ بھی ہے اور بعض اوقات انسانی ذہن سے تنگ آ جاتے تھے تو انہیں قدم قدم پر یونانی فلسفیوں کے ان اقوال جانے کر ذرا سکون ملتا تھا جن میں اس زندگی سے چھٹکارا پانے کے بعد ایک دوسری زندگی کے امکان کا اشارہ کیا گیا تھا چنانچہ اہل یورپ دنگن لکھتا ہے:

”بھولے عوام کو ایک روحانی مسرت کی بشارت دینا یہ کافی نہ ہوتا کیونکہ اس قسم کی مسرت ان لوگوں کے لیے ناقابل فہم ہوتی جو جسمانی خواہشات بھی رکھتے تھے۔“

ارباب کلیسا میں سے بیشتر کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ اہل روما موسیقی مذہب اختیار کر کے رہبانیت کی طرف مائل ہو گئے۔ جب انہیں یہ یاد کرایا گیا کہ اصل زندگی تو موت یا تلخوار مسیح موعود کے بعد شروع ہوگی تو ان کی توفیق موجودہ زندگی سے ہٹ کر آخرت یا عاقبت پر مرکوز ہو گئی۔ وہ روزمرہ زندگی میں کامل اور بے غم نہ رہ سکے۔ انہوں نے دوسری دنیا میں مسرت حاصل کرنے کے لیے اس دنیا کو اپنے ہاتھ دیا لیکن بنا لیا۔ انہوں نے خدا کی عبادت کو یاد رکھا لیکن انسانیت کی خدمت کو بھول گئے یا اسلام کی اصطلاح میں حقوق اللہ کی طرف توجہ کی اور حقوق العباد کو فراموش کر دیا۔ اس طرح ایک پوری قوم آہستہ آہستہ ناکارہ ہو گئی۔

تاریخ کے سیر حاصل تجربے کے باوجود یقین سے کہنا مشکل ہے کہ کسی قوم کے عروج و زوال کے

مسیحیت کی طرف مائل ہوئی۔ اس ضمن میں ارباب کلیسا نے مملکت روما میں تقریباً وہی کردار ادا کیا جو صوفیائے کرام نے ہندوستان میں اسلام کو مقبول بنانے میں ادا کیا تھا۔

لیکن بعض اہل کلیسا کی تعلیمات کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اس میں مذہب و تقویٰ کی دعوت سے زیادہ ایک قسم کے لالچ کی ترغیب کا عنصر زیادہ تھا یعنی لوگوں کو یہ بتا دیا جاتا تھا کہ مسیحیت قبول کرنے سے ان کی بہت سی ایسی خواہشات بھی پوری ہوں گی جن سے وہ محروم تھے اور یہ خواہشات اس دنیا میں نہیں تو دوسری دنیا یعنی آخرت میں ضرور پوری ہوں گی۔ اس طرح حیات بعد ممات یا آخرت کا تصور ایک نئے انداز سے ابھرا۔ میں نے ”نئے انداز“ سے اس لیے کہا کہ موت کے بعد ایک اور زندگی کا تصور کسی نہ کسی شکل میں انسان کے ذہن میں صدیوں پہلے موجود تھا۔ ہندوستان میں آواگون کا نظریہ صدیوں سے موجود تھا۔ یونانی فلسفیوں نے بھی موت کے بعد زندگی کے امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مابعد الطبیعیات کی روشنی میں اس کا جواز اس طرح پیش کیا جاتا تھا کہ روح اور جسم علیحدہ علیحدہ یا جوہر (Substances) ہیں۔ موت سے جسم تو بے حس و حرکت ہو کر مردہ ہو جاتا ہے، روح نکل جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جسم کو تو مردے ہوئے سب دیکھتے ہیں، روح کی موت کس نے دیکھی ہے ممکن ہے روح مرنے کے بعد زندہ رہے ہو اور پھر دوسری زندگی اختیار کر لیتی ہو۔

موت کے بعد زندگی کے بارے میں قدم ہندوؤں کے تصورات نظریہ آواگون کی شکل میں اور یونانی فلسفیوں کے افکار روح کی ازلی اور ابدی حیات کے بارے میں موجود تھے اور اہل روما میں مقبول بھی تھے لیکن ان کی مزید تائید نہ یہودی

(وَسِعَتِ اللّٰهُ خَالُكَ كَالْمِلِّي فِي يَوْمِ اَرْدُوؤَاتِ
کام ختم کنی ۲۰۱۱ء)

☆☆☆

ایفل ٹاور

۱۹۸۰ء میں پیرس میں ایک عظیم الشان نمائش ہوئی۔ میں نے اس کی دھوم دھام کا حال پڑھا تھا اور مجھے پیرس دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس وقت پیرس ہو آؤں تو ایک پندرہ دو کاج کا مضمون ہو گا۔ نمائش کی ایک خاص کشش ایفل مینار تھا جو خاص لوہے کا اور ایک ہزار فٹ بلند تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے علاوہ اور بہت سی دلچسپ چیزیں بھی تھیں لیکن یہ مینار سب سے بڑھ کر تھا کیونکہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا اونچا مینار قائم نہیں رہ سکتا۔

میں نے پیرس کے نباتاتی ریسٹوران کا نام سنا تھا۔ میں نے وہاں ایک کمرہ لے لیا اور سات دن ٹھہرا۔ میں نے پیرس کا سفر اور وہاں کی سیر دونوں میں بہت کم خرچ میں کام چلایا۔ میں شہر کا ایک نقشہ اور نمائش کی گائیڈ لے کر پیدل پھرا کرتا تھا۔ ان کے ذریعے سے انسان تمام بڑی سڑکوں پر اور خاص دلچسپ جگہوں پر جا سکتا تھا۔

مجھے نمائش کے متعلق سوائے اس کے کچھ یاد نہیں کہ بڑی عظیم الشان تھی اور وہاں مختلف قسم کی دلچسپ چیزیں تھیں۔ ایفل ٹاور مجھے اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں دو تین بار اس پر چڑھا تھا۔ پہلی منزل پر ایک ریسٹوران تھا اور صرف یہ کہنے کے لیے کہ میں نے اتنی بلندی پر کھانا کھایا ہے، میں نے سات شنگ دوپہر کے کھانے پر ضائع کئے۔

پیرس کے پرانے گرجے مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان کی رفعت اور شوکت اور ان کا سکون جس نے وہ دیکھا ہے وہ بھول نہیں سکتا۔ نوردام کی حیرت انگیز

عمارت اور سنگ تراشی کے خوبصورت نمونے جن سے اس کی اندرونی آرائش کی گئی ہے ان چیزوں کی تصویریں دل سے نہیں مٹ سکتی۔ مجھے اس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے کروڑوں خرچ کر کے یہ گرجے بنوائے ہیں ان کے دل میں یقیناً خدا کی محبت ہوئی۔

میں نے پیرس کی تراش خراش اور وہاں کے لہو و لعب کے بہت سے قصے پڑھے تھے۔ یہ چیزیں ہر سڑک پر نظر آتی تھیں لیکن گرجے ان مناظر سے الگ تھلک دوسری ہی شان سے کھڑے تھے۔ جہاں انسان ان میں سے کسی گرجے میں داخل ہوا وہ بھول جاتا تھا کہ باہر اتنا شور و شغب ہے۔ اس کا انداز بدل جاتا اور جب وہ کسی شخص کے پاس سے گزرتا تھا جو کوٹاری کے بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا ہو تو اس کی نقل و حرکت سنجیدگی اور عقیدت سے معمور ہو جاتی تھی۔ مجھے جو احساس اس وقت تھا وہ اب اور گہرا ہوتا جاتا ہے کہ یہ تعظیم اور عبادت محض ضعیف الاعتقاد ہی نہیں اس کی اور یہ لوگ جو کوٹاری بت کے آگے گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے محض سنگ مرمر کی پرستش نہیں کر رہے تھے ان کے دل میں بھی عقیدت کا جوش تھا اور وہ پتھر کو نہیں بلکہ ذات الہی کو پوجتے تھے جن کا جلوہ انہیں اس میں نظر آتا تھا۔ مجھے یہ خیال کہ اس پرستش سے وہ خدا کی عظمت و جلال کو گھٹا نہیں رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔

میں چند الفاظ ایفل مینار کے متعلق بھی کہوں گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اب اس سے کیا کام لیا جاتا ہے مگر اس زمانے میں اس کی تعریف بھی بہت کی جاتی تھی اور مذمت بھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کی مذمت کرنے والوں میں نالسانی پیش پیش تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایفل کا دور انسان کی دانشمندی کی نہیں بلکہ اس کی حماقت کی یادگار ہے۔ وہ تبرا کو کو دنیا کا سب سے

مرکزی موضوع سخن، مرنے والے کی ذات گرامی ہی ہوتی ہے۔

بات ہو رہی تھی ذوق نمودی۔ اب کچھ لوگوں میں نمود و نال کی خواہش اتنی شدید ہوئی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں محض ایک تقریب سے مطمئن نہیں ہو پاتے بلکہ بار بار لگا ہوں کا مرکز بننا چاہتے ہیں۔ شریعت نے ایسے افراد کے لیے چار مواعظ کی تفصیل رکھی ہے لیکن عدل کی شرط کے ساتھ۔ جب عدل کو بھی جنگ و جدل کا سامنا ہو تو سہل ترین نسخہ یہ ہے کہ انسان ایک کتاب لکھے یا (لکھوائے) اور اس کی تقریب رونمائی کی اس کتاب میں خود اپنی کا اہتمام کرے۔ بعض لوگوں کے ہاں کتاب کی اشاعت سے زیادہ تقریب رونمائی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب کی اشاعت مؤخر اور تقریب رونمائی مقدم ہو جاتی ہے۔ آپ میں سے جن خواتین و حضرات کو تقریب کا ملکہ حاصل ہے اگر ان سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ کسی کتاب کو دیکھتے بغیر اس پر تقریر کریں تو وہ کیا کہیں گے؟

ان کو نگاہ آنکھوں کو ایک ایسی ہی تقریب دیکھنے کی سعادت حاصل ہے۔ تقریب مری کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہونا تھی۔ ہم مری سے کچھ دور کالج آف آرٹس ایجوکیشن میں تعینات تھے۔ بہت دن پہلے سے یہ حال تھا کہ جب بھی مری آتا ہوتا، مصنف مال روڈ پر چھل قدمی کرتے ملتے اور یاد کروائے کہ تقریب رونمائی طلاق دن ہو رہی ہے، ضرور تعریف لائے گا۔ موسم گرما میں مال روڈ پر خاصی چٹل چھل رہتی ہے۔ مصنف نے مان جانے کتنے ہزار افراد کو شرکت کی دعوت دی ہوگی۔ ان کی محنت رنگ لائی۔ وقت مقررہ پر ہم مری پہنچے تو ٹاؤن ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ صدارت ایک دفاتی وزیر نے کرنا تھی اور آزاد کشمیر کی ایک اہم شخصیت

پیر و زگاری بڑھتی ہے اور لوگوں کی قوت خرید میں کمی ہوتی ہے۔ (ڈاکٹر نسیم)

☆☆☆

تقریب رونمائی

میرے مشاہدے اور تجربے کی حد تک قلم کاروں کے اعزاز میں تقریبات صرف دو صورتوں میں منعقد ہوتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ قلم کار صاحب حیثیت ہو اور دوسری صورت یہ کہ وہ انتقال فرما جائے۔ صاحب حیثیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا بااثر ہو کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب یا دیوان کے بارے میں دو چار ایسی ادیب نمائندگی فرما رہے ہوں کہ جسے جو سراغ یہ اعلان کریں کہ ایسی کتاب اس سے پہلے دنیا سے ادب میں نمودار نہیں ہوئی۔ پھر کسی انجمن کے عہدے یا رشتہ سے مل کر تقریب رونمائی منعقد کرانے اور اتنا صاحب مال ہو کہ وہ ایسی تقریب پر اٹھنے والے اخراجات اپنے دامن ہاتھ سے اس طرح ادا کرے کہ اس کے ہاں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ تقریبات رونمائی زمانہ حال کا چمکا ہے۔ قیام پاکستان کے بہت بعد تک ایسی تقریبات کا سراغ نہیں ملتا۔ دراصل ہر انسان میں خود اپنی کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور ہر ایک کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔

ماحشر سے اس بات کا اہتمام کر رکھا ہے کہ ہر شخص کو کم از کم دو مواعظ ایسے دینے چاہئیں جب وہ کسی تقریب کا مرکزی کردار ہو۔ ایک مواعظ تو انسان کی شادی کی ہوتا ہے جب وہ بات کا دولہا ہوتا ہے اور دوسرا..... جس اب کا جنازہ اٹھتا ہے یعنی ایک مرنے سے پہلے، دوسرا مرنے کے بعد انتقال پر ملال کے بعد جو ”تقریبات“ ہوتی ہیں ان میں بھی

سندھ، سحر، پہاڑ اور وہ تمام مسکراہٹیں جو ہر روز دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ احساس ملکیت جو مادر وطن ہمیں عطا کرتی ہے۔ یہ احساس کہ ہم سب یکساں ہیں اور خاندانی روایات، عقیم تہذیب، قابل فخر شہادت، رومانی بارشوں کے موسم، بحر انجیر، سورج، قوس قزح، گلشن برف باریاں، خوبصورت جنگلیں، روٹ کوٹائی، عطا کرتی بہار کی ہوائیں، رنگ رنگے پرندے، نفروں میں رنگ بھرتی تھلیاں، یہ سب چیزیں ہمیں سب کو اپنا سمجھنے اور سب سے محبت کرنے کی طرف مائل کرتی ہیں۔

”سورے سورے“ عذیر نامی کے کالم (جنگ ملتان سے اقتباس)

☆☆☆

ایسی عیاشی

آج پاکستان میں مسئلہ ہو نہ ہو لیکن کوئی بھی مڑک پر ناز جلا سکتا ہے۔ دھڑا دے سکتا ہے۔ سرکاری احاک پر پتھر اڑا کر سکتا ہے۔ ریلی نکال سکتا ہے اور پیٹے پر کھڑے ہو کر جہاں چاہے تقریر کر سکتا ہے۔

ذرا سرکاری حکام کی تحریری اجازت کے بغیر ایسی عیاشی منانا، ہونا، ہونی، بیچنا، مانگو، انک آباد یا صفحہ مخبرہ میں تو فرمائیے۔ کھال میں بھوسہ نہ بھرا دیا جائے تو بات یہ کیا ہے؟

(لی بی ڈاٹ کام سے اقتباس)

☆☆☆

ٹیکنالوجی

امریکی معیشت بنیادی طور پر ٹیکنالوجی میں تیز ترین ترقی کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوئی ہے کیونکہ پچھلے ادوار میں جدید ترین مشینری کے زیادہ سے زیادہ استعمال کی وجہ سے لیبر (Labour) کی ضرورت باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے

بڑا نشہ بھگتا تھا کیونکہ تباہی پہنچنے والوں سے اس کے نزدیک ایسے جرم سزد ہوتے ہیں جن کے ارتکاب کی شریعت کو بھی جرأت نہیں ہوتی۔ شراب تو انسان کو باطل و پلاندہ کر دیتی ہے مگر تباہی سے اس کا تھکیل دھنلا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ خیال پلاؤ پلانے اور پارہ ہوا عمارتیں بنانے لگتا ہے۔ اہل ینار اس کے خیال میں ایسا ہی عقلی کرنا ہے جو انسان تباہی کے نشے میں گر کھتا ہے۔ اس سے ینار میں آرت کی کوئی خرابی نہیں۔ اس سے فرائض کی خوبصورتی میں کوئی مدد نہیں ملے۔ لوگ اسے جوق در جوق دیکھنے کو آتے تھے اور اس پر چڑھتے تھے کیونکہ وہ ایک نئی چیز تھی اور اونچائی میں بیٹنیکر۔ یہ فرائض کا ٹکھلنا تھا۔ جب تک ہم سب بچپن سے ہم ٹکھلوں کو دیکھ کر پھل جاتے ہیں اور یہ ینار اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم سب بچے ہیں اور دکھاوے کی چیزوں پر جان دیتے ہیں۔ یہی اہل ینار کا مقصد تھا جا سکتا ہے۔

”آپ بچی۔ تلاش حق“ ہما تھا کا ندھی سے اقتباس

☆☆☆

قابل فخر شناخت

بہیش مادر وطن سے پیار کر جتنا کر سکو کیونکہ مادر وطن ہماری تمام ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے۔ فدا، محبت، پیار، سہمہ، ہمدردی، نڈکیوں میں رنگینیاں، ہمارے بچوں کے لیے تفریح، کھلونوں میں ڈالتے، دلوں کو بھانسنے والا حسن، اچھے دوست، خوبصورت نظارے، جنہیں ہم ہر طرف دیکھ سکتے ہیں۔ گھومنے کے لیے ایسی بے شمار جگہیں جہاں ہم جسمانی حلائی دینے بغیر جا سکتے ہیں۔ وہ عزت جو ہمیں ملتی ہے اور ہر زلزلہ کی دھمکیوں میں ہمیں نصیب ہوتی ہیں۔ اپنے پیادوں کی ایک خواہشات، خوبصورت کھلونوں اور کھلونوں سے بھرے بیڑ، مہسوں کی بدلتی ہوئی ہوائیں، ہرے بھرے میدان،

مہمان خصوصی تھی۔ اب یہ معلوم نہیں کہ سامعین سے مجھے ہونے ہال میں ادب کے شیدائی کتنے تھے اور وفاقی وزیر اور دیر کشیر کی شخصیت سے درخواستوں پر دستخطوں کے طالب کتنے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہاؤن ہال سامعین سے کچھ بچا ہوا تھا لیکن مصنف بڑی بے قراری کے عالم میں جزل پوسٹ آفس کے سامنے ٹہل رہے تھے۔ جب کافی دیر تک تقریب شروع نہ ہوئی تو ہم صورتحال جاننے کے لیے پیچھے آئے اور ان سے ان کے اضطراب کا سبب پوچھا۔ انہوں نے سرگرم نظر دوڑاتے ہوئے کہا: ”پلاشر نے وعدہ کیا تھا کہ وقت پر کتابیں لے کر پہنچ جائیں گے۔“

اب تک ہال میں آگے جانے کا ارادہ دل تھے کہ پلاشر کے وعدے پر اعتبار کر بیٹھے یا تقریب روٹائی کا شوق ان کے ہال فردواں تھا۔

اب ہوا یہ کہ صاحب صدر بھی تشریف لے آئے۔ مہمان خصوصی بھی پہنچ گئے۔ سامعین بھی موجود تھے اور مقررین بھی زور خطبات دکھانے کے لیے بے چین۔ گویا سارے لوازمات پورے تھے اب محض ایک چھوٹی سی کتاب نہ ہونے سے تو تقریب روٹائی رک نہیں سکتی تھی۔ ہم جمہور ہو کر ان مقررین کو سن رہے تھے جو کتاب پڑھے بغیر نہیں، دیکھے بغیر ہی فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ اس سے پہلے یہ تو دیکھا اور سنا تھا کہ لوگ کتاب کا دیباچہ یا فلیپ پڑھ کر ہی کتاب پر تبصرہ لکھ مارتے ہیں لیکن کتاب دیکھے بغیر اس پر اپنی خاصی تقریر کر ڈالنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اب یقیناً یہ جانتا چاہیں گے کہ آخر مقررین کہہ کیا رہے تھے۔

ملاحظہ فرمائیے ایک تقریر سے اقتباس:

”معزز سامعین! اگرچہ میں نے کتاب نہیں

آپ جانے واردات سے فرار کیوں ہو گئے تھے۔ بس آپ گئے ہیں تو ہال بھر گیا اور اتنی زبردست تقریریں ہوئیں کہ..... اس دن کے بعد سے ادبی تقریبات میں جانا ہم نے اور بھی کم کر دیا ہے۔ ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ منتظنین کو پتہ چل گیا کہ اصل سامعین ہمارے جانے کے بعد آئیں گے تو کہیں وہ ہمیں اٹھائی نہ دیں۔

تو سامعین کرام! بات یہاں سے چلی تھی کہ میں اس تقریب کے منتظنین کا قطعاً شکر گزار رہیں ہوں۔ اس لیے کہ ایک انجمن ہے جو دور نہیں ہو پا رہی۔ میں نے کہا کہ فلکاروں کے اعزاز میں تقریب صرف دو ہی صورتوں میں منعقد ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ مصنف صاحب حیثیت ہو اور دوسری صورت یہ کہ فلکار اقبال فرما جائے۔ بحیثیت قوم ہمارا دایرہ بھی ہے کہ کتنے فلکاروں کی قدر میں ان کے مرنے کے بعد ہی آتی ہے۔ زندگی میں ہم ان کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں آپ خود اس کے گواہ ہیں۔ بھول جائیے

☆ ☆ ☆

حسرت کی زندگی

مولانا حسرت موہانی کی زندگی روایتاً بلکہ قلندرانہ تھی۔ وہ فقر و استغنی کی زندہ تصویر تھے۔ دنیاوی لحاظ سے وہ بڑی مختصر تنہا نہیں رکھے والے انسان تھے۔ انہوں نے اپنا خرچ اتنا محدود کر رکھا تھا کہ صرف پانچ روپے ماہوار میں اپنا کام چلا لیتے تھے۔

حسرت نے روپے پیسے کی بھی پروا نہیں کی بلکہ

اس سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

”اردو ہی انج ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علی گڑھ تحریف لائے تھے..... سفر خرچ کا کل قادم دستخط کے لیے پیش کیا گیا کہ تو بولے کہ یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیا میں تو خرچہ کلاس میں سفر کرتا ہوں اور دراصل میں دہلی جا رہا ہوں۔ پروگرام ایسا دکھا تھا کہ یہاں آتر پڑوں اور امتحان لے کر آگے بڑھ جاؤں۔ پھر کرایہ کیا اور غمخیز لے کر الاؤنس کیوں؟ طعام و قیام تو آپ کے ہاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے مزے کی رو دو قدر ہوئی رہی اور علی گڑھ سے اپنی آلفت کا اظہار کرتے رہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ لکھنؤ ریڈیو میٹین پر پیش آیا۔ ایک پروگرام کے خاتمے پر حسرت نے ریڈیو والوں کے شدید اصرار پر صرف تین آنے پیسے لینے منظور کئے اور باقی رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اتنی بڑی رقم لے کر ہم کیا کریں گے؟“

حالانکہ اس پروگرام کے لیے وہ کان پور سے آئے تھے لیکن انہوں نے کہا کہ میں مکرے کان پور شیشین تک پیدل آیا ہوں۔ ریل میں خفیہ پولیس والوں کی بدولت برف کے ڈبے میں مفت سفر کیا ہے۔ لکھنؤ شیشین سے ریڈیو میٹین تک سرکاری موٹر میں آیا ہوں۔ یہی موٹر شیشین تک لے جائے گی پھر روپے کس کام کے لوں۔ ایسا ہی اصرار ہے تو اعتقاداً واپسی سفر کے لیے لکھنؤ سے کان پور تک تیسرے درجے کا کرایہ تین آنے دو روپے۔

دستور ساز آکسلی اور پارلیمنٹ کی رکنیت کے زمانے میں بھی حسرت کے انداز روایتاً میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب دوسرے ممبران شاندار ہوٹلوں اور بنگلوں میں ٹھہرتے تھے، وہ دیکر ٹریٹ کے کنارے ایک قدیم مسجد کے حجرے میں قیام فرماتے تھے یا گل

کین سلازار کا کہنا ہے ”دوسال قبل جب ہم نے سیاحوں کو مجھے سے اوپر جانے کی اجازت دی تو ہم نے تنہیہ کی تھی کہ ہم جس کے اندرون کو سیاحوں کے لیے زیادہ محفوظ اور پر آرام بنائیں گے اور آج جب ہم یہ مجسمہ بند کر رہے ہیں تو ہم اس انیسویں صدی کی سہولیات کو اکیسویں صدی کی سطح پر لائیں گے۔“

(بی بی ڈاٹ کام پر رپورٹ)

☆☆☆

ایک دن عید اور ایک دن روزہ

ترچی قوم کی ایک آدھ خوشی کو بھی چند لوگ غارت کر دیں تو اس کا ذکر کئے بغیر کیسے خاموش رہا جاسکتا ہے۔ ہمارا گھرانہ الگ کے آر پار تقسیم ہے۔ والدہ اور چھوٹے بھائی اپنے بچوں سمیت میرے ساتھ اسلام آباد میں مقیم ہیں۔ بڑے بھائی، ننہیں، چچا، ماموں وغیرہ سب مردان، نوشہرہ اور کھنڈ انجنی میں رہائش پذیر ہیں۔ مقامی مولویوں کے حکم پر ہر سال وہ ہم سے ایک دن پہلے روزہ رکھتے اور عید مناتے ہیں۔ عید سے قبل کے دو روز میرے بٹاور میں گزرنے اور مزید ایک روز ٹھہرنے کا ارادہ تھا لیکن رات کو وہاں چاند دیکھنے کی مہینہ شہادتیں موصول ہوئیں اور مجھے قاسم علی خاں نے اگلے روز عید منانے کا اعلان کیا تو میں اپنے روزے کو بچانے کے لیے رات گئے واپس اسلام آباد آ گیا۔ یوں جس دن میرے گئے بھائی بہنوں کی عید تھی، اسی دن میرا، میری والدہ کا، الہیہ کا اور یہاں پر مقیم بھائی اور بھائی کا روزہ تھا۔ یہ صرف میرا معاملہ نہیں اسی طرح کے ہزاروں گھرانے ہر عید پر اسی انجمن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس ملک کے چند مولوی اور بالخصوص دو مفتی صاحبان ہر سال ہماری عید کی خوشی کا بکری حشر کر دیتے ہیں۔ پشاور، چارسدہ اور مردان کے بعض مولوی صاحبان نے ہر سال چاند ایک روز قبل دیکھنے کی جگہ مرکزی روت ہلال کھینچی نے ان کی

قاسم جان میں دتھ ”الابان“ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے مجھے روپے پوے بہتہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس پر احتجاج کیا تھا کہ ممبروں کے لیے اتنی بڑی رقم پوے بہتہ لینا ہندوستان کے غریب اور فاقہ کش عوام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔“ (حضرت موبائی، ڈاکٹر اسد احمد لاری کی کتاب سے اقتباس)

☆☆☆

مجسمہ آزادی ایک سال کے لیے بند

نیویارک کا مشہور لینڈ مارک شیو آف لبرٹی (مجسمہ آزادی) کو مرمت کے لیے ایک سال کے لیے بند کیا جا رہا ہے۔ امریکہ کے وزیر داخلہ کین سلازار کا کہنا ہے کہ 305 فٹ بلند تانبے کے اس مجسمے کی مرمت پر ساڑھے ستائیس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔

نیشنل پارک سروس کا کہنا ہے کہ اس 125 سالہ پرانے مجسمے میں نئی لفٹ اور نئی بیڑھیاں لگائی جائیں گی تاہم اس کی مرمت کے دوران لبرٹی آئی لینڈ عوام کے لیے کھلا رہے گا۔

اس مجسمے کو 1886ء میں فرانس نے امریکہ کو تحفے میں دیا تھا۔ ہر سال لبرٹی آئی لینڈ پر ہتھتیس لاکھ لوگ آتے ہیں تاہم مجسمے کے اوپر جانا ممنوع ہے۔

تجربہ گیارہ کے حملے کے بعد کچھ سال تک سکیورٹی وجوہات کے باعث سیاح مجسمے کے اوپر نہیں جاسکتے تھے تاہم 2001ء کے کچھ سال بعد سیاحوں کو اندر و بیڑی پر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ حکام کے مطابق مجسمے میں پرانی سہولیات سیاحوں کے لیے نہیں بلکہ مجسمے ہی کے لیے خطرناک ہیں۔



سید وقار عظیم جعفری

لیبیہ

شہل افریقہ کا ایک اسلامی ملک

قریبی لوگ بھی اختلاف کرتے تو معلوم ہونے کی صورت میں سخت مزاحمتیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ کرنل عمر القذافی نے کہا، بے ایمانی، ناانسانی اور عوام دشمنی کو بڑے اٹھاؤ دیا لیکن لوگ دے دے اور خوفزدہ صورت میں جہاں موقع ملتا اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ آخر کار ملک کے اندر یہ لاوا بھی پکڑا رہا۔

لیبیہ کی تاریخ اور موجودہ حالات کے حوالے سے تحقیقاتی مضمون

تھی لیکن انسانوں نے انسانیت کو قتل و غارت، غلامی اور کشت و خون، بھوک اور افلاس دی۔ یہ کون تھے اور کیا تھے؟ یہ سب طاقتور تھے؟ یہاں سے ہی تاریخ انسانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر انسانیت نے اپنے آپ کو تبدیل نہ کیا تو شاید یوم قیامت سے پہلے بھی ان پر قیامت آجائے گی۔ اسی طرح انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن بڑی طاقتوں نے اس کو غلام بنا لیا۔ اس سلسلے میں بہتے ہوئے پہلی جنگ عظیم اور دوسری

دunia میں بڑی طاقتوں، بڑے ملکوں اور بڑے لوگوں نے ہمیشہ اپنے سے کمزور لوگوں پر صدیوں حکومت بھی کی اور صدیوں سے ان پر ظلم و جبر کئے رکھا۔ یہی دنیا کی تاریخ کا سچ ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا تھا اور آج بھی دنیا میں ایسا ہی ہو رہا ہے اور شاید جب تک ملک و قوم اور لوگ کمزور ہوں گے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ خداوند کریم نے تو اپنی پوری زمین انسانوں کے لیے دنیا جہاں کی انھیں سجا کر رکھیں دی

ناعاقبت اندیش حکمران

ہمارے مغل بادشاہوں کے زمانے میں بڑے بڑے محل، مسجدیں، مقبرے تعمیر ہوئے جن کی شان و شوکت کی دنیا محترف ہے لیکن خورجہ سے تو ہوا سا گلہ بھی لے لے۔ کیا ہمارے اس سنہری دور میں کوئی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی؟ یا عوام کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کوئی سکیم مرتب ہوئی؟ کوئی ایسا عالم بھی پیدا ہوا جس کے افکار نے دنیا کو متاثر کیا ہو؟

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہدایت کی کہ لوگوں سے ان کی وقتی سطح کے لحاظ سے گفتگو کرو۔ اسی طرح حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بار بار کہا کہ علوم کے بعض مقامات عام آدمیوں کو نہیں سمجھائے جاسکتے لیکن تاریخ میں ہوا کہ ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے کوشش کی کہ لوگ ان کے غلط یا صحیح احکامات کے مطابق عمل کریں۔ اس میں تو وہ بہت حد تک کامیاب ہو گئے لیکن انھوں نے یہ کوشش بھی کی کہ لوگ ان کے احکامات کے مطابق سوچیں اور فکر کریں۔ اس کے نتائج خطرناک ہو گئے۔ فکر کو جس قدر دیا گیا وہ بے چین ہو کر امبری اور ارشاد کے ساتھ امبری، اہل فکر کو قید کیا، سولی پر چڑھایا گیا لیکن ان کی فکر زندہ رہی کیونکہ فکر کو نہ قید کیا جاسکتا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا جاسکتا ہے۔

”نا تمام“ ہارون الرشید کے کالم سے (ماخوذ)

☆☆☆

چوٹ

عمر رواں کا جہاز چلا جاتا ہے۔ دنیا گزرگاہ عام ہے۔ راگ و رنگ، حسن و جمال، عیش و نشاط کے یہاں محسوس ہیں۔ دیکھنا نہیں ان کے حُزوں میں آ کر کوہ نہ پڑتا ورنہ ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہپٹا لوں تک لے جانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

☆☆☆

شہادت کو قبول نہ کرنے کی قسم کھاتی ہوئی ہے۔ ہم نہیں سمجھتے، مسلکی جنگ ہے، اپنی اپنی دکھناری کا حامل ہے یا پھر ان مخصوص لیام میں لی دی پر آنے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا شوق ہے لیکن بہر حال اب ہم جیسوں کا بنیادہ سر بل پر ہو چکا ہے۔ مرکزی رویت ہلال کیٹی یا پھر خیر پختونخوا کے ان مولوی صاحبان کے پاس مینڈیٹ تھا (مرکزی رویت ہلال کیٹی یا پھر کیٹی کے پاس قانونی اور خیر پختونخوا کے بعض مولویوں کے پاس غیر قانونی کرکمی) اس لیے ہم جیسے خاموش رہے۔ مرکزی رویت ہلال کیٹی کا یہ خیر پختونخوا کے یہ مولوی صاحبان رویت ہلال کا یہ تنازعہ حل نہیں کر سکتے۔ ہم نے ساٹھ سال انتظار کیا لیکن یہ عید ایک کر سکے اور نہ روزے کو۔ اس لیے خدا را ہمیں ان دونوں سے نجات دلا دی جائے۔

سیدھی سی بات ہے اگر پوری عرب دنیا، افغانستان اور یورپ و امریکہ کے مسلمان سعودی عرب کے اعلان کے ساتھ عید منا سکتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو مکہ مدینہ کے ساتھ منسلک کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ جو بڑے قبول نہیں تو پھر مرکزی رویت ہلال کیٹی ختم کر کے مقامی رویت ہلال کیٹیوں پر پابندی عائد کی جائے۔ محکمہ مسیات اور فنی ماہرین سائنسی بنیادوں پر فیصلہ کریں اور وزارت مذہبی امور اس کا اعلان کرے۔ ہمیں نہ خیر پختونخوا کے ان مولوی صاحبان سے کسی خبر کی توقع ہے اور نہ مرکزی رویت ہلال کیٹی سے۔ ان دونوں نے ہمارے روزے اور عید کو بے مزہ کرنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا۔ اب کوئی تیسرا آئے اور ہمارے روزے اور عید کا فیصلہ کرے۔ ہمیں ایک دن عید اور ایک دن روزہ چاہیے۔ وہ کوئی بھی کسی بھی طریقے سے لے آئے۔

”جرم“ سلیم صافی کے کالم سے (انتہاس)

☆☆☆

جنگ عظیم پر یا ہوئی۔ دونوں ہی غلام بنانے کے لیے لڑی گئیں۔ آخر جنگی کچی قوتیں دوسری جنگ عظیم تک مکمل غلامی اور تسلط پر مبنی پروگرام پر اصرار نہیں کی۔ اسی تناہی و برابری کے منظر نامے میں میں امریکہ و یورپ کی جاتی، براعظم ایشیا اور عرب و افریقہ کو صدیوں بعد آزادی نصیب ہوئی۔ یعنی تاریخ کے جبر کے بعد حوصلہ مند قوموں کو آزادی ملی اور پھر کچھ قوموں پر معلوم نہیں کس اور کی پسندیدگی پر قدرت کا دنیا کا سب سے بڑا سونے کی مٹی کا سیال تیل نکل آیا جو کہ پوری دنیا کی موجودہ ضرورت ہے جس کے بغیر نہایت موجودہ وقت میں زندگی اور نہ ہی گاڑی اور نہ ہی ایجاد کردہ کئی مشینری کا پھیل پھیل سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں آج ایک نوآبادی مملکت جو کہ یکم ستمبر 69ء میں چند فوجی افسران نے (جو کہ چھوٹے بڑے رینک کے تھے) اپنے عوام اور ملک کی غربت اور افلاس کو دیکھ کر انقلاب برپا کیا اور صدیوں سے قائم کردہ خلائی کا نشان (king system) بادشاہی نظام توڑ دیا اور اقتدار استعماریہ لیا۔ یہ معنوں میں براعظم شمالی افریقہ کے ایک ملک لیبیا کا ہے اور وہاں انقلاب کا بانی ایک چھوٹی سی عمر کا ایک نوجوان ”محمد ممحر“ جو کہ اس وقت میجر کے عہدے کا افسر تھا اور جس کے خاندان بدوش قبیلے کا نام ”الفتناتی“ تھا اس نے اپنے تین چار دوستوں میجر عبدالسلام (چالو) اور میجر محمد مسعود اور دیگر سے مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار استعماریہ لیا اور بادشاہی نظام کے اختتام کا اعلان کر دیا اور سامراجی تسلط رکھنے والے ملکوں کی افواج اور لوگوں کو اپنے ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ لیبیا میں انقلاب سے پہلے ترکی اور اٹلی نے باری باری حکومت کی اور استعماری قوتوں نے اس کو اپنا غلام بناتے رکھا۔ بعد ازاں قبائلی لیڈر اسلام اور ملک کی

محبت سے سرشار اور ایک مرد عظیم عمر بخار نے غیر ملکی قوتوں سے جنگ لڑی جو کہ ایک کو بیلا جنگ تھی اور اس جنگ میں شہادت پائی عمر بخار لیبیا کے عوام کے سب سے بڑے ہیرو تھے اور بعد ازاں استعماری قوتوں کی سازش سے شاہ ادریس کو حکومت پر بٹھایا گیا اور اپنے مقاصد حاصل کئے گئے۔ بعد ازاں یکم ستمبر 69ء کو کچھ فوجی افسران (جو کہ جوان تھے) نے لیبیا میں انقلاب برپا کیا اور حکومت استعماریہ لیا اور ملک کو نئے اور جوان جذبے سے ترقی دینا شروع کیا اور گھڑانہ حالات میں موجودہ حالات میں اس وقت گو کہ صرف 42 سال بعد تازہ مدھ ہو گیا ہے پھر بھی مخالفت اور حماقت کے باوجود غیر جانبدارانہ سوچ کے مطابق لیبیا کے عوام کی قسمت کی تبدیلی اور تعمیر اور ترقی فوجی انقلاب کے بعد ہی ہوئی۔ لیبیا جو کہ رقبے کے لحاظ سے ایک بڑا ملک اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا افریقی ملک ہے جس میں اس وقت تقریباً ساڑھے 6 ملین آبادی موجود ہے۔ پاکستان سے بڑا رقبے کے لحاظ سے اور آبادی کے لحاظ سے آدھے لاہور کے برابر ہے۔ لوگوں کی زبان عربی ہے اور دوسری زبانیں اٹالین اور ترکی بھی بولی جاتی ہیں۔ تیل برآمد کرنے والے بڑے ملکوں میں یہ ملک افریقہ اور عرب میں اٹلی خالی غائب نہیں رکھتا ہے۔ اس کی پوری ایک تہی بلکہ آدھے سے زیادہ ملک کے شہر مسند کے کنارے آباد ہیں۔ دوسرا حصہ صحرائوں، ریتوں اور پہاڑوں کا ہے۔ قدرت بھی اس ملک کی خوبصورتی اور کافی مہربان ہے۔ کچھ گرم علاقے ہیں اور کچھ سرد پہاڑوں اور مسند کی وجہ سے یہاں کی آب و ہوا نہایت مناسب اور صحت مند ہے۔ دارالحکومت، صوبہ، شہر طرابلس (خریبی) میں بائبل اٹالین اور ترکی رکن تھن اور پرانی تعمیر و ترقی ہے۔ لوگ زیادہ جدت پسند اور پڑھے لکھے نہیں۔ یہ مسند کے

چڑ نہیں ہے۔ سہا کے لوگ مجموعی طور پر سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں لیکن اب ان دونوں صوبوں کے لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ تو تمام صورتحال وہاں کے لوگوں کی زندگی گزارنے کے طریقے کی ہے۔ اب معنوں کی طرف آتے ہیں۔ سابقہ کرنل فتاحی کے دور حکومت میں کیا کریٹھ ہے اور کیا ڈس کریٹھ ہے۔ قائدین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے تقریباً ایک دہائی تک دونوں طرف کی تصویر پیش کرنا ضروری ہے کہ کرنل معمر فتاحی ایک سخت ترین حاکم تھے، اس کا نظام حکومت ایک ظالمانہ جبراً اور تھا، مخالفین پر از حد جبر کیا گیا، سیاسی سوچ کو بالکل ختم کر دیا گیا حالانکہ انقلاب سے پہلے بھی بہت سے لوگ حکومت سے الگ تھلگ اپنی خانہ بدوش زندگی اور عیش و عشرت، توجہ خاندان کی زندگی میں مست تھے اور غربت بھی کبھی کبھیں لوگوں میں عیش کر لیا کرتے تھے۔ لیبیا کے لوگوں کے گھروں میں مصری عورتوں سے شادیوں اور رشتہ داریوں کے تانے باندھے خانہ اور شراب کا رواج عام تھا۔ انقلابی حکومت نے افریقیوں سے یہ عیاشی بھی چھین لی جس کی وجہ کرنٹ پڑا اور بے ایمانوں کے محدود طبقے میں قدرتی کے خلاف جذبات ابھر گئے۔ پھر زائد دولت اور کالا دھن بھی چھین لیا گیا۔ اسے ساتھ انقلاب لانے والے کچھ لوگوں پر بخاری یا کسی بھی جرم کو ناقابل عداوت قرار دے کر یا تو قتل کر دیا گیا یا ہمیشہ کے لیے جیل میں بند کر دیا گیا۔ کسی کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس طرح کرنل فتاحی کو اور اس کے حواریوں کو بہت سے میدانوں میں، کیلے جنگ کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اپنے قریبی لوگ بھی بعض اوقات اختلاف کرتے یا بے لفظوں میں کوئی بات کرتے تو معلوم ہونے کی صورت میں سخت سزا دیں دی جاتی تھیں یہاں تک کہ کرنل معمر

کنارے بندرگاہ کے قریب آباد ہیں۔ یہاں ہی حکومت کے ادارے اور فوجی ہیڈ کوارٹر ہے۔ اپنی ہی پر تقریباً 250 کلومیٹر پر کرنل معمر فتاحی کا آبائی علاقہ مصراتہ اور اس کے قریب سیرت ہے۔ شہید ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ کرنل فتاحی کا خاندان بھی دوسرے قریبی ترقی یافتہ علاقے کی طرح ”خانہ بدوش“ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس وقت یہاں کے انجمن غربت تھی بلکہ یہ علاقہ ترقی سے آگے نہ آتا تھا۔ لیکن اب وہ حالات نہیں رہے۔ لیبیا کا دوسرا بڑا صوبہ بن غازی ہے۔ یہ بھی بندرگاہ اور مسند کے کنارے پر واقع ہے۔ دوسرے صوبے کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ کھلا اور کشادہ شہر ہے۔ دارالحکومت طرابلس سے یہاں کی زندگی اور لوگ مختلف ہیں۔ یہاں سے صحرائی طرف نکلنے والے راستے پر اجڑا ہوا کفرہ اور سہا ہے اور پہاڑوں اور مسند کے ساتھ پٹی پر صوبہ بن غازی کے شہر علیحدہ، درت، لبروق اور جبروق کے شہر آباد ہیں۔ یہ سب مسند کے کنارے پر ہیں۔ مسند کی پٹی پر اس صوبہ کا آخری شہر جبروق ہے۔ یہاں کے لوگ سادہ، مہمان نواز اور خوبصورت قد و قامت کے لوگ ہیں اور مسلمانوں سے محبت یہاں کے لوگوں کو روایت میں ہیں۔ اس طرح لیبیا کا تیسرا بڑا صوبہ سہا ہے جو کہ ایک بڑے صحرائی قبیلے ہے۔ اس کے شہروں میں صید، کفرہ، عایت اور دیگر شہر شامل ہیں۔ یہاں کے لوگ اصل افریقی ہیں اور اسی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ حکومت نے ان کے لیے دیگر ترقی یافتہ علاقوں کی طرح انٹرپورٹ، گھر، سڑکیں، ہسپتال، مساجد اور سکول بنوائے ہیں۔ گو کہ یہ تمام علاقہ صحرائے اعظم کہلاتا ہے لیکن اس پر خوبصورت آبادیاں بنا کر جنگل میں منگن بنا دیا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ سادہ اور ایماندار ہیں۔ آخر ذکر دونوں ہی صوبوں کے لوگوں میں دیکھ دیکھ کر ان کی کوئی

دودھ، چینی، کپڑا، چائے وغیرہ لوگوں کو سستے داموں مہیا کیا جاتا اور اس کی فراوانی وغیرہ پر مرکزی نظر رکھی جاتی۔ ان چیزوں کی فراوانی بھی ہوئی اور ریٹ بھی نہ بڑھنے دینے جاتے تھے۔ ساتھ ساتھ تمام کاروبار کو گورنمنٹ کی تحویل میں لے کر ہر شہری کو گورنمنٹ کا ملازم بنایا گیا۔

6- قدانی حکومت نے ہر شہری کو نیا مکان بنا کر دیا اور پرانے اور خستہ حالی مکان چھوڑنے کا حکم دیا۔

7- عوام دشمن قوتوں، ناجائز ذریعے سے دولت حاصل کرنے والوں، امیروں، لٹیروں کو سختی سے پکڑ دیا۔ معمر القذافی کی تحریر کردہ گرین بک کے مطابق ملک میں نظام نافذ کر دیا گیا۔ اس کے فدا آدم پوسٹر پر سے ملک میں لگا دیئے گئے۔

8- ہر محلہ، ہر شہر میں سکول، ہسپتال اور مسجدوں کا جال بچھا دیا گیا۔ تقریباً ملتے جلتے ایک جیسے ڈیزائن سے ان کی تعمیر کی گئی۔

9- کرنل معمر القذافی نے دنیا میں لیبیا کے عوام کو خوشحالی دی اور اپنے ملک اور افریقہ اقوام کی سر بلندی کے لیے بھرپور کام کیا۔ یا سر مرامت سے اختلاف سے پہلے فلسطین کی آزادی کے لیے اس کو بھرپور رقم دیں۔ یہاں تک کہ سادہ چیک دیئے۔

10- لیبیا میں فوجی تربیت لازمی عورت ہو یا مرد کا قانون نافذ کیا۔ انصاف کے لیے قاضی مقرر کئے۔ عدالتوں سے سب کے لیے انصاف کا اصول اور طریقہ بالکل سادہ تھا۔

11- ملک کے تمام عیسائی ڈرائیور صرف ملکی تھے جو کہ حکومت کے تنخواہ دار یا سوامی نظام کیساتھ منسلک تھے اور ساتھ ساتھ فوجی تربیت یافتہ تھے۔ ان کے بھی نوجوان فوجی انتظامیوں سے بھرپور تعاون کی وجہ سے انتظامی حکومت 42 سال تک اقتدار میں رہ

کیا کیونکہ اب اسے طویل مرحلے کے بعد معمر القذافی کے کافی چاہنے والے اس کو چھوڑ چکے تھے۔ اب صرف ایک مخصوص لوگوں کا طبقہ ہی اس کی حمایت میں رہ گیا تھا۔

اس لیے ان سب فورسز کے سامنے اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور موجودہ سپرے ملک پر باقی فوج کا قبضہ ہو گیا ماسوائے سیرت کے۔ پھر سراسر ایک قوتوں اور موجودہ NATO نے بھی باقی فوج کا بھرپور ساتھ دیا۔

جنگ اور انجام

کرنل معمر القذافی اپنی قوم اور اسلامی دنیا کو چگانے کے لیے تقریباً 20 سے 25 سال تک اسرائیل اور یہودی نصابی کو برا بھلا بولتے رہے، بڑی طاقتیں یہ قیام عہد دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھی کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ اسرائیل و یہودی و انصاری کی مخالفت کرنے والا یہ افریقی اسلامی ملک اس طرح ترقی کرتا رہے۔ اس کے لوگ خوشحال ہوں۔ وہ طاقتیں بھی اس ملک کے اور قدانی کے عہد پر گہری نظر رکھتے ہوئے تھیں۔ درمیان میں امریکہ کا حملہ اور قدانی کی جوانی کا رورواں کا واقعہ بھی پیش آیا۔ پھر کرنل معمر القذافی کی بیرون اور اندرون ملک مخالفوں کے ساتھ رو بہ رو پر بھی ان کی نظر پڑی۔ ساتھ ساتھ شمالی افریقہ کے غریب ملکوں کے اس خطے پر تیل کی دولت والا یہ ملک ان طاقتوں کو پہلے بھی کھٹکتا تھا جس کے دوران یہ طاقتیں کبھی اقتصادی پابندی لگائی اور کبھی ہتاتی رہیں۔ اس 25 سال کے طویل عرصہ میں معمر القذافی اور اس کے حواری ڈنے رہے لیکن جب معمر القذافی نے حالات دیکھے اور اپنے آپ کو کونکر دم پایا تو پھر اس نے ان طاقتوں کے ساتھ حالات نرم کرنے کی کوشش کی جس میں تباہ ہونے والے طیارے کا معاملہ بھی ہے اور اس کے معاوضہ والا واقعہ بھی تھا۔ آج جب یہ چھوٹا سا ملک لیبیا باقی

سکی۔ ہر محلہ ہر شہر میں حکومت کی مدد کے لیے کیشیاں تشکیل دی گئیں جو کہ سرکاری ملازمین تھے۔ عوام کی خدمت بھی کرتے تھے۔ ان کا حکم انصاف پر مبنی اپنے علاقے میں چلتا تھا جن کو مقامی زبان میں (طبیبہ الشعیبہ) کہا جاتا تھا۔

12- قدانی حکومت نے ملک میں تعلیم کے لیے سرکاری سکولوں اور کالجوں کا جال بچھا دیا۔ ملک کی 2 بڑی یونیورسٹیوں کو مجھے قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ الفتح یونیورسٹی طرابلس اور القرائیہ یونیورسٹی۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ امن و امان والے اس ملک میں اکثر چند بار چھوٹی موٹی بغاوتیں ہوئیں لیکن القذافی حکومت نے ان پر کنٹرول کر لیا۔ اب میں سفر میں دیکھا جاتا ہے تو شاہ اور سکہ کا ایک سابقہ مراعات یافتہ طبقہ وہاں موجود تھا جو کہ اس سابقہ نظام کے وفادار تھے۔ کچھ موجود تھا کہ سختی اور آمرانہ سسٹم کے مخالف لوگ بھی تھے۔ کرنل القذافی اور ان کے مراعات یافتہ لوگ بھری تھانے بھی رکھتے تھے۔

اس لیے ان سے بھی بہت سی غلطیاں ہوئیں۔ جن میں طاقتیں کو جیلوں میں بند کرنا بھی ہے اور قتل کرنا بھی۔ کچھ بیرون ملک بھاگ گئے۔ کچھ ملک میں رہ گئے۔ ان کی اپنی مخالف حکومت پر بڑی گہری نظر تھی کیونکہ وہ سب اہلیت کلاس اور بڑے ملے جلتے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لوگ اس موقع کی تلاش میں تھے جب معمر القذافی اور اس کے حواریوں کی طاقت اور اعتماد کمزور ہو۔ پھر ان کے بیرون ملک بھی رابطے موجود تھے۔ اس طرح جب معمر القذافی کو جبکہ ابھی وہاں بڑے ہو چکے تھے کی حکومت پر گزرت کر زور ہوئی تو ان قوتوں نے جو خفیہ طور پر اپنی ایک فورس تشکیل دی ہوئی تھی وہ اور باہر کے ملکوں کے لوگ اور قدانی حکومت میں شامل ایک مخصوص طبقہ (جو کہ بڑی تعداد میں ہے) سب نے مل کر قدانی حکومت پر بھرپور وار

القذافی نے کرپشن، بے ایمانی، ناانصافی اور عوام دشمنی کو بڑے اٹھاؤ دیا لیکن لوگ دے دے اور خوفزدہ صورت میں جہاں موقع ملتا اکثر ظلم اور جبر کا ذکر بھی بھی کرتے تھے۔ ملک کے اندر حکومت مخالف جذبات کا یہ لاوا پکڑ رہا۔ 42 سال بعد یہ تمام مخالف قوتیں اکٹھی ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا جس کو تمام دنیا آج دیکھ رہی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے کرنل معمر القذافی کے اقدامات جو کہ عوام کے لیے کئے گئے ان کا ذکر کروں گا:

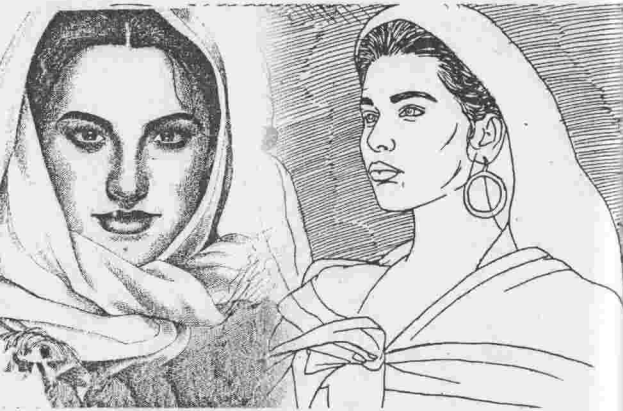
1- کرنل معمر القذافی نے شہنشاہ شاہ اور لیس کی حکومت کا تختہ الٹ کر شہنشاہی نظام جو کہ سامراجی قوتوں کا نافذ کردہ تھا، اسے بڑے اٹھاؤ دیا۔ اس شہنشاہی نظام کی خرابیوں سے اپنی قوم کو محفوظ کیا۔ سکوٹی سسٹم کو سسٹم سے جدا گانہ طرز پر تیار کیا۔

2- ملک کو تیل کی دولت سے مالا مال کیا۔ قومی دولت کو سوشلزم کے اقتصادی جکڑاؤ میں رکھ کر بینک سسٹم کو محفوظ کر دیا۔ کسی غیر ملکی بینک کو ملک میں کام کرنے کی اجازت نہ دی۔

3- قومی دولت کو عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا۔

4- علاج معالجہ اور صحت اور تعلیم کو مفت کیا۔ قومی دولت کو سسٹم کے بیرون کی آبادکاری پر خرچ کیا، پسماندہ رہائشی طرز زندگی کو تبدیل کر کے نئے طریقہ آبادکاری کو رائج کیا۔ جمہور یافتہ اور سوامی افریقین زندگی گزارنے والے اپنے شہریوں کو زندگی کی سہولتوں سے شہر میں آباد کیا۔ شہروں کو نقشوں سے مزین کیا۔

5- لوگوں کیلئے روزگار کا بندوبست کیا۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز مثلاً سبزی، گوشت، آٹا،



تمیز کو چھوڑ

آئینہ

”اسلام قبول کرنے کے بعد حجاب پہننا شروع کر دیا تھا۔ وہ عیالیا بہن کا بڑے سلیطے سے اسراف ادا تھی، بہت باقاعدگی سے نماز پڑھتی اور داروغہ وقت میں اسلامی کتب پڑھتی تاکہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔“

ایک ہندو کی کہانی سن کر تلاش اس کو بے چین کیے رکھتی!

نہ ہوا اور میں گرتے ہی گہری نیند سو گئی۔ میں گہری نیند میں تھی کہ اچانک شور سے میری آنکھ کھلی گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرے ساتھ والے بیڈ پر ایک دوسری سٹوڈنٹ کا سامان پڑا ہوا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹا اور میری تخی دردم میں گھس گئی۔ اس نے مجھے جانتے دیکھا تو خوشدلی سے مسکرائی۔ ”فستے میں پوچھا ہوں۔“ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جو کھٹکھٹا کر دیا۔ سیلیوٹیں ہلاؤ اور ہنر سلاخی میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا

جب مجھے اٹھایا یونیورسٹی میں کمرہ الاٹ ہوا اور چالی لکھی تو میں اپنا سامان لے کر ڈورم میں پہنچ گئی۔ کمرے کا تالا کھولا تو وہاں دو بیڈ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ میرے ساتھ کوئی اور سٹوڈنٹ بھی رہے گی۔ میں نے کھڑکی کے ساتھ والا بیڈ لے لیا اور اپنا پرس بستر پر پھینک کر الماری کا جائزہ لینے لگی۔ دو الماریاں ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے اپنا انجیلی اور چھوٹا بیگ الماری میں رکھ دیا اور تھکاتھک ڈور کرنے ڈراڈر کو بیڈ پر لیٹی۔ بستر پر گرتے ہی وقت کا اندازہ

میں معمر القذافی کے پاس تقریباً 30 سے 40 ہزار وقادار سابقہ فوج کے لوگ موجود ہیں لیکن باقی افواج کے زبانی دہاؤ کے ساتھ ساتھ اگر NATO کی مشترکہ اتحادی افواج نے دوبارہ مسلسل بمباری شروع کر دی تو کیا قذافی اور قذافی کی حمایت کرنے والی فوج ان سب طاقتوں کے سامنے ٹھہر سکے گی۔ تجربہ نگار کے خیال میں ہرگز نہیں کیونکہ باقی افواج اور NATO کا مقصد اب صرف پورے لیبیا پر قبضہ کے بعد کرل معمر القذافی اور اس کے بیٹوں کی زندہ یا مردہ گرفتاری ہے کیونکہ اب وہ قذافی اور اس کے بیٹوں کا انجام صدام حسین کی طرح کا کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔ اگر قذافی اور اس کے بیٹے اس جنگ میں مارے جاتے ہیں تو پھر ان دونوں کی اور غیر ملکی اتحادیوں کو کون قلب حاصل ہو سکتا ہے اور کرل قذافی اور اس کے بیٹوں کی گرفتاری کی صورت میں ننگر و کورٹ کا اپنی مرضی کی فیصلہ کرے کہ اس کو سزائے موت کے انجام تک پہنچاتا ان کی اور غیر ملکی اتحادیوں کا آخری فیصلہ ہے کرل قذافی کا بمباری میں مارا جانا یا کرل معمر القذافی کی پھانسی۔ اگر کرل قذافی ملک کے اندر ہی ہے اور ویزویلا، مینی بساؤ یا کسی ملک میں فرار نہیں ہو گیا تو اس جنگ کا انجام معمر القذافی کی جنگ میں موت یا عدالت سے اپنی مرضی کی پھانسی ہے۔ معمر القذافی کا جج جانا اور کسی ملک میں نکل جانا اب کافی مشکل نظر آ رہا ہے۔

موجودہ وقت میں لیبیا اب آزاد ہو گیا ہے۔ اب موجودہ حکومت محمد عبدالہی اہل اور محمد جبرائیل کی قیادت میں ہو گی۔ اس کو امریکہ اور یورپ کی سرپرستی کی وجہ سے چند گھنٹوں کو چھوڑ کر باقی پوری دنیا جلد تسلیم کر لے گی۔

کے دہانے پر کھڑا کر دیا گیا ہے تو عالمی طاقتوں کے خوف سے کسی افریقی یا اسلامی ملک نے وہاں کے لوگوں کی اس مصیبت کی گھڑی میں کسی بھی طرح سے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ سوائے نا بھجریا، ویزویلا اور کئی بساؤ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کے۔ وہ بھی صرف معمر القذافی کی حمایت کے سوا کیونکہ کرل معمر القذافی ان ملکوں کی مالی مدد کرتا تھا اور افریقین یونین کا چیئر مین بھی تھا لیکن لیبیا کے عوام کے بے گناہ قتل پر قہار دنیا خاموش اور بے حس ہے۔ خاص طور پر کرل قذافی کو قتل کرنے کے لیے NATO بھی مخالف فورس کی مدد کی آڑ میں بمباری کر رہی ہے جن میں بے گناہ لوگوں کی جائیں ضائع ہو رہی ہیں۔ دیگر قتل عام کے بعد یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کرل معمر القذافی کی مخالف فوج کے ملکی لوگ بھی NATO کی اس کارروائی کی حمایت نہیں کرتے لیکن نظام کی تبدیلی اور کرل قذافی کے قتل کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ بات قرین ثبوت ہے کہ جب تک کرل قذافی زندہ ہے اور گرفتار نہیں ہوتا قذافی مخالف فوج اور NATO کے لیے خطرہ ہے اور اپنی مرضی کا نظام لانے کے لیے ان کو مشکلات کا سامنا ہے۔

موجودہ حالات اور اس

بغاوت کا انجام بالآخر

جیسا کہ موجودہ وقت میں سیرت اور مہماندہ میں بنی ولید کے شہر پر قبضے کے لیے کھسار کی جنگ جاری ہے مہماندہ اور سیرت کے قبضے کے بعد ہی موجودہ باقی فوج کے پورے ملک میں کنٹرول کا اعلان ہو سکتا ہے لیکن جیسا کہ کرل معمر القذافی کا اعلان ہے جنگ اور آخری سانس تک جنگ لیکن دنیا حیران ہے کہ عالمی طاقتوں اور موجودہ باغی افواج سے وہ یہ جنگ کب تک لڑ سکیں گے۔ موجودہ وقت

جیسے سبز پتوں کے درمیان شبنم میں دھلا ہوا کوئی گلاب کا پھول۔ ملائم اور دلکش اور پھر وہ دیکھ کر ہمارے نئی نکلی ہوئی کیلیں کی لطافت اور نزاکت کا احساس ہوا۔ کندھے پر کوچ COACH کا بیگ اور DELESEY ڈبلیسی کے فرانسیسی سوٹ کیس، اس کے اندر آتے ہی CHANNEL-5 چینل قانونی کی مہنگ چاروں طرف پھیل گئی۔ ٹاکز اور سٹی گردن میں بہت نازک سائیکس۔ ہر چیز مہنگ براڈ کی اور اس سے امداد ٹیک رہی تھی۔ میں اس کے کپڑوں اور نشتے سے اعزازہ تو لگا ہی چکی تھی کہ وہ ہندوستانی ہے۔ لہجہ میرا کچھ کوفتی ہوئی۔ میں تو کسی امریکن روم میٹ کی توقع کر رہی تھی۔

دراصل اتنا عرصہ ایک میسگرار کر رہے امریکی لڑکیوں کے ساتھ کھانا ملنا بہت آسان لگتا تھا۔ مجھے انکے ساتھ کوئی بھی پرانہ نہیں ہوئی تھی۔ سکول کالج اور یونیورسٹی میں امریکی لڑکیوں کے ساتھ دوستی کے تجربات بہت اچھے رہے تھے۔ وہ جو باہر سے نظر آتیں اندر سے بالکل ویسے ہی ملتیں مگر یہ کسی غیر مسلم ہندو سٹوڈنٹ کے ساتھ ساتھ سب مگر گزارنا تو بہت مشکل ہو گا۔ چہ نہیں اس کے ساتھ میرا وقت کیسے لگے گا۔ اپنے ذہن سے یہ باتیں جھٹک کر میں صروت میں آٹھ گھنٹہ کی ہوئی اور سامان لانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔

”پوچھا یہ تم اتنا سامان رکھو گی کہاں؟ الماریاں تو بہت چھوٹی ہیں۔“

”بس تم دیکھتی جاؤ میں کیسے سب کچھ آکر گزار کر رہی ہوں۔“ اس نے مجھے تلی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا شوگر بیگ بستر پر رکھا اور اگلے دو گھنٹے میں بہت سلیپے قرینے سے اپنے کپڑے دیکھو گروں پر ٹانگ دیئے۔ باقی ترتیب سے الماری میں رکھ کر اس نے اپنے چھوٹے سوٹ کیس بڑے

پوچھا نے میرے پاکستانی اور مسلمان ہونے پر جب خوشی کا اظہار کیا تو میں حیرت سے دنگ رہ گئی۔ میرا خیال تھا وہ ہندوستانی ہونے کے باعث بہت متعصب ہو گی مگر اس نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر مجھے لے گیا۔

”تم سے پہلے بھی میری دو سب سے اچھی فریڈز مسلمان ہیں، اب اس میں تمہارا اضافہ ہو گیا ہے، بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

مجھے برائے نام ملا دکھاتے دیکھ کر وہ ہنسنے لگی۔

”مجھے یہ تو اچھی طرح سے پتہ ہے کہ تم یہاں MEAT والی کوئی ڈش نہیں کھاؤ گی کیونکہ یہ تمہارے لیے حرام ہے مگر خانہ پری کیلئے کچھ تو اور کھا لوتا کہ آتی لمبی رات گزر سکے۔“

اس کے ہمدردانہ مشورے پر میں نے کافی کے ساتھ ٹیک کھالیا۔ سارا دن میں ایلمینٹ آفس اور ڈورم کی کافنڈری کارروائی میں مصروف رہی تھی۔ کھانے پینے کی طرف میرا صیانت ہی نہیں لگا تھا۔

جب میں پوچھا کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آئی تو ہمارا فون بج رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا ”تم سن لو میں واٹس روم سے ہو کر آئی ہوں۔“

میں نے فون اٹھایا تو بھیا کا لاس انجلس سے فون تھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ہی ہمارے لیڈ لائن کے فون کی سرور شروع ہوئی تھی اور ہمارے لیڈ لائن کے کلیئوریٹاے فون کے کمرے میرا بھی پتہ کر دیا تھا۔

میں نے ایک ہی سانس میں بھیا کو ساری رپورٹ دی کہ میری روم میٹ ایک ہندو ہے۔ بہت امیر خاندان کی ہے۔ بھینے سے ایم بی اے کرنے آئی ہے۔

”وہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے صرف تمہیں تاکید کرنی تھی کہ قبلہ کا رخ معلوم کر

کے نماز باقاعدگی سے پڑھنا اور روز ٹھوڑی ٹھوڑی تلاوت بھی جاری رکھنا۔“ وہ بالکل ڈیڈی کے کچے میں بول رہا تھا۔

بھیا کا فون رکھ کر یاد آیا کہ لاس انجلس سے چلے وقت انہوں نے مجھے جانے نماز اور عبداللہ یوسف علی کی ٹرانسلیشن والا انگلش کا قرآن پاک بھی دیا تھا۔ میں نے اپنے سامان سے دونوں چیزیں نکال کر باہر رکھیں اور خوش کرنے ملی دی۔

پوچھا نے میری دوستی کی ابتداء ہوئی۔ پوچھا اور میں دن بھر اپنی اپنی کلاسز اینڈیز کرتیں۔

شام کو میں جلدی فارغ ہوئی تو جلدی کرے میں آ کر صفائی کر دیتی اور اگر وہ مجھ سے پہلے آتی تو کمرے میں پہنچ کر سب کام کر چکی ہوئی۔ صبح ہم دونوں ہی اپنا بستر بے ترتیب چھوڑ کر اس پر اترارے ہوئے کپڑے پھیلا کر افراتفری میں بھاگ جاتیں۔

ڈیپارٹمنٹ سے واپسی پر ہم سب کچھ سیٹ دیتیں۔ رات کا کھانا ہم دونوں ڈانکنگ ہال میں انکسے ہی کھانے جاتیں۔ جہاں سے اس نے بہت سے انڈین سٹوڈنٹس سے مجھے متعارف کرایا البتہ کمرے میں واپس آ کر ہم خاموشی سے اپنی اپنی سٹوڈنٹس کرتیں۔ درمیان میں وہ کبھی کبھار مختصر بات کر کے خاموش ہو جاتی۔

ایک اینڈ پر اپنی اپنی لائبرری کرتے تھے مگر کبھی شاپنگ کرتے اور ڈرم پیپر لکھتے دو دن گزر جاتے۔ اس کے پاس کبھی پاپا کے انڈیا سے فون باقاعدگی سے آتے اور میرے دونوں بھائی کلیئوریٹا اور اونیٹو سے فون کے مجھ سے پورے پینے کی رپورٹ لینے اور آخر میں وہی تاکید ہوتی کہ ٹرڈ باقاعدگی سے پڑھا کرو اور ٹھوڑا ٹھوڑا قرآن پاک بھی۔

میں نماز تو پڑھ لیتی مگر اوقات میں پابندی اور باقاعدگی نہ آسکی۔ پوچھا اپنے مذہبی طور طریقے سے

پولیس سمیت گھنٹوں گھنٹوں برف میں دھنسی دھناتی
اپنے ڈورم تک پہنچی تو میں نے دیکھا کہ میرے
کمرے کا دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے پوچا کہ زور
زور سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ خدا خیر کرے،
پتہ نہیں کیا ہوا ہے؟

میں بھاگ کر اندر گھسی تو پوچا کو دھاڑیں مار کر
روتے پایا۔ ”پوچا پولو تو سکی کیا ہوا ہے؟“ میں نے
اس کا ہاتھ چھو کر دیکھا کہ کہیں بخار تو نہیں مگر اس کا
جسم ٹھنڈا تھا۔ ”میرے پیٹ میں بہت درد ہے مجھے
جلدی سے ہسپتال سنٹر لے چلو۔“ درد سے ترپتے
ہوئے اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے جوڑ
دیئے۔ درد کی شدت سے اس کے گلہا پیوٹ بالکل
نیلے ہو رہے تھے۔

میں نے فون اٹھا کر 911 پر کال کی (پورے
امریکہ میں 911 ایمرجنسی کی صورت میں ملایا جاتا
ہے)۔ اگلے دس منٹ میں بلومنگٹن
BLOOMINGTON پولیس ڈیپارٹمنٹ کی
چار باج گاڑیاں بسوا ایبولنس کے آگئیں۔ پولیس
کا ایمرجنسی شاف ہمارے کمرے میں سڑچر لے کر آ
گیا۔

میں پوچا کے ساتھ پولیس کی ایبولنس میں چڑھ
کر ہسپتال سنٹر چلی گئی۔ پوچا کا سڑچر لے کر ایمرجنسی
شاف لی سی گیلری میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر
کے بعد ایک نرس بھاگتی ہوئی میرے پاس آئی۔
”تمہیں پوچا نے بلایا ہے جلدی سے اس سے
بات کرو۔ ایمرجنسی میں اس کی سرجری ہونے والی
ہے۔ اگر تھوڑی دیر اور ہو جاتی تو اس کی اپنڈے
سائٹس پھٹ جاتی پھر اس کا پچتا مشکل تھا۔“

میں گیلری میں نرس کے پیچھے بھاگتی ہوئی ای
آر E.R تک پہنچی تو پوچا کو ہاسپٹل کا گاؤن پہنا کر اس
کی کلائی میں آئی ڈی کی بریسلٹ پہنا کر انہوں

چلتی اور کھڑکی بکھار میرے ہاتھ پر پرشاد رکھ دیتی جو
میں اس کی نظر پٹا کر غائب کر دیتی۔ پوچا جب بھی
مجھے نماز پڑھتے دیکھتی تو خاموشی سے دیکھے چلی
جاتی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کو میرے
نماز پڑھنے سے دلچسپی کیوں ہے۔ جب میں دعا
مانگنے کے لیے ہاتھ اُٹھاتی تو وہ مجھ سے درخواست
کرتی۔

”میرے مئی پایا کی صحت، ان کے برنس اور
میری کامیابی کی ضرورت دعا کرنا۔“
مجھے یہ تو پتہ نہیں تھا کہ میں کسی غیر مسلم کے لیے
دعا کر سکتی ہوں یا نہیں مگر اس کے اصرار پر میں اس کے
والدین اور خود اس کی کامیابی کے لیے دعا کر دیتی۔
اس بارے میں میں بیا کو فون کر کے پوچھتا چاہتی
تھی مگر فون پر پوچھتا یاد ہی نہ رہتا۔ مجھے بمیانے یہ
تو بتایا تھا کہ ہم غیر مسلموں کو سلام کر کے ان پر
سلامتی نہیں بھیج سکتے اس لیے صرف پیلو ہائے سے
میرا کام چل جاتا تھا مگر دعا کرنے کے بارے میں
میری معلومات بالکل زیر و تختیں۔

اکتوبر میں سردی شدت پکڑ گئی اور نومبر میں
برفباری شروع ہو گئی۔ برفباری میں کئی کئی دن تک
بریک نہ آئی۔ پوچا دوسری کی ساری عمارتیں برف کے
ڈھیر میں ڈھنسنے لگیں۔ جیسے جیسے کرسٹم قرب آ رہا تھا
ہر طرف برف کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ ڈنٹ ہاتھ اور
سڑکیں ساتھ ساتھ صاف کر دی جاتیں تاکہ آنے
جانے میں دقت نہ ہو اور خود ہمیں بھی گرم کپڑوں کا
پہناؤ لاد کر باہر نکلنا پڑتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن
برف کا طوفان آ جاتا۔ اس سے وہی طور پر ہر چیز
متاثر ہوتی مگر جلد ہی صورتحال پر قابو پا کر سب کچھ
نارل کر دیا جاتا۔

وہ اداں دسبر کی شام تھی۔ میں باجج بیٹے آئی۔
ایس ٹی سے نکلی تو گھپ اندر چھا چکا تھا۔ میں سنو

نے اس کو آپریشن کے لیے بالکل تیار کر دیا تھا۔ پوجا کی سادھی اور چوہری جو وہ پہنے ہوئے تھے وہ انہوں نے میرے حوالے کر دی۔
پنچتر اس کے کہ میں کچھ پوچھتی پوچھانے میری کلائی چکڑی مجھے اپنی طرف کھینچا۔
”جلدی سے آیات شفا پڑھ کر کچھ پر دم کرو تاکہ میری سرجری ٹھیک ہو جائے۔“
ایک ہندو لڑکی کا ہماری دعاؤں پر اتنا اعتقاد اور یقین دیکھ کر میں جذباتی ہو گئی۔

”یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں وہ جلدی سے کرو۔ وہ مجھے آپریشن خیمے لے جانے والے تھے۔ میں نے تم سے بات کرنے کی چند منٹ کی سہلت مانگی ہے۔“

میں نے روتے روتے درود شریف پڑھا اور آیات شفا پڑھ کر اس پر چھوٹ کر ماری۔ وہ ڈاکٹر نے اس کا اسٹریچر باہر نکالا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ ساتھ دعائیں کرتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو گرتے جا رہے تھے۔

”آپ پوجا کی سرجری تک وینٹک لاؤنج میں انتظار کر سکتی ہیں۔“ ڈیوٹی ڈاکٹر نے مجھے تسلی دینے کے لیے میرے شاتروں پر پیار سے مسکی دیا۔
”نہیں، میں وہ دیکھنے بعد آ جاؤں گی مجھے کچھ ضروری کام ہے۔“

پوجا کو آپریشن خیمہ پہنچا کر میں ہائیٹ سنٹر سے نکل آئی اور وہاں ہاسٹل پہنچے پہنچے میں راست بھراس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتی رہی۔ واپس آ کر میں نے نماز پڑھی اور اس کی صحت کی دعائیں کر کے میں ڈانٹنگ ہال میں کھانا کھانے پہنچی تو پوجا کا ایک جاننے والا لڑکا ریشم جو ہمارے اسٹنڈنٹ نرس سٹاف آفٹن ٹیکنالوجی میں فوٹو جرنلزم کی کلاسز لے رہا تھا میری ٹھیل پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ رام

ادتا رہی تھا جو پوجا کے ساتھ کم لگے اے کر رہا تھا۔
”سنا ہے پوجا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ کیسی ہے؟“ ریشم بہت غرمند تھا۔

”اس وقت امیرجی میں اس کی سرجری ہو رہی ہے۔ میں اس کیساتھ ہی گئی تھی۔ ابھی میں صرف کھانا کھانے آئی ہوں۔ واپس وہیں جا رہی ہوں۔“
ہائیٹ سنٹر واپس پر رام ادتا اور ریشم میرے ساتھ آ گئے۔ ہمارے پہنچنے تک پوجا کی سرجری ہو چکی تھی۔ اس کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔
ابھی ANESTHESIA کا اثر باقی تھا۔ وہ گہری بیہوشی میں تھی۔ رام ادتا اور ریشم واپس چلے گئے اور وہ رات میں نے پوجا کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر گزار دی۔ میں وقتاً فوقتاً دعائیں پڑھ کر اس پر پھونکوں مارتی رہی۔ تیسرے دن پوجا کو کچھ ٹھیل مٹی اور میں اس کو وہاں ڈورم لے آئی۔

”میں تمہارا رشتہ یہ کیسے ادا کروں۔ یہ جو میں زعمہ پٹی ہوں تو صرف تمہاری دعاؤں کی وجہ سے تمہاری کتاب میں بہت تاثیر ہے۔ اس کی میں بچپن سے ہی قائل ہوں۔ بچپن میں ایک دفعہ پہلے بھی میرے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ ہم لوگ گرمیاں گزارنے کے شغلہ گئے تھے۔ وہاں ہم ٹھیل نمونہ ہو گیا تھا۔ میرے پیچھے بڑے بالکل کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔ بچنے کی امید نہیں تھی۔ تو ہمارے گھر کے ساتھ والے گھر میں ایک آنٹی مسز مشیر حسین رہتی تھیں۔ وہ بہت نیک خاتون تھیں۔ بڑا نورانی چہرہ تھا۔ انچھل وقت نماز پڑھتی تھیں اور ہر جنت المبارک کو روزہ رکھتی تھیں۔ وہ میرا حال پوچھتے آئیں تو میری می نے ان سے میرے لیے دعا کروائی اور مجھ پر دم کرایا۔

اور دیکھو اس دعا اور دم کی وجہ سے میرے ساتھ اتنا بچہ بچہ ہوا کہ میں ان کی دعاؤں سے زعمہ

گئی اور رو بہ صحت ہو کر گھر آ گئی۔ میرے ڈاکٹر زجیران تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر یہ صرف میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ ادھر والے کے کلام کی بولت سے ہوا۔ بے لے کر آج تک میں جب بھی پیار یا پریشان ہوتی ہوں تو کسی مسلم سے ہی دعا کرواتی ہوں۔“

”مجھے سن کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے قرآن پاک پر اور ہماری دعاؤں پر تمہارا اتنا اعتقاد اور یقین ہے۔“

”ارے نہیں۔ یہ میں جنہیں خوش کرنے کے لیے نہیں کہہ رہی بلکہ یہ سب کچھ میں محسوس کرتی ہوں۔ مجھے اسلام سے بہت عقیدت ہے۔“
پوجا کا ایمان اور یقین دیکھ کر میں جذباتی ہو گئی۔

پوجا نے اپنے می پاپا کو میرے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ کس طرح میں نے امیرجی میں پہنچا کر اس کی سرجری کروائی اور اس کے لیے دعاؤں کرتی رہی تو اس کے کی پاپا نے مجھے ہمیشہ سے بہت لیاؤن کر کے میرا شکر یہ ادا کیا۔ وہ میرے شکر گزار تھے کہ میں نے پوجا کو بروقت باہر چل پھینچا کر اس کو موت کے منہ سے بچا لیا۔ شاید وہ میرے احسانوں کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھی انہوں نے مجھے سونے کا ایک سیٹ بلور گفٹ بھیجا جو میں نے بہت کراہیں کر دیا کہ میں جیوری نہیں چاہتی تو انھی بار انہوں نے مجھے انڈیا سے اپنی بہن کے ہاتھ ڈانٹنے کے تاہم بھیج دیے۔

سوگھی دھرتی پر بیار کی چند ہونٹیں گرتے ہی کوئٹہ چھوٹے لکھن اور دیکھتے ہی پھول سر اٹھا کر بیٹھنے لگے۔
پوجا میرے اور قریب ہو گئی۔ وہ اکثر مجھے

پوچھا اس کے لیے میری ایک شرط ہے کہ تم اگر اور والا کہنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کہا کرو تو مجھے بہت اچھا لگے گا اور میرے دل سے دعا نکلیں گی۔“

میری دعاؤں کی خاطر وہ میری ہر شرط ماننے کو تیار تھی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے جو بات کی وہ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کی۔ رمضان المبارک میں میں امام کعبہ کی آواز میں تلاوت کی کیسٹ لگا کر سنتی تو پوجا ہر خزروہ کی بیٹھ کر سنتی رہتی۔ کیسٹ ختم ہو

پھینچتی تھی ”تمہارے پیار اور خلوص نے مجھے خرید لیا ہے اب سچ مت دینا۔“ میں نے کہا ”بہنوں کے سوا کسی کو اپنی بیوی خریدنے کے باوجود تم کرو گی ہی کیونکہ یہ تمہاری رگوں میں خون کی جگہ دودھ رہا ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو مجھے۔ چلو میں تمہیں ایک شعر سناتی ہوں جو میرے جذبات کی عکاسی کر دے گا۔“

ملا کون جہاں میں جو ہم کو خریدتا ہم بک گئے خلوص خریدار دیکھ کر اس کے آگے میں لا جواب ہو گئی۔

اس کے بعد رمضان المبارک جو ہاسٹل میں شروع ہوا تو میں نے اسلامک سنٹر کے ٹائمر ٹھیل کے مطابق حری اور افطاری کا انتظام کر لیا اور اپنے کمرے میں ہی حری اور افطاری کرنے لگی۔ پوجا کو پتہ نہیں وقت کا کیسے اندازہ ہو جاتا۔ وہ عین فجر اور شام کو مغرب کی نماز کے وقت میرے سر پر سوار ہو جاتی۔

”تم سب بیڈوں کے لیے دعائیں تو کرتی ہو میں چاہتی ہوں تم میرے می پاپا، میرے بھائی اور میرے لیے بھی خصوصی دعائیں کیا کرو۔ مجھے پتہ ہے جو روزہ رکھتا ہے تو اس کی دعا اوپر والا ضرور قبول کرتا ہے۔“

”پوجا اس کے لیے میری ایک شرط ہے کہ تم اگر اور والا کہنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کہا کرو تو مجھے بہت اچھا لگے گا اور میرے دل سے دعا نکلیں گی۔“

میری دعاؤں کی خاطر وہ میری ہر شرط ماننے کو تیار تھی اور اس کے بعد اس نے مجھ سے جو بات کی وہ اللہ تعالیٰ کے پاک نام سے کی۔ رمضان المبارک میں میں امام کعبہ کی آواز میں تلاوت کی کیسٹ لگا کر سنتی تو پوجا ہر خزروہ کی بیٹھ کر سنتی رہتی۔ کیسٹ ختم ہو

جاتی تو وہ اکثر اصرار کرتی کہ REWIND کر کے مجھے دوبارہ سنواؤ۔

رمضان المبارک کے دوران اس نے میرے ساتھ مل کر تقریباً سارا قرآن پاک سن لیا۔ آخری عشرے میں جب طلاق راتوں کو جاگ کر نفل پڑھتی تو وہ چپ چاپ کھٹوت کرتی رہتی۔

وہ رمضان کی ستائیسویں تھی۔ میں رات بھر جاگتی رہی تھی۔ صبح میں اُٹھی بیٹھ جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”تم رات بھر جاگتی رہی ہو تمہارے چہرے پر کوئی ٹھکان نہیں۔ تم اتنی فریض کیسے رہتی ہو۔ میں تو آٹھ گھنٹے نہ سوؤں تو سرنے والی ہو جاتی ہوں۔“

”پوجا یہ سب رمضان المبارک کے مہینے کی برکت ہے اور کچھ نہیں۔“

اسلام کے بارے میں وہ مجھ سے اتنے سوال کرتی جن کا اکثر میرے پاس جواب نہ ہوتا تھا۔ میں اکثر باتیں کول کر جاتی۔

دراصل اسلام کے بارے میں میری معلومات بہت محدود تھیں۔ پوجا کے سوالوں کے جواب میں اکثر میرا دل چاہتا کہ میرا اسلام کے بارے میں علم اتنا زیادہ ہوتا کہ میں اس کو صحیح جواب دے کر مطمئن کر سکوں۔ اس لیے میں نے ڈیڑی کو تاکید کی کہ وہ مجھے اسلامی لٹریچر بھیجیں۔

اور پھر جو کئی بھی پاکستان سے آیا مجھے اسلامی کتب پہنچتی رہیں۔ میرا فائل سسٹم تھا۔ میں بیسٹ کی طرح اب بھی آنرول کے ساتھ گریجویٹ ہونا چاہتی تھی۔ میں دن رات محنت کر رہی تھی۔ پوجا نے مجھے ہانگوں کی طرح پڑتے دیکھا تو کہنے لگی:

”تم کس آنرول کی بات کر رہی ہو۔ تم مسلمان گھر میں پیدا ہوئی، تمہارے کان میں اذان دی گئی، آپ آئے تمہارے لیے کیا کام ہے؟ قرآن پاک

پڑھ کر اپنی فیملی پر رکھ گئی تھی۔ پوجا کی نیکل پر کیے بیچ گیا۔ شاید بے رحمانی میں صفائی کرتے پوجا نے میری بجائے اپنی نیکل پر رکھ دیا ہو گا۔ میں نے خود کو ملٹی دینے کی کوشش کی اور میں لائٹ آف کر سکی۔ صبح پانچ بجے پوجا نے مجھے مجھوڑا کھایا تو میں ڈر گئی۔

پوجا اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پر پپے کے قطرے چمک رہے تھے۔

”اٹھو میری رات دھیان سے ستو، میں نے ایک بڑا عجیب سا خواب دیکھا ہے۔“ بات کرتے ہوئے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ میں انہیں ملتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے کیوں جگایا ہے۔ میں تو بہت لیٹ سوئی تھی۔ خیر متاؤ کیا کیا ہے۔“

”میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی اندھیرے کمرے میں گم ہوں اور باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہوں کہ اچانک کسی نے لائٹ آن کر دی۔ چاروں طرف روشنی پھیل گئی اور سب طرف اور پورائی پر عمری لگی ہوئی تھی۔ وہ ہر طرف پھیل گئی اور روشنی پر عمری لگی ہوئی تھی کہ میری آنکھیں چندھیا نے لگیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی مجھے بہت ڈر لگا اور اتنے میں میری آنکھ کھلی گئی۔ کیا عجیب سا خواب ہے پتہ نہیں اس کی تعبیر ہو گی۔“ وہ بہت خوفزدہ تھی۔ حیرت اور پریشانی سے اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس پر خواب کا ردعمل بہت شدید ہوا۔

”پوجا میں بتاتی ہوں اس خواب کی تعبیر یہی ہو گی کہ تم مسلمان ہو جاؤ گی۔ بس اب تم اپنی پڑھائی ختم کر کے کوئی ملازمت ڈھونڈ لو اور کسی مسلمان سے شادی کر کے یہیں سیٹل ہو جاؤ۔ اٹھایا دایں جانے کا خیال چھوڑ دو۔“

ساکت۔ میرے پاس اس مسئلے کا بظاہر کوئی حل نہیں تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ تم دایں اٹھایا جانے کا خیال چھوڑ دو اور میرے ساتھ نیپارک چلو دایں چل کر کوئی ملازمت ڈھونڈو اور اسلام قبول کر کے کسی مسلمان سے شادی کر لیتا۔“

”مجھ سے کون شادی کرے گا؟“

”جب تم اسلام کے دوازے میں داخل ہو گئی اور تم نے کلمہ پڑھ کر اپنا اسلامی نام رکھ لیا تو کوئی بھی اچھا مسلمان تم سے شادی کرنے کو اپنے لیے آنر سمجھے گا۔“

”اگر واقعی ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو گا مگر میرے مئی پاپا، بھائی اور دوسرے رشتہ دار مجھے چھوڑ دیں گے۔ ایسا باتیں زیادہ دیر پہنچی تو نہیں رہیں۔ آخر ان سب کو پتہ تو چل ہی جائے گا۔“ وہ بہت سبکی ہوئی تھی۔

”تم اللہ تعالیٰ کی خوشی چاہتی ہو یا مئی پاپا اور لوگوں کی۔“ وہ میرے سوال پر ہلکا گئی۔

ابھی اس کے ذہن پر یہی باتیں سوار تھیں کہ ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔

میں نے ڈیپارٹمنٹ سے کمرے میں لوٹی تو پوجا سوچتی تھی۔ مجھے اللہ پاک کا دن گزرتے ہی کسی آنے لگی ہے۔ بغیر اوار کو یونہی جانے کی افراتفری نہیں ہوتی۔ میں نے سوچا صبح ہفتی تو ہے، رات تو دیر تک پڑھ لیتی ہوں۔ اڑھائی بجے رات کو شپ آف کرنے انھی تو میری نظر پوجا کی سٹڈی ٹیبل پر پڑی۔ وہاں سے بھکوان کی صورت اور اس سے متعلقہ بھی کچھ غائب تھا اور اس کی جگہ میرے اساتذہ حند دالی انگلش کی کتاب اور اس کے ساتھ ہی (عبداللہ یوسف علی والا انگلش کی فراسلیشن کے ساتھ) میرا قرآن پاک پڑا ہوا تھا۔ یہ قرآن پاک تو میں فجر کی نماز کے بعد

ایک WAY OF LIFE ہے اس کے مطابق چلو گی تو سب کچھ ہی مل جائے گا، دین کے اس آنرول کے آگے یہ ہدائی آنرول کیا اہمیت رکھتا ہے؟ مسلمان مگر میں پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آنرول تو دے ہی دیا ہے اور کیا چاہتی ہو؟“

ایک ہندو لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں نہ سمجھ کر ہر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرے فائل ختم ہونے والے تھے۔ جیسے جیسے میرے جانے کے دن قریب آ رہے تھے پوجا کی پستی بڑھنے لگی۔

”میں بہت دنوں سے ایک بات کہنا چاہ رہی ہوں۔ یہ تمہارے اور میرے درمیان کا فیصلہ نہیں ہے۔“ وہ بہت غمگین نظر کر رہا اور انداز نہ بچے میں بولی۔

”پوجا یہاں تک بیجاؤ اب کہہ ڈالو جو کہنا باقی ہو۔ میں تو کیونکیشن کی سٹوڈنٹ ہوں اور اس کی تعریف یہی ہے کہ ITS AN ART OF UNDERSTANDING AND BEING UNDERSTOOD۔ ابھی تم کوئی بات شروع کرتی ہو تو میں سمجھ جاتی ہوں پھر ایسی کیا بات ہے جو تم کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہیں پا رہی۔“

”جب تم کمرے میں نہیں ہوتی تو میں تمہارا اسلامی لٹریچر پڑھتی رہتی ہوں۔ تمہیں میں نے بھی علم نہیں ہوا کہ وہ۔ میں نے تمہارے قرآن پاک کی عبد اللہ یوسف علی کی انگلش فراسلیشن جب سے پڑھ کر ختم کی ہے میرے اندر اسلام قبول کرنے کی خواہش جاگ اُٹھی ہے۔ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں مگر اس میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ میرے اس فیصلے کی بہت مخالفت ہو گی اور مجھے بہت کچھ چھوڑنا پڑے گا۔ تم مشورہ دو میں کیا کروں؟“

وہ سخت پریشان تھی اور میں حیرت سے

لبی گپ شب ہوتی۔ میرے آنے کے بعد وہ کمرے میں پانچس بجلی تھی اور اکڑتی رہتی تھی۔

”تم یہاں کمرے میں نماز اور قرآن پاک پڑھا کرتی تھی تو مجھے عجیب سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ جب سے تم گئی ہو مجھے کمرے میں بہت ڈر لگتا ہے۔ میں اکیلی ہوتی ہوں پھر مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے جو میری ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے۔“

”پوچھا یہ سب تمہارا دہم ہے بس تم جلدی سے فارغ ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔“ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

ڈیڑھ ماہ بعد وہ فائنل ایگزٹ دے کر نیویارک آگئی اور آتے ہی اس کو مین مین میں ایک فرم میں ملازمت مل گئی۔ ملازمت ملتے ہی وہ سب سے پہلے میرے ساتھ اسلامک سنٹر گئی اور مولانا طلیح الرحمن جو انہی دنوں پندرہ سال رابطہ عالم اسلامی کے کمرہ میں کام کر کے نیویارک آ گئے تھے اور ہماری مسجد کے امام تھے ان سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی۔ اس کا اسلامی نام پاکیزہ رکھا گیا۔ اس نے قاری صاحب سے عربی میں قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ کونیز کالج میں اسلام کے کچھ کورسز میں پارٹ ٹائم داخلہ بھی لے لیا۔ اب اگلا مرحلہ اس کی کسی پاکستانی سے شادی کا تھا۔

میں ابھی پوچھا کے لیے رشتہ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ مجھے ڈیڑی نے میری اپنی شادی کے لیے پاکستان بلا لیا۔ میں اپنے چچا زاد سے شادی کر کے واپس امریکہ آ گئی جہاں میرے ڈاکٹر شوہر کو سینٹرو نیو یارک آئی۔ ان دنوں امریکہ کو میڈیکل گریجویٹس کی بہت ضرورت تھی۔ یہاں سے ٹکٹ اور گرین کارڈ بھیج کر ڈاکٹروں کو بلایا جاتا تھا۔

موت کی راکھ۔!!

مہاتما بدھ کے پاس ایک عورت اپنے بچے کی لاش لائی اور کہا بھگوان! سنا ہے تم مردوں میں جان ڈال سکتے ہو تو پھر میرے بچے کو زندہ کر دو۔ گوتم بدھ نے کہا!

تمہارے مردہ بچے میں جان ڈال تو سکتا ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گاؤں کے ہر گھر میں جاؤ اور اس گھر کے چولے کی راکھ لے آؤ جس گھر میں بھی موت نہ ہوئی ہو۔ وہ راکھ تمہارے اور بچے کے جسم کو جیسے ہی لگائی جائے گی وہ زندہ ہو جائے گا۔

لیکن اس عورت کو کوئی ایسا گھر نہ ملا جو اس سے آزاد رہا ہو۔ یہ مصیبت ہر ایک نے اٹھائی ہے اور ہر ایک کو اٹھانی پڑے گی۔ اور وہ عورت چپکے سے اپنے بچے کی لاش کو کرپا کر مے کے لیے اٹھلائی۔

(الیں۔ امتیاز احمد۔ کراچی)

”تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتی ہو؟“

”میں تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ میری یقین دہانی پر وہ مطمئن ہو گئی۔ اٹھایا سے ہر دوسرے تیسرے دن اس کے می پاپا کا فون آتا رہتا تھا۔ اس نے ان سے اپنے خواب کا ذکر کیا اور نہ امریکہ سٹل ہونے کا۔

میرے اپنے دو بھائیوں کے علاوہ اور بہت سے رشتہ دار امریکہ میں تھے۔ ان کی بھاگ دوڑ سے پوچھا کو ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا تھا۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پی ایچ ڈی سکالر۔

میں اٹھایا نیو یارک سے فارغ ہو کر نیویارک آ گئی اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی۔ پوچھا ابھی بلومینٹن میں ہی تھی۔ اس سے ہر روز رات کو بڑی

میرے میاں کے اور بھی بہت سے کلاس فلوز ریڈیٹری کرنے امریکہ آئے۔ ڈاکٹر عمران نے پوجا کو میرے گھر ہی دیکھ کر پسند کر لیا اور پرپوز کر دیا اور یوں میں نے اور ممتاز نے بھاک دو دو کر کے تیار کر لی اور پوجا کی شادی ڈاکٹر عمران سے کر دی۔ میری رہائش کونستیز میں تھی اور پوجا اور عمران کی مین جینن میں۔ ہر ویک اینڈ ان کے ساتھ گزرتا۔ میرا پیدا ہوا تو پوجا کے ہاں بیٹی خدیجہ پیدا ہوئی۔ پوجا نے اپنے بھی پاپا کو اپنی سادی کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے معلوم اپنے اسلام قبول کرنے کی بات کوئی کر دی۔ اس کے بھی پاپا کو صرف یہی پتہ چلا کہ پوجا کو کسی پاکستانی ڈاکٹر سے محبت ہو گئی تھی اور اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی۔

خلاف توقع اس کے مئی پاپے نے کسی تاریخی کا
ظہار نہ کیا بلکہ بڑی فرادعی سے یہ جرس کو خوش کا
ظہار کیا اور اس کو ڈھیر سارے تحائف، جیولری،
پکڑے اور کچھ کچھ بھی بھیجا جو اس نے ڈاؤن دے
کر نیروشل NEW ROCHELLE میں اپنا
رہائیت ہاؤس لے لیا۔ اس نے اسلامی قبول کرنے
کے بعد جلد پہنچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ علیاً کہن کر
سے ملتے سے اس کا بار دوستی، بہت باقاعدگی
نے نماز پڑھی اور قارئین وقت میں اسلامی کتب
پڑھتی تاکہ اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ
جان سکے۔

یا کیزہ کی شوخی اب سنجیدگی ہے بدل گئی۔

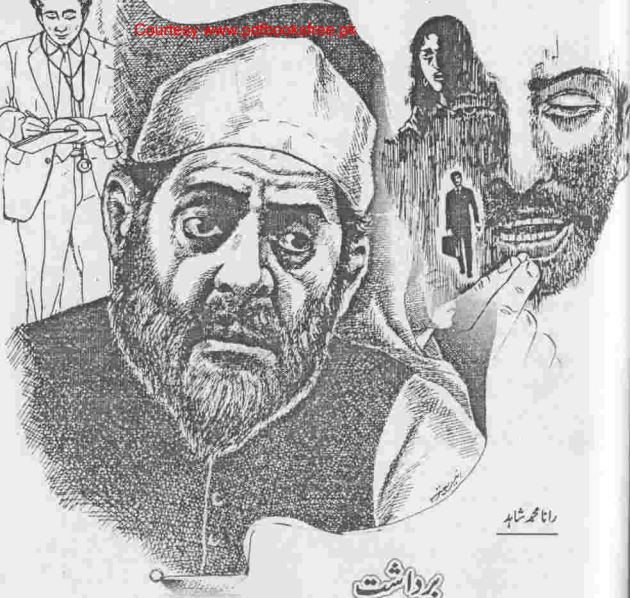
میرے دوسرے بیٹے کی پیدائش کے تین ماہ بعد وہ بھی ایک پیارے سے بیٹے محمد کی ماں بن گئی۔ میں اکثر اس کو اعتماد میں لے کر پوچھتی۔

”پاکیزہ تم خوش تو ہونا؟ عمران بہت اچھا انسان ہے وہ تمہیں خوش تو رکھتا ہوگا۔“

”ہاں میں بہت خوش ہوں۔ میں زندگی میں جو مجھے کرنا چاہتی تھی وہ کر رہی ہوں اور آگے بھی کرتی ہوں گی۔ میری زندگی میں کوئی پچھتاوا یا ندامت نہیں ہے۔“ اس کے چہرے پر سکون اور طمانیت تھی۔
 ربا توں میں سچائی۔

بچوں کو اچھی تربیت دینے کی خاطر اس نے
 زمرت چھوڑ دی۔ دونوں بچوں کو اسلامی سکول
 مل کر دیا۔ چار سال تک اس نے دونوں بچوں کو
 قرآن پاک حفظ کروایا یعنی کجواب اور سارف
 اپنا تبار شروع کر دیا۔ پاکیزہ جتنی اچھی مسلمان بنی اس
 نے مجھے اندازہ ہوا کہ جو لڑکے پڑھ لکھ کر اسلام کے
 ارے میں داخل ہوتے ہیں وہ بہت بہترین
 مسلمان بننے ہیں اور جو مسلمان کھڑوں میں پیدا
 ہوتے ہیں وہ اکثر برائے نام ہی مسلمان ہوتے
 ہیں۔ پاکیزہ مجھ سے بہت بہتر مسلمان ہے۔ اس کا
 اسلام کے بارے میں مطالعہ اور معلومات بہت زیادہ
 ہیں۔

پچھلے سال وہ حج کر کے آئی تو میں اس کو مبارکباد دینے لگی۔ اس کے چہرے پر یوں کی مسرت تھی اور آنکھوں میں ایمان کی روشنی اور اسلام کی چمک تھی۔ مجھے ہوا رک آئی۔ میں تو آنرز رول کے ساتھ یونیورسٹی سے گرجا نہ ہوئی تھی مگر میرے مقابلے میں جو اسلام قبول کر کے اور اپنی بہتر میں مسلمان بن کر پاکیزہ کو اللہ تعالیٰ نے آنرز رول دیا اس کے سامنے تو میری ڈگریاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ پوچھا ایم ایس اے میں تو آنرز رول نہیں لے سکی تھی مگر اس کو اسلام کے دائرے میں داخل کر کے اللہ تعالیٰ نے جو آنرز رول HONOUR ROLL دیا تھا وہ بہت کم خوش نصیبوں کو ملتا ہے۔



برداشت

”تو کیا آپ کے بھائی کا ذہنی توازن.....“ میں نے کہا تو عنایت بھائی فوراً بولے: ”تو کیا ہوا، وہ میرے ساتھ رہے گا..... میں اس کا یہاں علاج کراؤں گا۔“ عنایت بھائی کے لہجہ میں اپنے پچھڑے سے بھائی سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کا عزم بھی تھا۔

ایک شخص کی کتا جو غیروں کے ستم بہتا رہا لیکن اپنی کاظم سہہ نہ سکا!

میں چاچا غلام رسول کی اخبارات کی ایجنسی پر کھڑا ملازمت کے اشتہارات دیکھ رہا تھا کہ شاید میری قسمت کا دروازہ کھل جائے اور مجھے کہیں اچھی جگہ ملازمت مل جائے کہ اسی لمحے کسی نے میرے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”عنایت بھائی آپ.....“ میں نے پیچھے دیکھ کر کہا۔ ”جی فہم میاں! مایوس نہیں ہوتے.....“ انہوں نے شاید میرا چہرہ بڑھ لپکا تھا۔ ”اللہ کے ہاں دیر ہے،

اندھ نہیں۔ انشاء اللہ! تمہیں جلد ہی کسی اچھی جگہ نوکری مل جائے گی۔“ پھر مدھر میرے ساتھ ہی اخبار پڑھنے لگے۔

میں انجینئرنگ کے بعد فارغ بیٹھا تھا۔ انجینئر بنے گا 10 ماہ گزر چکے تھے مگر کسی اچھی جگہ ملازمت نہیں ملی تھی۔ عنایت بھائی ہمارے محلے ہی میں رہتے تھے۔ مجھ سے 30 سال بڑے تھے۔ مجھے ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی کہتے۔ بے حد نیک اور ہمدرد انسان تھے۔ اس دنیا میں تنہا تھے۔ ان کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ ماں باپ عزیز رشتے دار بھی قیام پاکستان کے وقت چاندھر سے ہجرت کرتے ہوئے راستے میں مارے گئے۔ وہ صرف اس صورت میں بچ گئے کہ اپنے رشتہ داروں اور مسلمانوں کی لاشوں کے نیچے دب گئے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اس کو سن گئے۔ اپنا پورا خاندان قیام پاکستان کے وقت گوانے کے باوجود بھی اب بے حرف شکایت نہ لاتے حالانکہ انہیں بعد میں زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے کبھی کسی دکان پر ملازمت کرنا پڑی اور کبھی پچھروں کے پاس ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھے رہے۔ کہہ سکتے تھے کہ ابھوں کی اتنی زیادہ قربانیاں کے بعد مجھے کیا ملا؟ لیکن عنایت بھائی بڑے فخر سے کہتے کہ ان کا خاندان پاکستان کی محبت میں قربان ہو گیا اور پھر پاکستان پیپٹے کے بعد انہیں ناقابل یقین خوشی اس وقت ہوئی جب انہیں ان کا سچا بھائی مل گیا لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی مسلم لیگ کے ایک مجلس میں شرکت کرتے ہوئے فائرنگ ہوئی۔ کچھ افراد زخمی ہوئے۔ آخر آخری پھیل گئی اور پھر ان کا بھائی ان سے پچھڑ گیا جس کا آج تک پتا نہ چلا۔

مجھے بھی وہ اپنا بھائی ہی سمجھتے تھے البتہ ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے پچھڑے بھائی کو مل لیں۔ میں بھی پھر عہدہ ان کے

بھائی کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن اسے ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ان کے بھائی کی ظاہری پہچان یہ تھی کہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے تیر نما داغ تھا جو ہجرت کے وقت تلوار یا خنجر وغیرہ کی نوک سے لگا تھا اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ یہ نشان مضبوط ہو گیا۔

چونکہ عنایت بھائی نے اپنا سارا خاندان اس وطن کے لیے قربان کر دیا تھا اس لیے وطن سے محبت ان کے خون میں شامل تھی۔ صرف زبان ہی دعوے نہ تھے۔ پاکستان کے خلاف بات سننے تو سختی سے روک دیتے اور کہتے کہ آج جو مسائل ہمیں نظر آ رہے ہیں۔ یہ ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ ہم اس کا اہرام فوراً اپنے ملک پر ٹھوپ دیتے ہیں۔ دنیا کے کس ملک میں مسائل نہیں ہیں لیکن وہ لوگ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور ملکی سطح پر سوچتے اور کام کرتے ہیں اسی لیے وہ ہم سے ہر لحاظ سے آگے ہیں۔ ہمیں بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں ذاتی مایوس ہونے کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے حد مفادات کو چھوڑ کر اجتماعی مفادات پر سوچتا اور کام کرنا ہو گا۔ پھر ہم بھی دنیا میں اپنی برتری ثابت کر سکیں گے۔

عنایت بھائی کی یہ باتیں مایوس لوگوں کے لیے امید افزا تھیں۔ محلے کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ خصوصاً میری عمر کے روزانہ تقسیم پاکستان کے واقعات سننے کے لیے روزانہ شام کو ان کی چوپال کا رخ کرتے تھے۔ ان کی باتوں نے انہیں محلے کی ہر دھڑ پر شخصیت بنا دیا تھا۔

مجھے عنایت بھائی سے خاص انس تھا۔ اتنے عرصے تک نوکری نہ ملنے کی وجہ سے میں بہت دلیرا دشتہ تھا۔ حتیٰ کہ اکثر جذبات میں آ کر اپنی ڈگریوں کو آگ لگانے کا بھی سوچا۔ میرے پریشان کن دور میں صرف عنایت بھائی تھے جن کی باتوں

اقوال زریں

☆ بغیر جرات اظہار کے سچائی ممکن نہیں اور سچائی کے بغیر نیکی کا تصور محال ہے۔
☆ بعض انسانی حقوق اتنے بنیادی ہوتے ہیں کہ ان پر پابندی لگانے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

☆ نظریات کی صداقت کو اسکے نتائج سے ہی چکھاتے ہیں۔ اگر عملی پہلو سے ایک نظریہ کارآمد ثابت نہیں ہوتا تو وہ صداقت سے عاری ہوتا ہے۔
☆ بادشاہ ایک بازار کی طرح ہوتا ہے جہاں تاجر وری سامان لے کر آتا ہے جس کی وہاں مان گہو۔ انسانی ذہن ایک بہت بڑا جزل سور ہے جہاں ہر نوع کا سامان داخل ہے۔ سوال

صرف یہ ہے کہ آپ کو کیا چاہیے، غلطی، پیارا یا منافقت، جو مانگیں حاضر ہے۔ راجہا کا مطلب صادق ہونا چاہیے۔ اوپر والے منافقت اختیار کریں تو رعایا کو کس پاؤں سے کتے نے کانا ہے کہ وہ اخبار غلطوں کرتی رہے۔

☆ معاشرے اور شرعی قوانین یا نقد کی مثال جسم اور لباس کی سی ہے۔ زندہ جسم ارتقا پذیر ہوتا ہے اس کی ضرورت اور موسم کے مطابق لباس بھی تغیر پذیر ہے۔ اس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ لباس کی فٹنگ کے مطابق انسانی جسم کو نہیں کانا جاسکتا۔ جو لباس کبھی نہیں بدلتا ہے وہ فتن ہے۔ وہ صرف مردہ جسم پر ہی فٹ آتا ہے۔ زندہ جسم وقت کے ساتھ پرانا لباس بدلے گا۔ اگر جسم کو زیادہ مضبوط جیکٹ پہنا دی جائے تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

نے مجھے ایک ناعزم اور حوصلہ شکن۔ مجھے مایوسی اندھروں سے نکال کر امید کی روشنی عطا کی۔ عنایت بھائی کہا کرتے تھے وہ شخص بڑا بد بخت ہے جو اپنے مالک حقیقی کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہو کیونکہ میری رحمت سے تو بس کا فری مایوس ہوتے ہیں۔ انسان کو کسی حال میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کسی دانا کا قول ہے: ہر چیز جب ظاہر ہوتی ہے تو چھپتی ہوتی ہے پھر بڑی ہو جاتی ہے سوائے مصیبت کے۔ کیونکہ وہ بڑی ظاہر ہوتی ہے جو چھپتی ہو جاتی ہے۔ ہر حال مصیبت یا پریشانی کشی ہی بڑی کیوں نہ ہو وہ اللہ کی رحمت سے چھپتی ہی ہوگی۔ اس لیے انسان کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔

ایک شام میں اپنی بیٹھک میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میں نے نوکری سے دیکھا عنایت بھائی محلے میں محلے کے لوگوں سے ملنے لے رہے تھے اور عطف توقع ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے حد خوش ہیں۔ میں بھی گلی میں آ کر عنایت بھائی سے ملا اور خوشی کی یاد رفت کی تو وہ بولے: ”بہت زیادہ خوشی ملی ہے فہیم ماما“

”کیا خوشی ملی ہے؟“ میرا تجسس نمایاں تھا۔ عنایت بھائی چند لمبے خاموش رہے پھر بولے: ”میرا پچھڑا بھائی مل گیا ہے۔“
”کیا واقعی..... مگر کیسے؟“ میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

”وہ لاہور کے علاقے والٹن سے مل گیا ہے۔ میرے ابا کے دوست تھے۔ ان کا بیٹا میرا بھی دوست تھا۔ یہ لوگ لاہور کے ایک پوش علاقے میں رہتے تھے۔ ایک دن وہ کسی آدمی کے ساتھ پاگل خانے گیا تو اس نے فوراً مجھے فون کر کے اطلاع دی کہ تمہارا



رسول مبین

پارسل ہاتھ

راؤ تانگل نامید ہو گیا۔ اس نے اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا۔ دنیا میں اس کو بھاری محسوس ہونے لگی۔ وہ ہر چیز سے تنگ آ گیا۔ وہ پانی کے لیے انتظار دیتا تھا کہ اگر وہ اپنے آسودہ کو بیج کر کے ایک معصوم بچے کے منہ میں ڈال دیتا تو بچہ اس کی الفاظ دہراتا کہ ”امی اچھے اور بچے نہیں چاہیے میری بیاسا بچہ کی“۔

ایک شخص کی کہانی جو پوری ہستی کی امیدوں کا ٹھکانہ تھا، سندھی ادب سے انتخاب

چکا تھا۔ ہر ایک کی آنکھیں آسمان میں جمی ہوئی تھیں۔ ”ابھی بارش پڑنے والی ہے۔“ ہر ایک کے کیوں پر بس ایک ہی جملہ تھا۔ صرف ایک دوسرے کو دلداری دینے کے لیے۔ چھوٹے بچوں کی آہ و بکا کو کم کرنے

داؤ گزشتہ دو دن سے بیاسا تھا۔ اس نے پانی کو کھینچا تو کیا، دیکھا کچھ نہیں تھا۔ یہ کچھ کوہستان میں گزشتہ برس سے بارش نہ پڑنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ بھیلوں میں جمع کیا ہوا پانی ختم ہو

پوچھ ڈالے۔ ظاہر ہے یہ میری بے چینی تھی۔
”بس بیٹا! عنایت بھائی کا پوچھ کر کیا کرو گے۔“ ان کے چہرے پر گہری پریشانی دیکھ کر میں بھی رنجیدہ ہو گیا۔
”مگر اگلے بتائیے تو کسی وہ کیسے ہیں۔ اور اب کہاں ہیں؟“
”بیٹا عنایت بھائی پاگل ہو گئے ہیں۔“ بزرگ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
”مگر... کیسے؟“ وہ تو... ان کا تو بھائی پاگل... پھر وہ کیسے؟“ میں بے ربط بولتا گیا۔
”صل میں یہاں سے جانے کے بعد عنایت بھائی تین دن تک اپنے بھائی کے ساتھ رہے۔ جو پچھلے دن وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر مارکٹ گئے تاکہ کچھ فروغ ہو جائے اور اس ٹھکانے زدہ ماحول سے کچھ دیر کے لیے آزادی ملے۔ مارکٹ کے مین چوراہے سے وہ سڑک کراس کر رہے تھے کہ ایک گاڑی میں سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی جس کی زد میں عنایت بھائی کے چھترے بھائی اور تین حزیہ افراد آ گئے۔ عنایت بھائی اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکے۔ ان کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ اب اپنے بھائی کی جگہ پاگل خانے میں...“

اتنا کہنے کے بعد بزرگ کی آواز بھرا گئی، شدت غم سے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔
اور... میری کیفیت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لپو نہیں۔ ایک لمحے کو میرے دماغ میں آنسوئیاں ہی چلنے لگیں۔ میں گھر آ گیا۔ خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ آنسوؤں کی جھڑی سی لگ گئی۔ عنایت بھائی تو بڑے حوصلے والے تھے۔ اپنا سارا خاندان گنوا کر بھی ہمت اور استقامت کا کوہ گراں بنے رہے۔ ہاں شاید مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون برداشت نہ کر سکے۔

بھائی تو یہاں ہے۔ بہت کمزور ہو گیا ہے۔“
”تو کیا آپ کے بھائی کا ذہنی توازن...“ میں نے کہا تو عنایت بھائی فوراً بولے: ”تو کیا ہوا، وہ میرے ساتھ رہے گا۔“ میں اس کا یہاں علاج کراؤں گا۔“ عنایت بھائی کے لہجے میں اپنے چھترے بھائی سے ملنے کی خوشی کے ساتھ ساتھ اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کا عزم بھی تھا۔
”لیکن ایک بات بتائیے کہ آپ کے ابا کے دوست کے بیٹے نے آپ کے بھائی کو پچھانا کیسے؟“ میرا تجسس نمایاں تھا۔

”یہ سب دیکھ رہے ہو۔“ عنایت بھائی نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا جہاں پر سیاہ رنگ کا تلی نمایاں تھا۔ ”ایسا ہی تلی میرے بھائی کی گردن پر بھی تھا۔ پھر بچپن میں اس کی شوڑی کے نیچے گہرا دشمن آیا تھا جو نشان چھوڑ گیا۔ یہ نشان کفر ہونے کے بعد مجھے اعزاز ہو گیا کہ میرا بھائی مجھے مل گیا ہے۔“
عنایت بھائی کی خوشی ویدنی تھی، کیوں نہ ہوتی۔ برسوں بعد ملنے والے خون کی خوشی ہی ایسی ہوتی ہے۔ اگلے دن عنایت بھائی لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں اور بھلے والے انہیں الوداع کہنے پر ریلوے سٹیشن تک آئے۔

اس کے بعد کافی دن تک عنایت بھائی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ میں بھی اپنی ملازمت کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ ہر روز گاڑی چڑھتی ہی ایسی ہے کہ بھگھر کی اور چیز کی خبر نہیں رہتی۔ معاشی پریشانی ہو تو پھر کون یاد رہتا ہے۔ خبر خیر تین ہفتے گزر گئے اور عنایت بھائی کا کچھ پتا نہ چلا تو میں نے ایک اتوار اپنے بھلے کے ایک بزرگ جو اکثر عنایت بھائی کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے، سے پوچھا: ”اگلے عنایت بھائی سے کوئی رابطہ ہوا۔ اب وہ کیسے ہیں؟“ ان کا بھائی کیسا ہے؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات

کے لیے ہر ایک نے آنکھیں اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف پکار کر خدا سے اپنا حق مانگا۔
 ”اودھنایا! ان بادلوں کو کھم کھم سے کہ ہر داری پیاس بجھائیں۔۔۔۔۔ اودھنایا کھم۔۔۔۔۔ کھم بادل نہیں ہے۔ آسمان کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کی گردنیں جھک گئیں اور انہوں نے امید ہو کر آنکھوں کو نیچے جھکا دیا۔
 کوہستان میں دور دور تک سانس لیتی ہوئی چیز کا نام و نشان تک نہ تھا، سوائے اس قبیلے کے جو خود وہاں سے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ دوسرے کبھی کوہستانی آہستہ آہستہ وہاں سے اٹھ گئے تھے، اور یہ لوگ ابھی تھوڑی سی آگ لگائے آسمان کو تک رہے تھے۔

داتو کا خاندان بھی اس قبیلے میں سے ایک تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بچوں کے اندر دھنسنے ہوئے پیٹ اور بے آواز گلوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے من ہی من میں یہ بات ٹھان لی کہ وہ کہیں نہ کہیں سے اپنے بچوں کے لیے روٹی اور پانی ڈھونڈ کر ضرور لائے گا۔ یہ سوچ کر وہ درود غنیے آکا کش کے پیچھے گم ہو گیا۔ لوگوں کو اس سے کبھی امیدیں وابستہ نہیں کیونکہ وہ قبیلے والوں کا روحانی پیشوا تھا، اور ان کو یقین تھا کہ خدا داتو کو خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔

اور آج داتو وہ دن سے کوہستان کی بلندیوں اور پہاڑیوں میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے خدا سے اپنے کئے ہوئے گناہوں کی معافی مانگی۔ اس کے قہر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ وہی پیاس، وہی خون آشام کے دانتوں کی طرح ابھرے ہوئے پہاڑ۔ نظر کی حد تک پھیلے ہوئے ریگستانی ہواؤں کے گرم جھوکے۔ داتو نے تتر ہوا میں پھر پھرائی ہوئی اپنی چادر کے کونے کو گردن میں لپیٹ کر تاقیو کیا اور نیم کھلی آنکھوں سے کسی تباہ کی طرح

ندیایں نہیں گی۔“

اس کے اندر سے بھرے ہوئے جوش سے اس کے ناک اور منہ کی چھڑی لرز رہی تھی اور اس کی آنکھیں زور سے بند تھیں۔ ہاتھ آکا کش کی طرف بلند تھے۔

اچانک دور سے سفید بادلوں کی چوٹیاں بلند ہونے لگیں جو آتش پہاڑ کے دھوئیں کی طرح آگے بڑھ کر آسمان پر قبضہ کرنے لگیں۔ داتو نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کے من کے ایک کونے میں خوشی نے سر اٹھایا لیکن اس نے جان بوجھ کر اس کو دبا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ خوشی کے اس بھرپور احساس کا میری دعاؤں پر کچھ اثر نہ پڑے اور ایک بار پھر وہ آنکھیں بند کر کے دعا مانگتا رہا۔ آہستہ آہستہ خوشی اس کے جوش پر غالب آگئی، اس کے دل نے چاہا کہ وہ آنکھیں کھول کر خوب قہقہے مارے اور ان اُبھرتے ہوئے بادلوں سے دل بھائے، جن میں پانی سے سسکی

ہوئی اس کی قوم کی روح سمائی ہوئی تھی۔
 داتو کی رگ رگ میں نشہ چھا گیا، اس کے اندر جیسے برف کا ٹھنڈا طوفان آ گیا جس سے اس کا کلیجہ پھنسا جا رہا تھا۔ داتو نے خوشی سے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اس کے سامنے کچھ نہ تھا۔ کچھ دیر پہلے بڑھتے ہوئے سفید بادل ہواؤں میں بکھر کر گم ہو چکے تھے۔ داتو کی حالت اس ماں کی سی ہو گئی جس کا بچہ ابھی اس کے سامنے کسی پھٹتے ہوئے پہاڑ کے کسی بڑے سے قوے کے نیچے زندہ دفن ہو گیا ہو۔ اس کے سارے خیال ریزہ ریزہ ہو کر اس کی امیدوں پر گرے اور اس کی کبھی خوش فہمیاں دب کر ختم ہو گئیں۔ خدا پر سے تھوڑی دیر کے لیے اس کا اعتقاد اٹھ گیا۔ تا امید ہی نے اس کے مقصد کو اس قدر بھجھوڑا کہ وہ خوشی پر آباد ہو گیا۔ اس کے دل نے چاہا کہ وہ اس پہاڑ پر سے چلا جاگ لگا کر نجات حاصل کر لے۔

یہ سورج کر داتو کے چہرے پر مسکراتا دوڑ گیا لیکن اس کی ماری امیدیں اس کی دعاؤں کی طرح کھوکھلی تھیں۔ داتو ایک بلند پہاڑ پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھوں کو اوپر بلند کر کے گھٹنوں کو جھکے دیا۔ داتو اپنے جود کو قدرت کے ترازو میں پالی کی چند ہندوں کے عوض تولنے کے لیے تیار ہو گیا۔

”ایا میری لاش میں جنگلی پرندوں کی چونچیں ہوں گی یا تیرے برساتے ہوئے پانی سے کوہستان میں

لیکن اس کی قوم جو امیدوں کا جھنڈا لیے اس کے
انتظار میں کھڑی تھی اس کا کیا ہوگا؟

اور یہ سوچ کر داتو رو پڑا۔
”کیا کروں..... میں اپنے مقصد کو کس طرح عملی
جامہ پہناؤں، میں تیرا دوپھوڑ کر اور کس کی دہلیز پر جمہ
کروں؟“

کوہستان کی خاموش وادی میں داتو کے رونے کی
آواز دھوپ میں تپتے ہوئے پہاڑوں کا دل کزور کرنے
لگی۔ نوجوان بیٹوں کے طعنوں سے منہ موڑ کر بوڑھے
باپ کے ریزہ ریزہ دل کی طرح خاموش پہاڑ بھی داتو
کے ساتھ سسکیاں بھرنے لگے لیکن بارش نہ ہوئی۔
بہت سے دن بیت گئے، داتو خدا کو پکارتا رہا لیکن روز
قدرت کی جانب سے خاموشی۔ سفید بادل منہ نکال کر
اس کے فونے ہوئے دل پر قبضہ لگا کر چھپ جاتے۔

داتو بالکل نامید ہو گیا۔ اس نے اپنا قوم کو اس کی
قسمت پر چھوڑ دیا۔ دنیا میں اس کو بیزاری محسوس ہونے
لگی۔ وہ ہر چیز سے نکل آ گیا۔ وہ پانی کے لیے انتظار دیا
تھا کہ اگر وہ اپنے آنسوؤں کو جمع کر کے ایک معصوم بچے
کے منہ میں ڈال دیتا تو بچہ قبضہ لگا کر اپنی امی کے سینے
سے چپٹ کر بس یہی الفاظ دہراتا کہ ”امی مجھے اور کچھ
نہیں چاہیے میری پیاس بجھ گئی۔“ بہت دنوں کی پیاس
تھی ابھی داتو کے گلے میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ
وہ بلند آواز میں پانی کے لیے نکار سکے۔ وہ اپنے دونوں
لب الگ کر کے کچھ کہتا چاہتا تھا لیکن آواز کے بجائے
اس کی زبان اس کے خشک تالو سے جا لگتی۔ داتو نے
سوچا کہ کیا یہی ہے وہ زندگی جس کے لیے انسان کو بنایا
گیا تو کیا یہی ہے وہ دنیا؟ قدرت کی محتاج دنیا کہ اسے
پانی کی ایک بوند بھی خدا سے مانگی پڑتی ہے۔

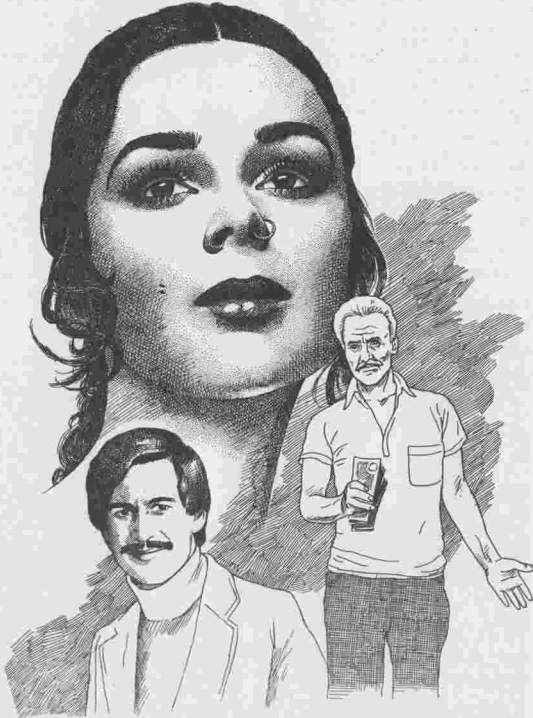
داتو اپنے ذہن میں باغی خیالات کو ختم دیتا رہا۔
اس نے اپنے کو کسی دوسرے کے ہاتھوں میں محسوس
کیا حالانکہ اس کا جسم اور بازو ہر قسم کی ڈوری سے

آزاد تھے لیکن پھر بھی اس نے اپنے آپ کو اس آذنی
ہوئی چنگ کی طرح محسوس کیا جس کی ڈور نہ جانے
والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ہر
دور میں کزور نظر آتا لیکن آج اس کے ذہن میں باغی
خیالات ابھر کر کھڑے ہو گئے تھے۔ آخر وہ گلزشت
کچھ دنوں کی افرا تفری کا رد عمل تھا یا خدا سے
مکر کرتے اپنے کا ایک طریقہ جیسے خدا اس کے بدلنے
ہوئے اندازوں کو دیکھ کر کچھ رحم کھائے، بارش
برسائے۔ انچاک داتو کو ایسا محسوس ہوا جیسے سورج
کے آگے کوئی بڑا دیو آ گیا ہو۔ گرمیوں کی دھوپ میں
چلتے ہوئے پہاڑوں پہ جنت سا ٹھنڈا عکس چھا گیا۔
”اس نے گردن اوپر اٹھا کر دیکھا۔ بادل تیزی سے
سارے آکاش پر چھا رہے تھے۔ داتو نے پہلے اس کو
قدرت کا خدائی سمجھا اور اس کے دل میں کوئی بھی
خوشی نہیں جاگی لیکن دھیرے دھیرے اس کو یقین آ
گیا کہ بارش ضرور آئے گی۔ ایک بار پھر خوشی اس
کے سن میں بسنے لگی۔ خدا کے خلاف اس کے باغی
خیالات خوشی کے طوفان سے اڑ گئے۔ داتو نے ہاتھ
باند کر کے خدا سے اپنی گمراہی کی معافی مانگی۔ بادل
آہستہ آہستہ سارے آسمان پر پھیل گئے۔ ہر سمت
بہاری شام سا منظر محسوس ہونے لگا۔ بھورے رنگ
کے پہاڑ جن پر پہلے دھوپ کا عزمائیں سوار تھا اب
ان میں جیسے روح کی گردش شروع ہو گئی۔ داتو کے
آگے اس کی قوم کے مسکراتے ہوئے کھڑے محسوس
ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے نظر آئے جو
برسات کی بوندوں میں اپنے بڑے ہوئے شگے
ڈھانچے نکال کر نہا رہے تھے۔ خوشی میں چھلانگیں لگا
کر کھیل رہے تھے۔

”ہمیں بارش ہوئی..... ابھی بارش ہوئی..... خدا
تمہارے لاکھ شکرانے..... خدا تم عظیم ہو۔“ واویلوں
میں سے آوازیں آنے لگیں۔

ایک نواز خان

دولت



ہاتھوں میں بلند کر کے نیچے پھرتی زمین پر بہت زور سے دے مارا۔ ایک بہت بڑا دھماکہ وادی میں گونج اٹھا اور پتھر ٹوٹ کر بڑے بڑے ہو گیا۔ داتو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ایک اور بڑا پتھر اٹھا کر زمین پر دے مارا اور پھر دیوانہ وار پتھر اٹھا اٹھا کر زمین پر مارتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے پانی رس کر باہر نکلنے لگا۔ داتو نے اس کو بھی قدرت کا مذاق سمجھا اور اس کے عمل میں شدت آ گئی۔ داتو دیوانوں کی طرح پہاڑوں سے لڑتا رہا۔ اس کی سانسوں میں بہت تیزی آ گئی۔ منہ سے جھاگ بننے لگی۔ جب وہ تھکا تو ایک پہاڑ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ جوش اور تھکاک کی وجہ سے اس کا انگ انگ کانپ رہا تھا۔ جب اس کو کچھ ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ مسلسل پتھر کھنڈروں کی جگہ سے پانی بہا رہا تھا۔ داتو کو یقین نہیں آیا لیکن اس نے آگے بڑھ کر اٹلی سے پانی کو چھوا تو اس کی اٹلی کو جیسے کسی نے ڈس لیا۔ غصہ برف جیسا پانی۔ داتو کے لبوں پر ایک غمگین مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کو اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ جب اس کی نظریں اپنے ہاتھوں پر ابھرے ہوئے لال چھالوں پر جا پڑیں تو اس کو اپنا ماسی ایک گالی محسوس ہوا۔ اس کو مقتدر اور قسمت بھی کو اس محسوس ہوئے اس نے ایک بار پھر لال چھالوں کو چومے بڑے بڑے پہاڑی پتھر اٹھا کر پانی نکلنے والی جگہ پر مارتا رہا۔ مسلسل پتھر مارنے سے پانی زمین سے تیزی سے نکلنے لگا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

داتو کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ وہ تیزی سے پیش قدمی کر رہا تھا۔

پانی اب ایک ندی کی صورت میں اس کی پستی کا رخ کر کے بہہ رہا تھا۔

دوب میں کام کرتے ہوئے مزدوروں کی چڑی جیسے کالے بادل بارش برسانے کے لیے آسمان میں تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ دنیا کی ہر چیز جیسے سانس روک کر اس کھڑی کا انتظار کرنے لگی۔

جب بارش کی پہلی بوند گرے گی تو ہر ایک چیز بکا کر جاگ اٹھے گی۔ ہر انگ میں مسیحا ساجائے گی اور پھر مسلسل بوندیں برسا شروع ہو جائیں گی۔ چمن چستا ہو جائے گی۔

”خدا بارش برساؤ..... خدا بارش برساؤ“ داتو کے اندر سے جیسے آوازیں نکلنے لگیں لیکن اچانک ہوا کا ایک تیز چوہا کیا آیا اور سارے بادل داتو کی خواہشوں کی طرح بکھر گئے۔ کائنات کی ہر ایک چیز نے غلطی سانس بھر کر آسمان میں بکھرے ہوئے کیسا کے پھولوں جیسے بادلوں کو دیکھا۔ ہر ایک کی حالت اس بھوکے فقیر بچے کی سی ہو گئی جس نے ہلکے ہلکے کر دینی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا ہو اور اس سے کوئی طاقتور فقیر مار کر چھین لے کیا ہو اور خدا فقیر جس نے پیٹ پر ہاتھ بچھ کر حسرت بھری نگاہوں سے طاقتور فقیر کو جاتے ہوئے دیکھا ہو۔

داتو کو اب مکمل یقین ہو گیا کہ قدرت اس کے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ اس سے زمین پر رہنے کا کرایہ وصول کر رہی ہے۔ اسے اپنی کمزوری پر بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنے آپ کو تیز ہواؤں میں اڑتی ہوئی تھکی کی طرح محسوس کیا۔ آخر وہ اتنا کمزور کیوں ہے؟ وہ کتنے دن پانی کی ایک بوند کے لیے رویا ہے؟ خدا کے سامنے اس نے ایک جگہ پر بیٹھ کر دعا میں مانگیں۔ آخر ان کا سبب کیا تھا؟ کیا مقدور تقدیر، نصیب یہ سب بکواس ہے؟

داتو غصہ میں اٹھا۔ اس کی رگ رگ میں جوش بھرا ہوا تھا۔

اس نے اٹھتے ہی ایک بڑے پتھر کو اپنے

کے پاس روپیہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اب وہ اس طرح پکھریوں میں ضائع ہوتا تھا۔ خبر استاد جھونٹ کا نام میرے ذہن سے نکلتا چلا گیا۔

ایک دن محرو نے مجھے آکر بتایا کہ ذیل داروں کے خاندان کا ایک آدمی جو، ان کا نوکر ہے ایک قتل کی اطلاع دینے آیا ہے۔ میں نے کہا کہ اسے لاؤ۔ میں نے اس آدمی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میرے سامنے آکر خالص ہندوانہ انداز میں پرنام کیا۔ اپنا نام پریم بتایا اور کہنے لگا کہ اس کے مالک ذیل دار تیار دھکے کے بیٹے جھونٹ کا قتل ہو گیا ہے اور وہ مجھے لینے آیا ہے۔ جھونٹ کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں نے اسے کہا، جھونٹ استاد؟ اس آدمی نے اقرار میں سر ہلادیا اور میرے کانوں میں بیٹیاں ہی بیٹنے لگیں۔

وہ خوبصورت جوان جھونٹ استاد آخر اس راہ پر چلا ہوا مارا گیا جس پر چل کر کسی نے آرام سکون نہیں پایا۔

میں نے تھانے سے دو تین آدمی ساتھ لیے اور پریم کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تھانے سے باہر ایک تانگہ نکلا تھا۔ پریم نے ہمیں اس میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ پریم ہمیں لے کر اس قصبے میں ایک بڑے سے گھر کے سامنے دگ کیمپ۔ ہم آڑ کر اندر جانے لگے تو اس نے اشارے سے ہمیں روک دیا اور خود تیزی سے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک باربک سمک باہر آگیا۔ اس نے تانگے کے پاس آ کر پرنام کیا اور اوپر چڑھ کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ میرا نام تیار دھکے سے جی! میرے نوکر پریم نے بتایا ہوگا کہ میرے لڑکے جھونٹ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک پڑے۔ بڑے مہر کرنے والے آدمی کی طرح اس کا رویہ تھا۔ پریم بتی مانتے

کھا آیا۔ جیل جا کر بدمعاشوں میں جوگی ہوتی ہے وہ بھی پوری ہو جاتی ہے اور وہ وہاں سے استاد بن کر نکلتے ہیں۔ جیل سے فارغ ہوا تو جھونٹ بھی استاد بن چکا تھا۔

اب اس کے حالی موالی اور جھجے اسے ذیل داروں کی نسبت سے نہیں بلکہ استاد کہہ کر بلاتے تھے اور اس نام سے میں بھی اسے جاننے لگا۔ میں جب اس علاقے میں آیا تو میرے محرو نے بدمعاشوں کا تعارف کرنا شروع کیا اور جو کہانی میں نے آپ کو سنائی ہے وہ مجھے محرو نے ہی بتائی تھی۔ مجھے بڑا شوق ہوا کہ اس جوان کو دیکھوں جس نے بچپن سے ہی بدمعاشی کا باقاعدہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

میں نے محرو سے کہا کہ کسی دن استاد جھونٹ کو میرے پاس لانا۔ ایک دن وہ اسے لے آیا۔ جھونٹ چہرے مہرے سے بھی بدمعاش ہی لگتا تھا۔ بچپن کی لڑائیوں کے نشان اس کے چہرے پر تھے۔ چھوٹ کے قریب قد بڑھ گیا ہوا تھا۔ اس کا ذیل ڈول کسی ہندو کی بجائے مسلمان کا نظر آتا تھا۔ وہ زیادہ تر ہندو مریل سے ہوتے تھے۔ میں اسے باتوں باتوں میں استاد کہتا تو وہ شرمندہ سا ہو جاتا۔ وہ تھا تو بدمعاش لیکن اس نے ابھی تک مجھے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے میں نے اسے صرف یہ تنبیہ کی کہ وہ میرے علاقے میں نہ میرے لیے اور نہ اپنے لیے مشکل پیدا کرے۔

وہ چلا گیا اور میں سوچتا رہ گیا۔ اتنا خوبصورت جوان آدمی ہے لیکن کس غلط کام میں لگا ہوا ہے۔ لیکن دولت کچھ نہ کچھ تو خرابی ضرور کرتی ہے۔ اس آدمی کے خاندان کے پاس روپیہ کی ریل جیل تھی۔ خود اس کا باپ ابھی خاموش زمین کا مالک تھا اور یہ جھونٹ اور ایک لڑکی اس کی اولاد تھے۔ اس

انکسٹوناز خان

دولت

اس نے اپنے خیال میں اچھا سودا کیا تھا، لیکن اسے یہ نہیں تھا کہ یہ اسے بہت مہنگا پڑے گا۔

ذیل دار آپس میں رشید دار تھے اور اس طرح اس علاقے میں ایک ہی خاندان بہت اثر و رسوخ والا اور طاقتور خاندان تھا۔ ان کے پاس پیسہ بھی تھا۔ مرد بھی کافی تھے۔ زمین بھی کافی تھی۔ ان گھروں میں سے ایک گھر کے آدمی کا دماغ خراب ہوتا شروع ہو گیا۔ کہتے ہیں یہ جب نوعمر تھا تو ماں باپ نے ضرورت سے زیادہ لاڈ کرنا شروع کر دیا۔ کبھی گاؤں کے کسی آدمی کے جانور زخمی کر دیتا۔ کبھی کسی مزارع کا سر پھاڑ دیتا اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ انہی حرکتوں کے ساتھ وہ جوان ہو گیا۔ اب اس کے گرد وادہ گرد اور اوہاں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اب وہ باقاعدہ بدمعاش بن گیا۔ ڈکیر سے پر اسلحہ بھی کر لیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے خبیرے میں ہوتا ہے وہ اپنے کسی جرم کی وجہ سے جیل کی ہوا

دولت انسانوں کا دماغ خراب کرتے دیر نہیں لگاتی۔ اگر یہ دولت کسی ایسے آدمی کے پاس ہو جس کا دماغ پہلے ہی خراب ہو تو پھر فساد بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے دیکھے ہیں جن میں انسانی دماغ کی اس خرابی اور دولت نے بہت سے لوگوں کو مذہب میں مبتلا کر دیا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو دولت ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت نہیں کرتے۔ میں جو واقعہ آپ کو سنانے لگا ہوں اس میں بھی میں نے ایسی چیز ایک بار پھر دیکھی کہ دولت اور دماغ کی خرابی کیا کل کھلاتی ہے۔ ان دنوں میں جہاں قیمتیں تھوڑا ہاں علاقے میں ذیل داروں کے دو تین گھر تھے۔ ان آدمی کے اور گرد کافی دور تک ان گھروں کی دھنیں تھیں۔ یہ

ہم اس میں داخل ہوئے تو اندر چند عورتیں تین کر کے رو رہی تھیں ان میں سے ایک عورت خاصی عمر کی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید جنوت کی ماں ہوگی۔

جنوت کی لاش چارپائی پر پڑی تھی جس پر ایک خاکی رنگ کا کھس بچھا ہوا تھا لیکن اکٹھا ہو چکا تھا۔ جیسے اس پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے کھس کرتے رہے ہوں۔ جنوت کے کپڑے اس کے اپنے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ سر سے پاؤں تک خون تھا۔ اس طرح کا قتل ایک ہی طریقے سے ہوتا ہے یعنی ٹوکے سے یا کلبھاڑی سے۔ میں نے قریب ہو کر لاش کا معائنہ کیا اور میرے خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ جنوت کو ٹوکے یا کلبھاڑی کے داروں سے قتل کیا گیا تھا۔ قاتل شاید ایک سے زیادہ تھے کیونکہ اپنے شواہد بھی مل رہے تھے کہ قتل کے بعد لاش کو ٹھنڈ کر چارپائی پر ڈالا گیا ہو بلکہ لگتا ہے تھا کہ جنوت جیسے چارپائی پر لیٹے لیڈ قتل ہو گیا ہے۔ وہ جوان آدمی تھا اور مرتے ہوئے تو مرل آدمی بھی مزاحمت کرتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مارنے والے ایک سے زیادہ تھے۔ انہوں نے جنوت کو لیٹے لیٹے ہی قابو کر لیا۔ جنوت مرتے ہوئے تڑپا ہو گا اس لیے اس کے پنجے کھس اکٹھا ہوا تھا۔

میں نے پرہیز سے کہا کہ تیارو کو میرے پاس لاؤ۔ وہ اسے لیٹے باہر چلا گیا۔ میں نے لاش پر چادر ڈال دی۔ تیارو آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں لاش ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دوں۔ اس نے میری بات نہ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ مرنے والا تو مر گیا۔ پھر پھاڑ کر وہی معلوم ہو گا کہ یہ قتل ہوا ہے؟ یہ تو کسی کو بھی نظر آ رہا ہے کہ اسے ٹوکے مارے گئے ہیں۔ تھانیدار صاحب یہ کام رہنے ہی دو تم یہ تلاش کرو کہ

میں بیٹھ چکا تھا اور تاکہ پھر چل پڑا۔ میں نے تیارو سے پوچھا یہ وقوعہ کس جگہ ہوا ہے؟

ہماری زمین پر۔ وہیں جنوت نے ڈبہ بنا رکھا ہے۔ وہ اس گھر میں نہیں رہتا (اس نے اپنے پیچھے اس مکان کی طرف اشارہ کیا جہاں سے ہم چلے گئے) آج صبح میں نے پرہیز کو گھر سے پرانے اور حلوہ بنوا کر جنوت کے ڈیرے پر لے جانے کے لیے کہا تھا۔ اس کو زور دینے کے میں کاموں میں لگ گیا۔ کچھ کام گھر سے باہر تھے لیکن میرا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

میں گھر ہی تھا کہ پرہیز واپس آگیا لیکن روتا پڑتا۔ اس نے بتایا کہ کسی نے جنوت کو قتل کر دیا ہے۔ جنوت کی ماں اور میں فوراً وہاں پہنچے۔ جنوت کی ماں ابھی تک وہیں ہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا میں پرہیز کو لے کر اس گھر واپس آیا اور اسے آپ کی طرف بھیج دیا۔ باقی آپ چل کر دیکھ لیں۔

وہ جس انداز سے باتیں کر رہا تھا اس سے وہ مجھے بڑے حوصلے والا معلوم ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ جب میں تفتیش شروع کروں گا یہ آدمی بڑے کام کا ثابت ہو گا۔ کیونکہ ایسے اعتماد والے لوگ ہر چیز پر نظر رکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں بڑے یقین سے کہتے ہیں۔

جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں کافی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ذیل دار کے قتل کا سن کر بھی لوگ جمع ہو گئے ہوں گے۔ ہم تانگے سے اترے۔ پرہیز ہمارے آگے آگے تھا۔ تیارو دھریک سے پیچھے چمکی ہوئی چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس سے صبح طرح چلا نہیں جا رہا تھا۔ پرہیز ہمیں (مجھے) اور سپاہیوں کو (ایک کمرے کی طرف لے جانے لگا۔

تھا۔ میں وہاں ڈیرے پر رہ رہ کر دیکھ چکا ہوں۔ روپے پیسے کی جسو کے پاس کوئی کی نہیں کی۔ ری کسی سے دشمنی کی بات تو ہو سکتا ہے کہ دشمنی ہی ہو اور پھر شیو کے بھائی بھی بہت افسرے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بہن کے ساتھ زیادتی پر قابو سے باہر ہو گئے ہوں اور انہوں نے جنونت کو پا کر دیا ہو۔

شکر نے جنونت کے بارے میں جو کہہ بتایا تھا وہ تقریباً میں اس کے بتانے سے پہلے ہی جانتا تھا۔ صرف اس نے نئی بات یہ بتائی تھی کہ جنونت کا اپنی بیوی سے بھگڑا رہتا تھا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی نے اپنے بھائیوں دیکر اور شیر سے اس کا ذکر کیا ہو جنہوں نے اشتعال میں آکر اسے ختم کر دیا ہو۔

مجھے اب شیو سے ملنا ضروری تھا۔ کبھی سوچ کر میں تیارو کے گھر چلا گیا۔ وہ لوگ اب جنونت کی آخری رسوم سے فارغ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تیارو کے ساتھ میں اس کے بیٹے کے بارے میں ہی باتیں کرتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ایک ایک بیوی سے زیادہ شیو خاندن کے بارے میں شون جان سکتا ہے؟ اس لیے میں شیو سے ملنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اکیلے شاید وہ تمہارے سامنے زبان نہ کھولے۔ تیارو سیانا آدمی تھا وہ سمجھ گیا اور اس نے شیو کو بلا کر میرے پاس بٹھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اس عورت کی اپنے خاندن سے لڑائی جتنی کم اور میں اسی بات کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی دشمنی رک چھوڑی۔

شیو مرنے والا تو چلا گیا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے تمہیں دشمنی رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر کوئی ایسی دیکھ بات ہے تو مجھے بتا دو۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟ جس کے بارے میں اس نے اپنے باپ کو بھی نہ بتایا ہو؟

شیو میرا سوال سن کر کافی دیر خاموش رہی پھر

وہ میرے آنے پر اعتراض نہیں کرتا تھا نہ ہر کوئی اس کے ڈیرے کی طرف جانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ میں نے جب بھی وہاں کوئی آدمی دیکھا ہے وہ شکل صورت سے ہی بدماش نظر آتا تھا اور اس علاقے کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ادھر ادھر سے جہاز پر پش یا بدماش لوگ اس ڈیرے پر یاری دیتی کے لیے یا بھر جینے چھپانے کے لیے آتے تھے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جنونت کی بدماشوں سے یاری دیتی تھیں۔

بہر حال جو بھی ہو جنونت کی اپنی بیوی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی بیوی اس کی ماں کی بہن کی بیٹی تھی اس لیے وہ گھر سے جاتی نہیں سکتی تھی بلکہ اپنی خالہ کے پاس پڑی ہوئی تھی۔ جنونت کا اپنی بیوی سے کیا بھگڑا تھا میں نے اس بارے میں چاچئی (جنونت کی ماں) سے کونج کی گئی۔ چاچئی کہتی ہے جنو دولت کا بچاریا بن چکا ہے اور اپنی بیوی شیو سے جس کا باپ زمیندار ہی ہے ابھی کمائی کرتا ہے ہر وقت یہی کہتا ہے کہ جاؤ اپنے باپ سے پیسے لے کر آؤ حالانکہ جنونت کا باپ تیارو اچھا خاصا امیر آدمی ہے۔ ان کے گھر دولت بھری ہوئی ہے اور جنونت ہی اس ساری جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے باوجود وہ ایسی بچہ حرکت کرتا تھا کہ اپنی بیوی کو تنگ کرتا کہ جاؤ باپ سے پیسے لے کر آؤ۔ چاچئی کا تو یہ خیال تھا کہ میں میرا نہیں خیال کہ اصل بات یہی ہوئی۔ اگر جنونت کی شیو جیسی خوبصورت بیوی سے لڑائی بھگڑا رہتا ہوتا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ چاچئی بھی مجھ سے چھپا رہی ہو۔ خبر بات کہ رہا تھا جو کی حرکتوں کی۔ وہ ڈیرے پر چار پائی پر پڑا رہتا تھا یا بندوں کے کر شکر کوکل جاتا تھا۔ روٹی پانی کے لیے ڈیرے پر بھی احتیاط تھا اور پرہیز گھر سے روٹی لے کر آتا

بھی ایک آدھ آدمی ایسا ہوتا ہے جس کی حالت کمزور ہوتی ہے۔ یہ آدمی فنگر بھی مانی لٹاؤ سے کمزور تھا۔ چونکہ اس کا ہر گھر میں آ جانا تھا اور رشتہ داری بھی تھی اس لیے وہ گھر کا عبیدی تھا۔ پولیس کے لیے اس طرح خبری نہیں کرتا تھا جس طرح دوسرے منبر کرتے ہیں لیکن پولیس کے کام آ جاتا تھا۔ اس میں جایزہ دارانہ اثر والی بات نہیں کی۔

میں اسے تھانے سے گھر لے گیا تاکہ ذرا دوشانہ ماحول میں وہ کھل کر بات کرے۔ میں نے اس سے صرف تیارو کے گھر کے حالات معلوم کرنے پر ہی زور نہ دیا تھا بلکہ جنونت کی یاری دوستیاں، دشمنیاں، لین دین وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھتا رہا۔ وہ جب جنونت کے بارے میں شروع ہو گیا تو میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اسی کی زبانی جنونت کے حالات سننا رہا۔

تھانے دار صاحب اس علاقے میں ہم ذیل داروں کی زمین نہیں جگہ ہے۔ ہمارے لڑکے اس وجہ سے بھوت جاتے ہیں۔ یہ جنونت ہے ہم جہاں کہتے تھے شروع سے ہی اکثر حراز آدمی تھے۔ وادھی موچھ پھوٹی تو بڑے کاموں میں نہ گیا۔ نہ پڑھا نہ لکھا۔ میں اٹھانا پینا اور آوارگی کرتا ہی اس کا کام تھا۔ انہی کاموں میں ایک بار جیل بھی ہوئی۔ تیارو کی یاریاں دوستیاں بھی اس کے لڑکے کو جیل جانے سے بچا نہ سکیں۔ جب ایک بار جیل ہو کر آیا تو وہاں اس نے جو سنگی پتلی بنائے تھے وہ بھی یہاں ہمارے گاؤں میں جسے کے ڈیرے پر آنے لگے اور اس کی بدشت زیادہ ہو گئی۔ جہاں جیل سے بکا مجرم بن کر نکلا تھا۔ اپنے گھریلی باپ کے گھر بھی بھار ہی جاتا تھا۔ اپنے ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ میں بھی کئی بار اس کے ڈیرے پر گیا ہوں۔

میری اس کے ساتھ رشتہ داری تھی۔ اس لیے

یہ کام کیسے بنے؟ تیارو پوسٹ مارٹر پر رضامند نہیں تھا۔ میں سپاہیوں کو لے کر کمرے سے باہر آ گیا اور ہم ڈیرے پر پہنچی چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔ غور میں کمرے میں رونے دھونے لگ گئیں۔ میں نے تیارو سے افسوس کیا۔ اس کے ساتھ قانونی کارروائی کی بات کی اور کہا کہ جب تم آخری رسوم سے فارغ ہو جاؤ گے تو میں تمہارے پاس آؤں گا۔ میں نے وہاں نقشہ وغیرہ بنایا اور تھانے آکر کاغذات مکمل کیے۔

پرہیز ہمارے ساتھ اپنی طرف سے رپورٹ درج کروانے آ گیا تھا۔ اسے فارغ کر دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ یہ کام کیسے ہو گا؟ میں نے خرد کو بلایا۔ یہ درمیانی عمر کا آدمی تھا بہت سیانا تھا اور تجربہ کار۔ بتیش اس کا نام تھا۔ اسے تجربہ کار لوگ تھانے داروں کے بہت کام آتے ہیں۔ بتیش بھی میرے ساتھ سر کھپاتا رہا پھر کہنے لگا کہ میں کوئی خبر لانا ہوں۔ اس طرح کی وارداتوں میں کئی چیزیں سامنے ہوتی ہیں۔ عورت، دولت، زمین، دشمنی اور جنونت جیسے بدماش کے معاملے میں ان میں سے کوئی چیز بھی ہو سکتی ہے۔ بعض چیزوں کے معاملے میں پرہیز سے زیادہ اچھا بیگزون ہوتا؟ میں نے خرد سے کہا کہ وہ پرہیز کو جا کر لے آئے۔ کافی دیر بعد وہ آیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ جنونت کی آخری رسوم ادا کر کے تم میرے پاس آ جانا۔ خرد تھانے سے چلا گیا۔ وہ جیسے کہ میں نے بتایا ہے کہ خرد بہت سیانا آدمی تھا۔ وہ ذیل داروں کا ہی ایک آدمی بکا پڑا۔ یہ آدمی اس امیر خاندان کا فرد ہونے کے باوجود غریب تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایسے اچھے گھرانوں میں

اور گھر کے مالک بائیں وفاقا درجہ کران سے دل کی بات بھی کر لیتے ہیں۔ شکر کی بات سن کر میں نے اسے فارغ کر دیا اور کہا کہ وہ بیگنی بات زیادہ تفصیل سے معلوم کر کے آئے۔ میں نے دوسرے دن ہی پریم کو بلا کر لایا۔ میں نے اسے کہا کہ اتنے دن ہو گئے ہیں تم نے ابھی تک کام کی بات نہیں کی مجھے پکڑ نہ دو اور جو کچھ تمہیں پتا ہے بتا دو۔ پھر وقت ضائع کرو گے تو مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔

پرتم ضرورت سے زیادہ عیوشار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے لگ گیا۔ میں نے مجبوراً منہ کا نام لیا۔ پرتم کو ایسے لگا جیسے اس کے ذہن پر لیزے نے کاٹ لیا ہو۔ اس کی یہ حالت بہت ٹھوڑی دیر اور وہ مکمل گیا لیکن اس کی حالت میں تبدیلی کے نوٹ نہ تھے۔ میں نے اب اسے ایک اور جھکا دیا۔

پرتم! اب تو کورن میں ایک خرابی مینی ہوتی ہے کہ تم بات کو سمجھنے میں بہت دیر کر دیتے ہو۔ اتنے دن تم نے منہ کا کوئی ڈھنکریں کیا حالانکہ کھر میں تمہاری مالکن اور نیو دونوں ہی اسے کوٹنے دیتی ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا ہے لیکن تم نے انہیں کوٹتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ منہ تپاؤ کے شرعے برادری کی لڑکی ہے اور اس کا باپ اور بھائی بہت اقرے ہیں۔ انہوں نے منہ کو جسونت کے ڈیرے پر جاتے دیکھ کر جسو کو اس دنیا سے ہی بچھ کر دیا۔

میری انہی کئی بات کے شروع میں پرتم کے چہرے پر جو رنگ آکر گر کر لیا تھا اب اس کا نشان بھی بائیں کئی باتوں کے بعد اب اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔ مجھے اس کی تبدیلی پر بڑی جراتی ہو رہی تھی لیکن اس وقت مجھے اس تبدیلی کی سمجھ نہیں آئی

؟ نہ؟ چونکہ رشتہ داری ہے اس لیے ان کے (تپاؤ) کے گھر بے دھڑک جاتا ہوں۔ برسوں میں گیا تو چاچی (جسونت کی ماں) اور نیو انہی بیٹی تھیں اور کسی عورت کو کون سی عورت جس کا نام وہ منہ لے رہی تھیں۔ اس عورت کی لڑکی منہ کا نام سن کر میں وہاں نکل گیا۔ اس نام پر چونک کر میری وجہ یہ تھی کہ میں جس منہ کا نام کی لڑکی کو جانتا ہوں وہ ہمارے ہی خاندان کی ایک لڑکی ہے اور تپاؤ کے شرعے کے برادری کی ہے۔ اس کا باپ اور اس کے بھائی بہت ہی اقرے ہیں۔ ان کی ایک ہی بہن ہے اور وہ ہے بہت مشکل صورت والی۔ چاچی اور نیو منہ کو اس لیے کون رہی تھیں کہ ان کے کہنے کے مطابق جسونت اب منہ کا نکلے گا نام بھی لینے لگے تھا اور انہیں کسی نے بتایا تھا کہ منہ کے ڈیرے پر بھی دیکھی گئی ہے۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ منہ کے ڈیرے پر جاتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ انہوں نے اپنی وہی بہن کو کچھ نہیں کہا لیکن جسونت کو پار کر دیا۔

شکر کا کہنا میرے لیے ایک ہی راہ ثابت ہوا کیونکہ اس کی بات میرے بھی دل کو لگی۔ جسونت کی ماں اور اس کی بیوی اگر کسی لڑکی کو کوٹتی ہیں اور اس کا قلع جسونت سے جوڑتی ہیں تو پھر ضرور کوٹنی لڑکی بات تو ہوگی اور جیسا کہ شکر کہہ رہا تھا کہ اس لڑکی کے باپ بھائی اقرے آری ہیں تو ایسی صورت میں قتل ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی اور مجھے کے علاقے میں کھسوں کے خاندانوں میں تو یہ بہت معمولی بات تھی۔ شکر نے جو بات سنی تھی وہ تو آؤنی ڈوئی ہی ہوئی کیونکہ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ایک دن اپنی کئی تپاؤ کے گھر گیا تو چاچی اور نیو بائیں کر رہی تھیں۔ اس لیے پوری بات کا علم اگر ہوگا تو پرتم کو کیونکہ لوکر چلے پھرتے بائیں سنتے ہیں

بعد نیو کے دونوں بھائیوں دلیر اور شیر سے بات کی۔ دونوں کو کوئی علم نہیں تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے خاص طور پر اس طرح پوچھ گچھ کر کہیں انہوں نے تو جسونت کو کھانکے نہیں لگایا لیکن وہ دونوں تو سرے سے اس بات سے ہی واقف تھے کہ ان کی بہن اور بھئی کے درمیان کوئی جھگڑا ہے بھی یا نہیں۔ اب یا تو پرتم ہی اصل بات بتاتا یا شکر کوئی ٹوہ لیتا۔ خود خود بڑی کچی تھی۔ اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ زبان بند کر چکی تھی یا اسے پتہ ہی نہیں تھا۔ بہر حال میں نے پرتم کے ساتھ پھر سر کھپا ضروری خیال کیا اور جسونت کے سالوں سے بات کر کے جب تھانے واپس گیا تو کچھ دیر آرام کے میں نے پرتم کو بلوایا۔ اپنے سامنے بٹھا کر میں نے اس کی طرف دیکھا تو پتہ نہیں لگتا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ اس ہندو کی شکل ہی مجھے مکار لگتی۔

”پرتم! میں تم سے بڑی رعایت کر رہا ہوں۔ تم مجھ سے بات نہیں سناؤ ہو جو سارے لوگ جانتے نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ جسونت اور نیو کے جھگڑے کی اصل وجہ کیا تھی۔ تم بھی اسی گھر میں رہتے ہو۔ یہ تو نہیں سکتا کہ تم نے کوئی بات نہ سنی ہو۔ رات مجھے تک سر کھانے کے باوجود پرتم نے کوئی خاص بات نہ بتائی۔ مجھے پتہ نہیں کیوں یہ شک ہونے لگا کہ یہ خود بھی اس قتل میں ملوث ہو سکتا ہے۔ فی الحال میرے پاس میرے شک کی کوئی خاص کوئی نہیں تھی۔ صرف میرا دل کہتا تھا اور میرا احساس بھی غلط نہیں ہوتا۔ پرتم سے مایوس ہو کر میں نے پھر شکر سے رابطہ کیا اور اسے اپنے گھر بلایا۔ میں گھر میں اکیلا تھا اور ہم تقریباً ساری رات ہی بائیں کرتے رہے۔ اب شکر اور مکمل چکا تھا۔ خان صاحب جس دن سے جسونت قتل ہوا ہے یقین جانوں میں اس کو جھج میں رہا ہوں کہ اسے مارا کس

کہنے کی کمر کرنے والے کے ساتھ اس کے دوہرے رشتے تھے اس لیے وہ اس کی زیادتیوں بھی برداشت کر لیتی تھی۔ جسونی کے بارے میں اس نے کبھی بتایا نہیں اور نہ ہی وہ میرے پاس زیادہ دیر رہتا تھا۔ اس لیے میں کچھ نہیں جانتی۔ نیو کے ساتھ کافی دیر کی باتوں کے باوجود مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے اسے اندر جانے کا کہہ دیا اور تپاؤ کے آنے پر اسے بتایا کہ اس کی بہو کچھ بھی علم نہیں یا وہ بتائیں جانتی۔ تپاؤ کہنے کا کہہ خود اپنی بہو سے معلوم کرے گا اور اگر کوئی کام کی بات ہوئی تو مجھے بتا دے گا۔ پرتم بھی کھر میں ہی تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تم میرے پاس تھانے آ جاؤ لیکن تپاؤ یا نیو کو متانے بغیر۔

پرتم کے ساتھ گفتگو کر کے مجھے احساس ہوا کہ میں نے سچ آدی پر نظر رکھی ہے۔ پرتم سے پہلے شکر نے مجھ سے بڑے کام کی بات بتائی تھی اور دوسرا کام کا آدی پرتم نکلا۔ گھر کا یہ تو گھر کے ہر راز سے واقف تھا۔ میں نے اس کے ساتھ بھی بات چیزی بھی کر نیو کا جسونت کے ساتھ کیا جھگڑا تھا۔ دولت یا کوئی اور بات۔ پرتم کا کہنا تھا کہ دولت کوئی بڑی بات نہیں جسونت کے باپ کے پاس بہت روپیہ ہے جس کا وہ وادہ داتا تھا۔ اس کے اپنے پاس بہت پیسے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کے ڈیرے پر میں نے خود کی بار ڈھیر سارے پیسے چار پائی پر پڑے دیکھے تھے۔ بات یہ نہیں کہ وہ اپنے سر سے پیسے لانے کی خاطر بیوی سے لڑتا تھا۔ نیو کو اصل شکایت یہ تھی کہ وہ گھر کیوں نہیں رہتا۔ ڈیرے پر کیا رکھا ہے؟

ڈیرے پر کیا تھا جسے چھوڑ کر جسونت گھر نہیں جاتا تھا۔ اس بارے میں پرتم جانتا بھی تھا لیکن فی الحال مجھے نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے پرتم اور شکر کے

تھی۔ بعد میں جا کر اس کا پتہ چلا۔
 پہتم میری بات سن کر صاف کھڑکھریا کہ اسے کسی چیز کا پتہ نہیں۔ اس نے بھی مالگن یا نیٹو کے منہ سے نندہ کا کوئی بات نہیں سنی اور نہ ہی اسے یہ پتہ ہے کہ تپارو کی کون سی شریکے برادری میں نندہ نامی لڑکی ہے جو جھونٹ کے ڈیرے پر جاتی رہی ہے۔
 وہ کہنے لگا: ”سراکار مجھے ان باتوں کا پتہ نہیں جو آپ کر رہے ہیں لیکن میں معلوم کروں گا۔“ پہتم اس کے جواب میں نے اسے میرے نظروں میں مشتبہ نمبر ایک بنادیا۔ یا تو یہ فوکرل میں لوٹ گیا یا شکر مجھے پکڑ رہا تھا لیکن دل شکر کی طرف سے مطمئن تھا۔ مجھے بار بار شک ابھی پریم پر ہوتا تھا لیکن ابھی وقت نہیں تھا کہ اسے حالات میں ڈال دیتا اور پھر اس کا باپ بھی مجھ سے جھوٹ بولتا۔
 میں ایک بار پھر تپارو کے پاس گیا اور اس سے پوچھا کہ تمہاری شریکے برادری میں نندہ نام کی کسی لڑکی کے جسو سے تعلقات تھے؟ وہ کہنے لگا کہ اسے پتہ نہیں لیکن اگر تھے تو ایسی باتیں ہو سکتی ہیں کہ زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ آپ میری بیوی یا بہو سے پوچھ لیں۔
 نیٹو اس سے پہلے میرے ساتھ بے کار باتیں کرتی رہی تھی اس لیے مجھے اس سے کوئی خاص بات معلوم ہونے کی کم ہی امید تھی۔ اس لیے میں نے تپارو سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ چنگھلا کہ تپارو اس کا بیٹا لگا ہوا تھا اس لیے اگر اسے کچھ معلوم تھا تو وہ فوراً آگے دیتی۔
 تپارو نے اپنی بیوی کو بلایا اور میں نے اس سے اظہار ہمدردی کے بعد پوچھا کہ اس کو اپنے بیٹے کے بارے میں کیا معلوم ہے۔ بیٹوں کو اگر کوئی مسئلہ ہو تو وہ ماں سے ذکر ضرور کرتے ہیں یا بیوی کے ساتھ مجھڑا ان کی ماں کے ظلم میں آجاتا

نہیں؟ لیکن اس کا بھی وہی خیال تھا جو میرا خیال تھا یہ نندہ وہ نہیں بلکہ میٹھوری کی بیٹی ہے جو ہمارے اس گاؤں میں رہتے ہیں جہاں ہماری زیادہ زمین ہے اور ہیں جسو نے ڈیرہ بنایا ہوا ہے۔
 ”یہ میٹھوری کون ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”میٹھوری کا گھر والا فوج میں صوبے دار تھا۔ وہ کسی چھاؤنی میں مر گیا۔ یہ دھوا ہو گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بجائے سسرال میں ہی رہی۔ اس کے ساس سسریمہ دینا سے چلے گئے۔ ان کی جو زمین گھر تھا وہ اسی کے حصے میں آیا کیونکہ صوبے دار کا نہ بھائی تھا نہ بہن۔ میٹھوری کی ایک ہی بیٹی تھی وہ اب جوان ہو چکی ہے۔ اسی کا نندہ نام ہے۔“

”میٹھوری کا گھر والا فوج میں صوبے دار تھا۔ وہ کسی چھاؤنی میں مر گیا۔ یہ دھوا ہو گئی اور اپنے ماں باپ کے گھر جانے کی بجائے سسرال میں ہی رہی۔ اس کے ساس سسریمہ دینا سے چلے گئے۔ ان کی جو زمین گھر تھا وہ اسی کے حصے میں آیا کیونکہ صوبے دار کا نہ بھائی تھا نہ بہن۔ میٹھوری کی ایک ہی بیٹی تھی وہ اب جوان ہو چکی ہے۔ اسی کا نندہ نام ہے۔“
 میں نے جسو کی ماں سے پوچھا کیا واقعی انہیں یقین ہو گیا ہے کہ جسو کے نندہ سے تعلقات تھے۔
 ”اس کا تو پتہ نہیں لیکن وہ میری بیوی پر سوکن لانے کی باتیں بہت کرتا تھا۔ میں نے کئی بار اسے گالیاں دی تھیں کہ میری بہو میں کیا خرابی ہے لیکن پتہ نہیں اس لڑکی نے اس پر کیا جادو کر رکھا تھا کہ جسو سارے رشتے ختم کرنے پر تل گیا تھا۔“
 میں نے دل میں سوچا کہ ان عورتوں کو جتنا معلوم تھا وہ میں جان چکا ہوں۔ اب یہ کونج شکر لگائے گا کہ نندہ والا پورا چکر لگایا تھا۔
 میں یہی سوچ کر تپارو کے گھر سے تھانے آیا اور شکر کو بلوایا۔ میں نے اسے بلانے کے لیے آدی بھیجا لیکن وہ آدی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد خود ہی آگیا۔ کہنے لگا۔
 ”میں تھانے کو دتین پکڑ مار چکا ہوں۔ آپ پتہ نہیں کہاں تھے۔ مجھے آپ سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں

تپارو کے گھر اس کی بیوی سے بات کر کے آ رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ کرو لیکن جو نندہ تم سمجھ رہے ہو وہ جھونٹ والی نندہ نہیں! میری بات سے شکر بہت حیران ہوا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں وہ ہماری برادری والی نندہ نہیں جس کے ساتھ جسو کے تعلقات تھے تو پھر کون سی نندہ ہے؟“
 ”یہی جانتا تھا مار کا م ہے۔“ میں نے اس کا اہتمام لینا شروع کر دیا اور وہ سوچنے لگا۔
 ”شکر جو بات تم نے معلوم کرنا تھی وہ نہیں کر سکتے۔ وہ میں سے معلوم کر لی ہے۔ یہ نندہ صوبے دار کی بیٹی ہے۔ میٹھوری کی بیٹی۔ کچھ مجھے؟“
 میٹھوری کی بیٹی کا نام سن کر شکر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے دور کی چیز کو دیکھ گئیں۔
 ”لعلت میری یادداشت پر۔“ مجھے پہلے یہ خیال کیوں نہ آیا۔ یہ نندہ تو میں نے ایک بار جسو کے ڈیرے کے قریب دیکھی تھی۔ مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ ڈیرے پر کئی تھی یا ادھر سے گزر رہی تھی۔ آپ کو کس نے یہ بات بتائی ہے؟“
 ”چلو اب تم جان تو گئے ہو کہ یہ نندہ کون سی ہے تو جاؤ جاؤ کہ اس کی پوری کھوج لاؤ۔ کیا خیال ہے ایک دو دن میں آ جاؤ گے؟“ شکر نے سر ہلایا اور وہ اس قدر حیران تھا کہ مجھ سے مزید بات کہنے بغیر چلا گیا۔
 شکر و کھوج کھوج لگا لایا تھا اور اس بار میری توقع سے بڑھ کر اس نے کھوج لگائی تھی۔ میرے بیٹے کے تیسرے دن وہ واپس مجھے تھانے نہیں بلکہ اپنے گھر آ کر ملا۔ جوش نے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
 ”خان صاحب آپ نے ٹھیک کہا تھا یہ وہی میٹھوری والی نندہ ہے لیکن اس کی تو شادی ہو چکی ہے۔ وہ یہاں سے دو تین گاؤں آگے ایک گھر میں بیٹھ گئی ہے۔ یہ صوبے دار کے دور پار کے

رشتہ دار ہیں۔“

”کب بیاہی گئی ہے؟ جسو کے ساتھ تعلقات سے پہلے یا بعد میں؟“ میرے سوال کے جواب میں شکر نے بتایا کہ جب جسو گل ہوا ہے اس سے ایک آدھ دن پہلے کی بات ہے۔ ”خان صاحب اس بات کو چھوڑیں جو بات میں معلوم کر کے آیا ہوں وہ بڑی زبردست ہے۔ میں نے گاؤں کی ایک عورت سے معلوم کیا ہے۔ اس عورت کے بارے میں آپ نہ ہی پوچھیں۔ ایسی عورتیں ہر گاؤں میں ہوتی ہیں جو آج میرے ساتھ کل دوسرے کے ساتھ۔ ایک ایسی ہی عورت ہے وہ جس کو میں نے کھوج کے کام پر لگایا۔ وہ بہت کچھ بتاتی تھی اور اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ جسو مندرہ کا رشتہ چاہتا تھا اور اس نے مندرہ کی ماں مہیشوری سے بات کی۔ اس دوران اس نے مندرہ سے تعلق بھی بنالیا۔ وہ اس کے ڈیرے پر بھی آنے لگی لیکن مہیشوری خواہ غریب عورت تھی لیکن وہ جسو کو اس کی دولت کے باوجود اچھا آدمی خیال نہیں کرتی تھی۔ اس نے جسو کو صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے مندرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے، کل کو اسے کوئی اور عورت پھر پسند آگئی تو وہ مندرہ کو چھوڑ کر اس سے بیاہ کر لے گا۔ اس لیے وہ اسے رشتہ نہیں دے سکتی۔ اس انکار پر جسو کو آگ لگ گئی کہ ایک بچلے گھرانے کی عورت سے بھی بات کی ہوگی لیکن شاید وہ بھی ماں کی مرضی کے بغیر شادی پر تیار نہیں تھی اس لیے اس نے جسو کے ڈیرے کی طرف جانا بند کر دیا۔ مہیشوری کے انکار پر جسو نے اسے دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس کی لڑکی کو اٹھالے گا لیکن مہیشوری پتہ نہیں کیوں چپ تھی نہ ہی وہ خوفزدہ

تھی۔ مجھے ایک دن مہیشوری کنویں پر مل گئی۔ میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو وہ بیٹھ پڑی اور رونے لگ گئی۔ روتے روتے اس نے بتایا کہ مندرہ کا باپ زندہ ہوتا تو یہ کبھی نہ ہوتے۔ اس نے بتایا کہ وہ مندرہ کا رشتہ صوبے دار کے رشتہ داروں میں کر رہی ہے۔ وہ بھڑے لوگ ہیں۔ مندرہ ان میں بیاہی گئی تو وہ خود ہی اس کی حفاظت کر لیں گے۔ اس ملاقات کے بعد کافی دن تک مہیشوری نظر نہیں آئی نہ ہی اس کی بیٹی مندرہ۔ ان کے گھر پر تالہ لگ گیا۔ کوئی چھ سات دن بعد مہیشوری پھر گاؤں میں نظر آئی۔ اس نے اپنا گھر کھول لیا تھا اور وہیں اکیلی رہ رہی تھی۔ میں نے گھر کھلا دیکھا تو اس کے پاس گئی۔ میں نے پوچھا کہ مندرہ کہاں ہے تو کہنے لگی کہ میں نے تمہیں بتایا تھا میں اس کی شادی کر رہی ہوں۔ میں نے اسے صوبے دار کے رشتہ داروں میں بیاہ دیا ہے۔ وہ اپنے سسرال میں ہے۔ میں نے اسے یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ اگر ملنا ہو گا تو میں خود جا کر اس سے مل لیا کروں گی۔ میرا داماد کہتا ہے کہ میں ان کے گھر میں آ جاؤں۔ اتنی بڑی حوصلی میں مجھے بھی ایک کرہ مل جائے گا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں اپنے اسی گھر میں رہوں گی جو صوبے دار نے خود بنایا تھا۔ مندرہ کے بیاہ جانے کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے مہیشوری سے کہا کہ میں اس کے پاس آتی جاتی رہوں گی لیکن پھر مجھے مہیشوری سے ملنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ چند دن بعد میں اس کے گھر گئی تو پھر تالہ لگا ہوا تھا۔ چند دن نے سمجھا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی ہوگی۔ وہ دن اور آج کا دن اس کے گھر تالہ لگا ہوا ہے۔“

شکر اس عورت کی بات سنا کر کہنے لگا ”خان صاحب مجھے تو لگا لگتین ہو چلا ہے کہ جسو کے قتل میں اسی مندرہ کا پتھر ہے۔“ شکر نے جو بتی بات سنائی تھی

دوں بھڑے تھے اور بیٹھوڑی لہری تھی کہ نہندہ پر تم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ میں کھڑا ہو کر بائیں سننے لگا اور جو سنے مجھے وہاں سے بھاگ دیا کہ گھر چلے جاؤ۔ میں ڈرتا ہوا کھڑا آگیا۔ میں نے ان کی لڑائی کی بات گھر بھی نہیں بتائی۔ صبح میں ڈیرے کیا تو جو سننے مجھے پھر بھاگ دیا اور کہا کہ تم گھر جا کر کھیلو۔ بھینسوں کو چارہ دینے کی ضرورت نہیں وہ خود دے لے گا۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو جھٹی مل گئی۔ اس سے اگلے دن ہم گاؤں کے لڑکے ڈیرے کے آس پاس کھیلے رہے۔ جھوت نے مجھے کہا تھا کہ ایک دو دن ڈیرے پر نہ آنا لیکن میں اس دن جھٹی ملنے پر بھی کھلتا ہوا وہاں چلا گیا تھا۔ کھیل کے دوران میں ڈیرے پر چلا گیا کیونکہ مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ میری کمر سے پیچھے ہم نے گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں جو چارہ پائیاں بچھی ہوئی ہیں وہاں جھوت کے دوست جھتو اور گاوی بیٹھے ہوئے تھے۔ جھوت ان کے پاس ٹھل رہا تھا اور وہ ہنس رہے تھے۔ گاوی جھوت کو کہہ رہا تھا کہ تم نے سودا اچھا کیا ہے۔ وہ نہیں تو اس کی ماں لے آؤ۔ مجھے وہاں دیکھ کر جھوت نے مجھے گاوی دی کہ میں ڈیرے پر کیوں آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ پانی پینا ہے پھر چلا جاتا ہوں اور پانی پی کر دوسرے بچوں کے ساتھ گاؤں بھاگ آیا۔ رات کو سوئے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے جھوت ڈیرے پر کیوں نہیں جانے دیتا اور گاوی کی ماں کی بات کر کے ہنس رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کج چاکر دیکھوں گا۔ میں نے صبح اٹھ کر روٹی کھائی۔ کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ڈیرے کی طرف چلا گیا۔ ڈیرے سے ادھر مجھے باجرے میں کچھ پانا پڑا کیونکہ ادھر سے جھوت گھوڑی لے کر نہیں جا رہا تھا۔ میں خوش ہوا کہ چلو اچھا ہو گیا ہے۔ اب میں ڈیرے پر چلا جاؤں گا مجھے دیکھ کر کوئی نہیں۔ میں

جانے۔ دوسرے کو اور اس کے بچے کو میں نے وہاں بٹھا لیا۔ کافی دیر بٹھانے کے بعد جب میں نے اعزازہ کیا کہ وہ آؤ اب آگیا گیا ہے اور مجھ رہا ہے کہ میں اسے ضرور سزا دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے تمہارے بچے سے بائیں کرتا ہیں تم گھر جاؤ۔ میں اسے سہاے کے ساتھ گھر بھیج دوں گا۔ وہ پہلے تو ہنگامیاں پھر چلا گیا۔ میں نے بچے کو پکڑا اور اس کا حوصلہ قائم کیا کہ میرا اسے ماروں گا نہیں۔ اس کے بعد اس سے پوچھنے لگا کہ وہ ڈیرے پر کیا کرتا ہے؟ ”میں ڈیرے پر بھینسوں کو پانی اور چارہ دیتا ہوں اور چھوٹے موٹے کام کرتا ہوں۔“ دس بارہ سال کے اس لڑکے کا اعزاز تاتا تھا کہ وہ گاوی بچھ دیکھ چکا ہے کیونکہ وہ بڑے احماد کے ساتھ بول رہا تھا۔

”کیا اس ڈیرے پر تم نے کبھی کوئی عورت دیکھی ہے؟“ میرا سوال سن کر وہ چہرہ ہو گیا۔ میں نے اس سے ادھر ادھر کی کافی باتیں کر کے پھر وہی بات پوچھی تو وہ چپ ہی رہا۔ شاید وہ میرے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا جبکہ مجھے اس سے اسی سوال کا جواب لینا تھا۔ میں نے اسے پکڑا کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اب جھوتو کر گیا ہے اور میں بھی اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ لڑاکا میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری بات کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ پھر جب اسے یقین آ گیا تو کہنے لگا: ”وہ۔۔۔ صوبے دارنی۔۔۔ کی بات کر رہے ہیں آپ؟“

”کوئی صوبے دارنی؟“

”وہ کئی نہندہ کی ماں وہ ایک دن وہاں آئی تھی اور اس نے جوئے سے کہا تھا کہ جو تمہارے کہ لو اس کے اگلے دن جوئے نے مجھے نہندہ کے گھر بھیجا تھا کہ بیٹھوڑی کو بلا کر لاؤ۔ میں اسے بلا کر لے آیا تھا۔ ڈیرے پر جو کا اس کے ساتھ بہت بھڑا ہوا۔ وہ

چلیں وہ وہاں نہ ہو۔ ہم اس کے بھائیوں کے گھر چلے گئے۔ ان کا گھر بھی بند پڑا تھا۔ بیٹھوڑی کے بھائی بھی غائب تھے۔

شکر کے جانے کے بعد میں بھی گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے خور کے کمرے سے آدمیوں کے اونچا اونچا بائیں کرنے کی آواز آئی۔ میں نے ایک سپاہی کو آواز دی کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا بات ہے وہ مجھے آ کر بتائے لگا گاؤں کے دو آدمی لڑ پڑے ہیں۔ پہلے ان کے بچے آپس میں لڑے ہیں اور پھر میں لڑ پڑے ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے ہیں۔ ایک کا سر پھٹ گیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے پاس شکایت کرنے آ رہا تھا کہ دوسرا بھی آ گیا ہے۔ دونوں میں سے ایک کا بچہ بھی ساتھ ہے۔ میں نے اسے کہا کہ دونوں کو یہاں لے آؤ۔ دونوں آ گئے تو میں نے انہیں اچھی طرح ڈانٹ ڈپٹ کی کہ بچوں کی لڑائی میں تم بھی بچے بن ہو گئے ہو۔ جس آدمی کا سر پھٹا تھا وہ دوسرے کے بارے میں کہنے لگا کہ اسے زیادتی کرنے کی عادت ہے کیونکہ اس کا بچہ جھوت کے ڈیرے پر بھی کام کرتے چلا جاتا ہے۔ اب جب سے لوگوں کو جھو کا رعب رہتا تھا۔ آج جب ہمارے بچے لڑ پڑے اور میں نے ان کی زیادتی کی اس سے شکایت کی تو اس نے بجائے انصاف کرنے کے مجھے اور میرے بچے کو مارا ہے اور اٹنا شکایت کرنے یہاں چلا آیا۔ میں بھی آگیا کہ کج بات بتاؤں۔ سر پھٹانے والے اور اس کے بچے کی طرف میں نے نظر اٹھائی اگر یہ بچہ جوئے کے ڈیرے پر جاتا تھا تو اسے بہت کچھ معلوم ہوگا۔ اس ڈیرے پر جو لوگ آتے تھے وہ بچے کے سامنے ایسی باتیں بھی کرتے ہوں گے جو دوسروں کے آگے نہیں کرتے۔

میں نے جس آدمی کا سر پھٹا تھا اسے کہا کہ

اس کے بعد تو مجھے بھی شک ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں نہندہ والا چکر ہے۔ میں نے شکر سے کہا کہ مجھے نہندہ کے گھر جانا ہوگا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ بیٹھوڑی وہاں ہے کہ نہیں۔ اس لیے تم اس عورت سے جس نے جھنپیں یہ بائیں بتائی ہیں یہ معلوم کرو کہ نہندہ کے گھر ہے کہاں۔ بیٹھوڑی نے ضرور اسے بتایا ہوگا ورنہ مجھے تاؤ وہ عورت کون ہے میں خود پوچھ لوں گا۔ شکر گھبرا گیا کہنے لگا آپ رہنے دیں میں معلوم کر کے آتا ہوں۔

ڈیرہ دو گھنٹے بعد شکر وہاں آگیا۔ وہ نہندہ کے گھر کا پتہ معلوم کر کے آیا تھا۔ ہم نے گھوڑے لیے اور شام ہونے سے پہلے صوبے دار کے رشتہ داروں کی حویلی پہنچ گئے۔ ہمیں بیٹھوڑی کے داماد کا نام معلوم نہیں تھا جب ہم نے نہندہ کے بارے میں پوچھا تو ایک آدمی گرم ہو کر ہم سے پوچھنے لگا کہ ہم کون ہیں اور کیا بات ہے نہندہ میری بیوی ہے۔ ہم اسے ایک طرف لے گئے اور اپنا تعارف کرایا جس پر وہ نرم ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ صرف نہندہ یہاں ہے۔ اس کی ماں بیٹھوڑی کافی دنوں سے نہیں آئی بلکہ نہندہ کہہ رہی ہے کہ اس نے ماں سے ملنا ہے میں اسے خود کسی دن لے کر آئے ہیں والا ہاں۔

بیٹھوڑی کی کشمکش کا سن کر اس کا داماد پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو اور یہ بات اپنی بیوی کو نہیں بتائے۔ میں خود بیٹھوڑی کو تلاش کر رہا ہوں اور جب تک میں نہ کہوں تم نے نہندہ کو نہیں بتانا۔ اس کے بعد ہم تھانے واپس آ گئے۔ راستے میں میں نے شکر سے کہا کہ جو مارا گیا ہے اور بیٹھوڑی غائب ہے۔ اب تم کیا کہنے ہو؟ شکر کہنے لگا پھر واپسی گھمبیر ہے۔ مجھے جانے دیں میں اور کونج کرتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ بیٹھوڑی کے بھائیوں کے گھر

جب ڈیرے کی تیری کے نیچے آیا تو مجھے اس کے ساتھ والے کمرے سے گامی کی آواز آئی۔ وہ پتہ نہیں کس کے ساتھ بول رہا تھا۔ میں نے اس سے بچنے کے لیے اس کمرے کی طرف بھاگا جس میں ہم توڑی اور دوسرا سامان رکھتے ہیں۔ اس کے دروازے کی کنڈی انزری ہوئی تھی جس صحت دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں اندر اس اسا تھا۔ میں آگے ہوا تو مجھے نظر آیا کہ چار پائی پر ایک عورت لیٹی ہوئی ہے۔ میں اسے دیکھ کر اٹنے لگاؤں باہر بھاگتے ہی والا تھا کہ اس نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ اس کی سرکشی جیسی آواز سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ وہ چوری بجے جا رہی ہے۔ میں جب اس کے قریب گیا تو یہ تو صوبے دارنی تھی۔ اس کے ہاتھ چار پائی سے بندھے ہوئے تھے۔ بیروں سے گردن تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ ڈر کے مارے میری آواز نہیں نکلی تھی۔ صوبے دارنی کہنے لگی کہ یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو جا کر میرے بھائیوں کو بتا دینا۔ میں اس قدر ڈر گیا تھا کہ مجھے سے زیادہ دوپٹوں کھڑائیں ہو گئیں۔ میں بھاگ گیا اور سیدھا اپنے گھر گیا۔ دوپٹر تک گھر سے نکلا ہی نہیں۔ مجھے خیال آیا کہ صوبے دارنی نے جو کہا ہے اپنی ماں کو بتا دوں۔ دوپٹر کے وقت میرے سگی کھینے کے لیے آگے اور ہم باہر چلے گئے۔ کھینٹے کھینٹے یہ نہیں مجھے کیا خیال آیا کہ میں صوبے دارنی کے بھائیوں کے گھر چلا گیا اور اس کے بھائیوں کو گھبراہ اور پرکاش میں سے ایک رکھویرے بھل گیا۔ وہ روٹی کھا رہا تھا جب وہ فارغ ہو گیا تو میں نے اسے ساری بات سنا دی اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے بھاگ گیا۔ پھر مجھے یہ نہیں کیا ہوا۔ کئی دن سے میں ڈیرے پر نہیں گیا اور پھر مجھے

آپ نے بتایا ہے کہ کسی نے جھوٹ مار دیا ہے۔ اس لڑکے کا بیان میرے لیے بہت بڑی گھڑی تھی۔ میں نے اسے سپاہی کے ساتھ اس کے گھر بھیج دیا اور خود کھڑک بولا ہوا۔ شام کا اندھیرا اس وقت گہرا ہو چکا تھا جب میں اور کھڑک گھوڑوں پر تھانے سے نکلے۔ ہم نے میٹھوری کے بھائیوں کے گھر چھپا کر مارنا تھا۔ اس لڑکے نے مجھے جو بات بتائی تھی اس کے بعد میں نے کھڑک کو کمرے بلوا کر اسے ساری بات سنا دی اور اس سے کہا کہ میٹھوری کے بھائیوں کا کھانا نہ معلوم کرو۔ کھڑک نے اسی عورت سے سن لی کہ اسے وہ اسی طرف جا رہے تھے۔ میں نے تھانے سے کوئی لاؤنگر نہیں لیا تھا کہ میں سپاہی لیے۔ کھڑک نے جو جگہ معلوم کی تھی وہ بارہ میل دور تھی۔ اس زمانے میں جب سڑکیں زیادہ تھیں نہ دیہات میں کل تھی۔ رات کے وقت دس بارہ میل کا سفر بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے چونکہ اس کا بگنی بار بگنی ہو چکا تھا اس لیے مجھے زیادہ پریشانی تھی نہ کی کھڑک کھڑک کی آواز گھرائی ہوئی تھی۔ اس نے کسی رات کو گھڑسوار نہیں کی تھی۔ راستہ دیکھا بھالا ہوا اچھے گھوڑے پر کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی۔ جگہ یعنی راستہ انجان ہو تو وقت زیادہ لگتا ہے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگنے لگا کہ ہم پتہ نہیں کب کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ گاؤں پر گاؤں نکلتے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں گھروں کے بیولے، بھونکتے کتے، چوکیداروں کی لائین اور آوازیں۔ اس وقت یہ سب کچھ نظر آتا یا آواز آتی جب ہم کسی گاؤں کے پاس سے گزرتے۔ کھڑک کہنے لگا کہ اس نے یہ گاؤں صرف ایک بار دیکھا تھا جب وہ کئی سال پہلے دو اپنے کے لیے اس گاؤں میں سکیم کے پاس آیا تھا۔ گاؤں کی ایک نشانی اسے یاد ہے کہ ایک بہت چوڑا پایا

(راستہ)۔ بگنی سڑک جو گاؤں کے اندر جاتی ہے) جس کے شروع میں پتیل کے تین بہت بڑے بڑے درخت ایک دائرے کی شکل میں آگے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک جتنے گاؤں سے ہم گزرے تھے ان میں کسی جگہ ایسی نشانی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم راستہ بھول گئے تھے۔ گھوڑوں کو تھکانے کی بجائے میں نے سڑوک دیا اور سب سے کہا کہ نیچے اتر آؤ۔ ہم اس وقت ایک بستی کے قریب ہی تھے۔ کوئی ایک میل کے فاصلے پر پانگل دیے کی طرح ایک روشنی نظر آ رہی تھی جو چل رہی تھی۔ گیدڑوں کی آواز کے ساتھ نہایت بلی انسانی آواز آ جاتی تھی جیسے کوئی چوکیدار بول رہا ہو۔ میں نے ایک سپاہی سے کہا کہ اگر یہ کوئی چوکیدار ہے تو جا کر اس سے پتہ کر کے آؤ کہ وہ گاؤں کی طرف ہے جہاں ہم نے جانا ہے۔ کھڑکی اس آدمی کے ساتھ ہی چلا گیا۔ وہ گھوڑوں پر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آ گئے۔ کھڑک کہنے لگا کہ ہم دو گاؤں آگے نکل آئے ہیں۔ پیچھے جانا ہوگا۔ ہم نے اس طرف رخ کر لیا جدھر سے آئے تھے۔ ایک بستی گزرنے کے بعد دوسری بستی تو مجھے وہ درخت نظر آئے جو میرے دائیں طرف تھے۔ میں نے گھوڑا ان کے پاس لا کھڑا کیا۔ یہ دائرے میں آگے ہوئے پتیل کے تین درخت تھے۔ جن کے ساتھ وہ چوڑا راستہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ ہم میں سے کسی نے بھی میٹھوری کے بھائیوں کا گاؤں نہیں دیکھا ہوا تھا اس لیے کسی کو ان کے گھر کا پتہ نہیں تھا۔ اس وقت ہم کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکا کر یہ معلوم نہیں کر سکتے تھے کہ جس گھر میں ہم نے جانا ہے وہ کون سا ہے۔ اس کے لیے چوکیدار کی مدد کر سکتا تھا اور اسی امید کے ساتھ ہم گاؤں میں داخل ہو گئے۔ یہاں

چوکیدار کے انتظام بہت اچھا تھا۔ ہم گاؤں کے پہلے کھرے پاس ہی پہنچے تھے کہ چوکیدار لائین لے کر چکر لگا ہوا ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ ایک سپاہی نے آگے ہو کر اپنا اور ہم سب کا تپا اور میری طرف اشارہ کیا۔ چوکیدار نے پاس پر پرنام کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میں نے اسے اپنی مشکل بتائی۔ وہ سر کھانے لگا اور سوچ کر بولا کہ یہاں رکھویر اور پرکاش رہتے ہیں جن کا ایک بھونڈی فوج میں تھا۔ میں آپ کو ان کا گھر دکھا دیتا ہوں۔ آپ خود ان سے پوچھ لیں۔ وہ ہمیں گاؤں کی طرف لے گیا۔ تھوڑی دور جا کر مجھے خیال آیا کہ گھوڑے نہیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن گھوڑے یہاں کہاں رکھے جائیں۔ میں نے کھڑک اور ایک سپاہی کو ساتھ لیا اور ہم چوکیدار کے ساتھ چل پڑے۔ گلیوں میں سے گھومتا گھومتا چوکیدار ہمیں ایک مکان کے سامنے لے گیا اور اس نے خود دروازے کو کھڑکایا۔ کافی دیر بعد ایک آدمی دروازے کی طرف آتا سنائی دی۔ اس نے اندر سے کنڈی کرائی اور ایک پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے چوکیدار تھا جس کے پیچھے ہم کمرے تھے۔ وہ پوچھنے لگا ”مہنتا کیا بات ہے۔ یہ کون آدمی ہے؟“ مہنتا چوکیدار کہنے لگا کہ تم سے ہی ملنا ہے انہوں نے۔ ان کو اندر لے جاؤ۔ گھبراہٹیں رکھویر۔

”مہنتا“ پوچھتے ہیں تم کئی آدمیوں کو میرے پاس لے آئے؟“ اس نے دروازہ بند کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ میں نے چوکیدار کو ایک طرف ہٹایا اور رکھویر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا اور کھرے اندر گھس گیا۔ میرے پیچھے کھڑک اور سپاہی بھی آ گئے۔ مہنتا جیسے اپنے پتھر پر جانے کی بجائے میرے ساتھ ہی اندر آ گیا تھا۔ اندر جن میں چار پائیاں بھی ہوئی تھیں جن پر

چادر میں لیے دو آدمی پڑے تھے۔ ہماری آواز سن کر ان میں سے ایک اٹھ بیٹھا اور اونچی آواز میں بولا ”رگھویر سے کیا بات ہے کون ہیں یہ آدمی؟“ رگھویر نے جواب نہیں دیا بلکہ چونکدار کہنے لگا ”پرکاش کوئی نہیں خبر ہے۔“ بردہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سر ہانے رکھی ہوئی ڈانگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مجھے اس کا ارادہ اچھا نہیں لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ ڈانگ پر ہاتھ ڈالنا میں چھانکس مار کر اس کے سر پر جا پہنچا اور میرے زوردار کسے سے وہ گھوم گیا۔ اسے مکا پڑتا دیکھ کر رگھویر ہنسنے لپٹ گیا اور اسے مارنے لگا۔ چونکدار نے لالین زمین پر رکھ دی اور چھڑا نے لگ گیا۔ میں نے پرکاش کو کھوں اور ٹھنڈوں پر رکھ لیا۔ سپاہی نے رگھویر کی طبیعت صاف کر دی۔ اب دونوں زمین پر پڑے بائپ رہے تھے۔ اب تیرا آدمی بھی اٹھ کر چادر لینے چار پائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن پاس جا کر رک گیا کیونکہ یہ ایک عورت تھی۔ شکر میرے پاس آکھڑا ہوا اور اس نے حیرت سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے حیرانگی سے مہیشوری کا نام نکلا۔ اچانک رگھویر نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسے دروازے پر جا لیا۔ سپاہی نے پھرتی دکھائی اور پرکاش کو پکڑ لیا۔ میں نے چونکدار سے کہا کہ مجھے رسی دو ان کی شکلیں بانٹھنا ہیں۔ اس نے کندھے سے پڑی چادر میری طرف پھینک دی۔ میں نے شکر سے کہا کہ رگھویر کو بانٹھ لو۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے پرکاش کو بانٹھ لیا لیکن انہیں تھانے لے جانا ضروری تھا۔ میں نے چونکدار سے کہا کہ کسی سواری کا انتظام کرو۔ وہ جا کر نمبردار کو بھی لے آیا اور سواری کو بھی۔ میں تینوں کو تھانے لے آیا۔

تھانے میں ایک رات اور دن رکھنے کے بعد

پہلے رگھویر سے پوچھ گچھ کی تو وہ پردوں پر پانی نہیں پڑنے دیتا تھا۔ پرکاش اور رگھویر بہت چالاک ثابت ہوئے۔ نہ ان پر بار اثر کرتی اور نہ ہی وہ میری کسی بات میں آتے تھے لیکن انہیں یہ پتہ نہیں تھا کہ میرے پاس کیا ہتھیار ہے۔ میں نے تنگ آ کر اس لڑکے کو بلایا جس نے انہیں مہیشوری کے توڑے والے کمرے میں ہونے کی اطلاع دی تھی۔ میں نے رگھویر کو حوالات سے نکال کر اپنے کمرے میں بٹھایا اور اس لڑکے کو اس کے سامنے کر دیا۔ وہ اسے دیکھ کر پیلا زرد پڑ گیا اور سمجھ گیا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کے سامنے لڑکے سے پوچھا ”مہیشوری کا بھائی ہے نا؟“ اور تم نے اسی کو جا کر بتایا تھا نا کہ مہیشوری جسونت کے ذریعے پرتوڑی والے کمرے میں قید کی ہوئی ہے؟“ لڑکا رگھویر کے سامنے کہنے لگا کہ یہ بات ٹھیک ہے۔ میں نے اس آدمی کو مہیشوری کی بات جا کر بتائی تھی اور اس نے مجھے کہا تھا کہ میں جاؤں۔ یہ مہیشوری کا بھائی ہے اور مہیشوری نے مجھے اسی کے پاس بھیجا تھا۔

میں نے لڑکے کے اتار کھینے کے بعد اسے وہاں سے بھیج دیا اور رگھویر سے کہا کہ اب چھپانے کا فائدہ نہیں۔ مہیشوری مجھے بتا چکی ہے کہ تم نے اور پرکاش نے مل کر جسو کو مارا ہے۔ میرا یہ وار رگھویر نے بیکار کر دیا۔ وہ کہنے لگا کہ مہیشوری جھوٹ بولتی ہے اور لڑکا بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ رگھویر سخت جان تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس طرح نہیں مانے گا۔ میں نے اس پر توجہ ختم کر دی اور مہیشوری کو پکڑ لیا۔ مہیشوری نے بڑی دردناک بات بتائی۔

”یہ جسونت سگھ میری بیٹی مندرہ پر عاشق ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے

سیلاب کہاں

125 افراد..... ہر بس میں..... اور روپے؟ محض دو ہزار..... یعنی 15 روپے پیس.....
صرف آدھ پاؤ چٹوں کے دام..... مگر یہ بھی نہ تھا..... کچھ اور مانگتے تو شاید
کاغذ کی بی بی گولیاں کھاتے..... بہر حال کاغذیاں روانہ ہوئیں اور چھ گھنٹے کے دھواں
گزارا اور صبر آزمائے کے بعد یہ لگ کر اپنی بچتی ہی گئے..... اٹھادی کپ میں۔

حالیہ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی بھرپور پیکی کہاں



بھی آ جاؤں گا۔ پوری پارٹی آئے گی تمہاری
خدمت کو..... سپر ہائی وے پر تمہارے لیے تنیو لگا
دئے گئے ہیں..... سب کچھ لے گا ادھر ہی.....
روٹی پانی، بسز، کیکے، چادریں..... بس اب تم
جاؤ..... جلدی جلدی بیٹھو..... کہیں دوبارہ بارش نہ
ہو جائے۔“

(جی ای ای ای ایے؟)
”کر اپنی بھی سہدہ کا حصہ ہے..... کسی کے
باپ کا اجارہ نہیں..... اگر باہر والے زیادہ ہیں تو کیا
ہوا؟ ہے تو تمہارا ہی شہر..... بابا کتنا عظم کا شہر.....
تمہارے بزرگوں کی جاکیر..... انجی تم ادھر کو
جاؤ..... وہ دیکھو..... گاڑیاں کھڑی ہیں..... میں

مہبوشی کو اس کے ڈیرے سے نکال لانے کے بعد
میں نے اور رکھویر نے جہنم کے قتل کی بات پوری
کر لی۔ اس کے پاس بدعاشوں کا ٹھکانہ ہوتا تھا
اس لیے ہمیں گھر کے پچھلی کی ضرورت تھی۔ پریم
سے بڑا پچھلی اور کون ہو سکتا تھا۔ اس آدمی کی ایک
ہی کمزوری یہ تھی کہ وہ بے چہرہ۔ ہم نے جو کے گاؤں
میں اپنی تین کھلے زمین بچ دی اور پچھلے پریم کے
حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سودا ہوا تھا کہ جو
کے کھانے میں دستور ملا دے اس کے بعد ہم
سنبھال لیں گے۔ دستور رکھویر لے کر آیا تھا۔ پریم
انتظار کرنے لگا کہ گاوی وغیرہ ڈیرے سے جائیں
اور جو اٹھائے۔ وہ کھانا لے کر ڈیرے پر جاتا تو ہم
ڈرا قائلے پر اس کے ساتھ ہوتے۔ ایک دن جو
اٹھایا تھا۔ پریم کو بھی موقع مل گیا اور ہمیں بھی۔
دستور کھا کر جو بے جاں ہو رہا تھا کہ ہم اس کے سر
پر نازل ہو گئے۔ میرے پاس کھانا اور رکھویر کے
پاس کوکا تھا اور ہم پریم جیسے پاس ہو گئے۔ پریم
برداشت نہیں کر سکا اور بھاگ گیا۔

پرکاش کا بیان سن کر میں نے سہلی ساتھ لے
اور تیارہ کے گھر جا کر پریم کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد
کی کارروائی ساری کی ساری تھانے میں ہوئی۔
میں نے پرکاش کے ساتھ جا کر وہ کھانا اور نوکا
برآمد کیا جو انہوں نے جو کے ڈیرے پر ہی ایک
روڈی (کوڑے اور گوبر کا ڈھیر) پر پھینک دیے
تھے۔ رکھویر اور پرکاش جہنم کے قتل میں اور
پریم جرم میں مدد دینے پر سزا پا گئے تھے۔ دونوں
بھائیوں کو عرقہ ہو گئی تھی۔ تیارہ انتظار کرتا رہا کہ
دونوں باہر آئیں تو اپنے بچنے کا بدلہ لے۔ پچھلے
اس کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں کیونکہ میں کچھ دیر
بعد وہاں سے تبدیل ہو گیا تھا۔

لیکن منہ نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میری
ماں کو مالا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر جہنم
مجھے پچھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں اس
بدعاش کو رشہ نہیں دے سکتی تھی۔ میرے انکار پر
جہنم نے مجھے جان سے مارنے اور منہ کو اٹھا
لے جانے کی چھٹیاں دیں۔ میں نے یہ بات
اپنے بھائیوں کو نہیں بتائی تھی۔ میں نے خاموشی سے
منہ پیادہ دی۔ جب جب کو معلوم ہوا تو وہ آگ بگولا
ہو گیا۔ اس نے ایک رات مجھے اٹھالیا اور ڈیرے
پر لے گیا۔ وہاں اس نے۔۔۔ میں بتا نہیں
سکتی۔۔۔ سمجھ لیں میں اسی رات مر گئی تھی۔ صرف
جو ہی نہیں اس کا کوئی یار بھی جسے وہ گاوی کہتا
تھا۔۔۔ پچھلے میں کتنے دن اور سولی پر چڑھتی کہ
گاؤں کا ایک لڑکا اس کرے تک آ گیا جہاں میں
قد تھی۔ میں نے اس کے ساتھ بھائیوں کو پیغام دیا۔
اسی رات میرے دونوں بھائی مجھے لٹکے آ گئے۔
جو اور گاوی دوسرے کوٹھے میں شراب پی رہے
تھے۔ میرے بھائی مجھے نکال کر لے گئے اور اس
گاؤں لے گئے جہاں میرے چچا کا مکان ہے اور
جہاں سے آپ نے میرے بھائیوں کو پکڑا ہے۔
جب ہم وہاں چلے گئے تو میرے بھائیوں نے آہیں
میں نشورہ کیا کہ اب جو کو اس دنیا میں نہیں رہنا
چاہیے۔ میں انہیں منع کرتی رہی لیکن ایک دن جو
کے قتل کی خبر میں نے بھی سن لی۔

مہبوشی کے بیان کے بعد کوئی شک باقی نہیں
رہ گیا تھا۔ پرکاش مجھے گزرو لگ رہا تھا۔ میں نے
اسے اچھی طرح مر دیا۔ اس کی برداشت سے زیادہ
اور پھر اس نے بتا دیا کہ جہنم کو انہوں نے کیسے
قتل کیا۔

”ہماری بہن کے ساتھ جہنم نے جو کچھ کیا
اس کی کم سے کم سزا کا خون ہی ہو سکتی تھی۔

کڑھی ہوئی اور شے جڑی خراب وارثوں پر سڑ پر رکھے اور بوکی کی قین شلوار زیب تن کئے ہوئے وہ اوچر عمر، چھوٹی چھوٹی واڈھی والا، قدرے بھاری بھرکم اور درواز قامت شخص شریک ماندر گرج رہا تھا۔ اس کی شاندار پر اڈو جب پہاڑی نیلے پر کھڑی تھی جبکہ چار عدد کٹھار یا بیس سیلاب زدگان کو کراچی لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس شخص کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے آٹھ عدد مسلح محافظوں نے حصار قائم کر رکھا تھا۔ اس کے سامنے تقریباً 500 افراد کھڑے، سر جھکاے اس کا خطاب سن رہے تھے۔ 500 نفوس..... عورت، مرد، بوڑھے، بچے، جوان اور اوچر عمر۔ مگر زیادہ تر غربت و افلاس کی تصویر۔ کسی مرد کے بدن پر صرف شلوار تھی تو کوئی بنیان اور ٹیکر میں بلویں..... کچھ عورتیں پچھنے پرانے کھیر دار میٹھی شلوار کے سوراخوں میں جھانکتے ہوئے بدن کے کچھ حصوں کو بوسیدہ اور مٹی سے چھپانے کی تاک م کوشش کرتی ہوئی تو کچھ چادر اور سے بھی محروم۔

یہ سب لوگ تقریباً ایک ہفتے سے گاؤں میں زمین کے ایک نیم خشک حصے پر پناہ گزین تھے۔ ایک تو وہ تقریباً سب کے سب غریب اور دوسرے شدید سیلاب ان کا سب کچھ ہمارے لیے لے گیا تھا۔ گھر، بار، بستر، چادر، برتن، بھانڈے، مال موٹی اور ان کے سینے چالیس مرد و زن کو بھی مگر ”مردے“ ان سے مسئلہ نہیں تھے۔ بھوک..... پیاس..... پیٹ کی آگ جھانے کا سامان..... یہ تھے ان کے مسائل اور ان کا کل۔ خالی پیٹ روٹی مانگ رہا تھا۔ کھلے آسمان تلے انہیں کسی چھپر کی ضرورت تھی۔ سکر کے نیچے چٹائی اور سر کو آرام دینے کے لیے ٹکیے۔ کچے گھر اور جگیاں تو سیلاب کے شدید ریلے میں بہہ چکی

”راستے میں سے کچھ کھا لیتا۔“ پانی بھی کسی نیوب ویل یا کنوین سے مل جائے گا۔“

مگر 125 افراد..... ہر برس میں..... اور روپے؟ محض دو ہزار..... یعنی 15 روپے فی کس..... صرف اڈو پھاڑوں کے دام..... مگر یہ بھی نعمت تھا۔ کچھ اور اٹھتے تو شاید کھنکھ کی بھی لمبی گولیاں کھاتے۔ بہر حال گاڑیاں روانہ ہوئیں اور چھٹنے کے دھوار گزار اور صبر آزماسفر کے بعد یہ لوگ کراچی پہنچ گئے تھے..... امدادی کیمپ میں۔

مگر اپنے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد یہ دیکھ کر ان کے دل دھک سے دھکے لگے پھر ملی زمین پر صرف چھپیں۔ تیس پچاس پرانی چھول دریاں نصب تھیں۔ کم از کم ساتھ، ستر برس پہلے، شاید انگریز بھادر کے پاکستان سے دئے ہوئے وقت انہیں اسی میدان میں چھوڑ گئے تھے۔ دو چار بوسے بڑے شامیانے بھی نصب کئے گئے تھے لیکن وہ اس قدر بوسیدہ تھے کہ ان کے اوپر حصہ یعنی ”چھت“ کے سوراخوں میں رشتی ہوا اور دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس پر مترادف یہ کہ اس سرکاری یا عوامی پڑاؤ میں ان کا استقبال کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ کوئی والی وارنٹ نہیں۔ کوئی ہم دم نہ ٹھیکار۔ قریب ترین شہری آبادی بھی ”چھپ“ سے نکلنے میں کے قاطعے پر تھی۔ ان کے لیے ایشیے خورد و نوش اور ادویات تو کجا دری، چادر اور ٹکیوں کا انتظام تک نہ کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے نہایت دشواری، اذیت، بھوک، پیاس اور چٹائی دھوپ اور گرد و آلود ہواؤں کے جھگڑ میں پورا ایک دن..... اذیت ناک چھپیں کھینے گزارے۔

پھر خدا جانے کس طرح ایک فلاحی اور رفاہی جماعت کے ذمہ داروں تک ان کی حالت ذرا کی

خبر پہنچ گئی۔ دینی اصولوں پر خدمت الناس کرنے والی یہ تنظیم امریکہ کی مردود اور ”سکرالایٹا“ کی مستوب ہے۔ اس جماعت کے عہدیداران اور کارکنوں نے ان بے کسوں کے لیے بھروسہ، مہم پہنچانے کا انتظام کیا۔ کھانا، صاف پانی، لباس، دوا، علاج، بستر، کتبے، برتن، بھانڈے، حتیٰ کہ زر تعلیم بچوں کے لیے پڑھائی کا بندوبست بھی۔ کامل تین ماہ تک یہ افلاس زدہ سیلاب کے مارے اس جماعت کے سایہ عاطفت میں رہ کر اس کا کلکہ پڑتے رہے مگر ان کی ”پارٹی“ کے کسی عہدیدار تو کجا کارکن نے بھی ان کی خبر نہ لی۔ اس دوران ان کی کوششیں سیلابی پانی اتر چکا تھا اور اب ان کو اپنے علاقے کی سیاستوری تھی۔ جب اسی خواہش کرنے والوں کی خاصی تعداد ہو گئی تو اس تنظیم کے کارکنوں نے انہیں ان کے گاؤں تک پہنچانے کے لیے شادانہ اور آرام دہ، انٹرکنٹیننٹل کوچر کا بندوبست کیا۔ جب یہ کارواں روانہ ہونے لگا تو زارادہ کے علاوہ ضروریات پوری کرنے کے لیے 2 ہزار روپے فی خاندان نقد رقم تقسیم کئے گئے۔ پھر ان کو دکانوں کے ساتھ رخصت کیا گیا مگر۔ مگر بسوں کے روانہ ہونے سے پہلے ایک سیلاب زدہ نے کسی محرم لیڈر کا نام لے کر گھر باند کیا: ”بئی ای ای ای ای ای۔“ قافلے والوں نے اس کا ٹلک ٹلک جواب دیا: ”بندھا ہے۔“ اور پھر یہ ”غریب اور بے کس لوگ“ جماعت والوں کو مت چڑاتے اور کھلے دکھاتے ہوئے چل دیئے۔ آخر انہیں رہتا تو اپنے گاؤں ہی تھا ناں؟

عارضی ہسپتال

گاؤں کا زیادہ تر حصہ ٹکی کی فٹ گہرے سیلاب میں ڈوبا ہوا مگر کچھ نہایت خشک قطعات ہی سیلاب زدگان پناہ گزین کے تھے۔ ایک نیلے پر

”ڈاکٹر“ اور ”نرس“ بھی اپنی اوقات میں آ گئیں۔ ”ڈاکٹروں“ میں سے کچھ پٹاری تھے اور چند کلینک انہار کے کلرک۔ نرسیں..... رہیں ”نرس“ تو وہ بھی بس اینیو ہی تھیں۔ جعلی..... اکا دکا حکمران۔ منسوبہ بندی کی ”بندی“ اور کوئی ”پارٹی“ کی کارکن۔ روپیہ پیسہ جیسے میں ڈالا اور سامان کو قرضے میں کر کے یہ لوگ بھاگ نکلے۔ ”ہسپتال“ کا خاتمہ ہوتے ہی وہاں بھردی خالی زمین باقی رہ گئی۔ خشک..... پتھر کی..... بے آب و گیاہ..... اصل حقدار پانی کے اس پار کھڑے شرجی تھے اور پولیس کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ کچھ دیر بعد حکمران پر خاموش ہو گئے۔ اب ان کے پاس کیا بچا تھا..... بھوک..... تنگ..... ”بھوک“ کی بے نیازی بلکہ سنگ دلی کے سوا؟

سان

شہزادی کو بس اتنا یاد تھا کہ گاؤں میں جب شہید سلانی ریل داخل ہوا تو وہ اگلے روز کے لیے سائنس کے آزمائشی امتحان سے متعلق چند سوالات کے جواب یاد کر رہی تھی۔ اس کا گاؤں؟..... گاؤں نہیں بلکہ ایک بڑا قصبہ تھا جسے چھوٹا سا شہر کہا جاسکتا تھا۔ یہاں زندگی کی تمام بنیادی سہولیات موجود تھیں۔ شہید بارشوں کے باوجود جیسے میں بہت کم نقصان ہوا تھا۔ جانی اور مالی دونوں..... نہ ہونے کے برابر۔ زیادہ تر مکان پختہ تھے جبکہ سڑکیں اور گلیاں بھی پختہ تھیں لیکن قصبے کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہاں سے منتخب ارکان قومی و صوبائی اسمبلی سرکاری پارٹی کے ارکان یا عہدیداران نہ تھے۔ دونوں شریف اور عوام کے خدمت گزار۔ اس لیے وہاں بدحاشاؤں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے جنہوں نے راکٹوں رات بلکہ شام ہوتے ہی سے مطمئن کر دیا اپنی زمین اور گھروں کو بچانے کے لیے نہر کا خائن

دے۔ ایک تقریباً پوڑھا اور دوسرا جوان مردوں بارش..... جنھوں سے اونچی سفید شلواروں والے..... سر پر عری رومال باندھے..... شہزادی ان لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گئی اور اپنے ہاتھوں سے سینہ چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی مگر بوڑھے نے اپنے سر کا بڑا سا رومال اسے دیا اور شفقت کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شہزادی نے خود کو اس رومال سے چھپایا۔ بوڑھے نے اسے بتایا کہ وہ ایک دفاعی تنظیم کا نمائندہ ہے اور اسے امدادی کیمپ میں پہنچا دے گا۔ دلکش اور بھرے بھرے بدن والی شہزادی کسی حیرت زدگی کی طرح بغیر کچھ کہنے ان کے ساتھ چل پڑی۔ کچھ فاصلے پر ایک جیپ کھڑی تھی۔ شہزادی کو اس میں سوار کی کے مولوی نما یہ دونوں افراد نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ شہزادی پر دوبارہ غشی طاری ہوئی اور اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

اس بار جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آرام دہ بستر پر پڑا پایا۔ دونوں ”مولوی“ اس کے قریب کھڑے تھے۔ ان کے سامنے ایک بھاری بھر کم، بوڑھی لیکن سرفی پاؤڈر میں لٹی جتی عورت تھی۔ پوڑھا درویش، رفاہی کارکن کہہ رہا تھا: ”اوپھی پانی! ایک لاکھ سے کم میں یہ سودا نہیں ہوگا..... دیکھو..... کیسا گورا مال ہے۔ ایک لاکھ روپے تو اس کی صرف ایک رات کی قیمت ہے۔“

”او جی ٹھیک!..... بالکل ٹھیک!.....“ بوڑھی نے قہقہہ لگا کر کہا اور شہزادی کا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا..... اب وہ اتنی جتنی بھی نہ سمجھتی کہ یہ بات سمجھ نہ سکتی کہ آئندہ زندگی میں تاریکیاں ہی اس کا مقدر ہوں گی۔

بند ترزا کے سلانی ریلے کا رخ شہزادی کی بستی کی طرف پھیر دیا۔ شہزادی کا پختہ اور خوبصورت مکان شہر کے کنارے واقع تھا لہذا سیلاب کے پہلے ہی بے میں اس کا مکان غرقاب ہو گیا۔ پھر اسے یہ خبر نہ ہوئی کہ اس کا گھر کس طرح مگر؟

اس کے باپ، بھائی اور دونوں بھائی کہاں گئے؟ اس گائے کا کیا بنا ہے وہ اپنے ہاتھوں سے چارہ کھلایا کرتی تھی؟ اس کی کتا میں..... بستر..... قلم..... پینسل؟..... دلکش سکول یونیفارم..... عام استعمال کا لباس..... سب غائب۔ خدا جانے وہ خود زندگی کس طرح بچی؟..... سیلابی لہریں اس کے لیے غشی کیوں کر بن گئیں جنہوں نے اسے شہر کنارے لا چھوڑا؟..... اب تو اس کے سر پر وہ بھی نہ تھا..... بس وہ تو صرف دو کپڑوں میں لپٹی تھی..... پانی میں تھکی..... ڈوبی..... تین دن کی بھوک پیاسی..... اس کا دماغ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے چاروں طرف نرہ مرد وزن اور موشوں کی لاشیں تھیں..... صرف لاشیں..... اگر کوئی زندہ وجود تھا تو صرف وہ خود تھی۔

بارہ سالہ شہزادی بیت اکبر چاڑھ کو گھوڑا انڑ پور کی رہائی تھی۔ باپ ایک بڑا کھانا کسان جو اسے بھی زور تعلیم سے آراستہ کر رہا تھا۔ انڑ پور میں تعلیم کا عام رواج تھا کہ وہاں کے لوگ دور جدید کے تقاضوں سے آشنا تھے۔ شہزادی ایک اچھے سکول میں انھوں جماعت کی طالبہ تھی۔ ایک شب اس کا پورا گھونسا بھگا۔ سلانی ریلے اس پر بھا کر لے گیا۔ اس کی زندگی اب بھی اس لیے وہ بچ گئی۔ اب نہر کے کنارے پڑی ہوئی کتنی قیمتی امداد کی منتظر تھی۔

اجا ک سامنے سے دو نیک مرد آتے دکھائی

عامرات بھر جاگ کر سنے کو دیکھتے اور وہ سو جاتے تو میں جاگ کر دیکھتی۔ اس کی بڑی بڑی شرعی آنکھیں باپ جیسی تھیں اور ہونٹ ٹھوڑی ہانکلیں میرے جیسی۔ آپا کہتیں، عمار بہت عکس مند ہے اس نے ماں اور باپ دونوں جیسے نقش لیے ہیں تاکہ یہ دونوں خوش رہیں۔

والدین کا ساتھ ان کے مصمم ہے لے انہیں نجات کا راستہ فراہم کر دیا

کتاب پڑھتے پڑھتے میں نے کرود بلی اور پیٹ کے بل لیٹ کر کتاب کو زینت پر رکھ کر پڑھنا شروع کیا، اور مجھے یاد آیا کہ ابو کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکی اپنی نظر کا ستیا س کر دے گی۔ جتنی ڈانٹ مجھے اس اعزاز پر پڑھنے پر کھائی پڑتی اتنا ہی مطالعہ کا



روگ تھی۔

جانے اپنے وجود کی نفی ہونے کی بنیاد کا اثر تھا یا قدرت نے میری ناشکری کو ناپسند فرمایا کہ میں خون کے دریا میں ڈوبتی چلی گئی۔ جانے کب تک ہوش اور بیہوشی کی صلیب پر لکھتی رہی۔ جب آنکھ کھلی تو مجھے اپنا آپ خالی سا لگا۔

سب کے مچھالے چھروں پر میرے لیے ہمدردیاں ہی ہمدردیاں تھیں۔ عامر نے جب میرے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے لمبی دینی چاہی۔ تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں جو ماتا کے جذبے سے نا آشنا تھی اپنے ایک لہجہ میں کیسے ماتا سے بھر گئی اور میں سن سکتے ہوئے کہا مجھے میرا بچہ تو دکھا دو۔ نس نے جب ایک ٹرے میرے سامنے کی تو تھے ہوئے جیسی خون میں وہ پلاسٹک کے گڈے جیسا سورہا تھا۔ اس طرح سرخ جلی میں وہ سفید تھا وجود یوں فٹ تھا جیسے سرخ بیک گراؤڈ میں لگے پلاسٹک آف پیس کا بٹ۔

بٹے دیکھتے ہی میرے سینے میں سناہٹ سی ہو گئی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھلنے لگا۔ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد جب میں اپنے بیزدوم میں آئی تو وہ بھی مجھے اپنے پیٹ کی طرح خالی خالی لگا۔ عامر نے میرے کمرے سے تمام تصویروں جو آپا نے مختلف کینڈروں سے کاٹ کر لگائی تھیں، ہٹا دیں۔ وہ مجھے جب پیار سے ہمدردی سے سینے سے لگاتے تو میں سک اٹھتی اور کہتی، عامر خدا نے مجھے میرے ناشکریے پن کی سزا دی ہے۔ اگر میں اپنی ذات کو ثانوی سمجھتی تو خدا مجھ سے یہ نعمت نہ چھینتا۔ عامر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتے..... بلی گھبراؤ نہیں۔ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ ان کی یہ بات سن کر میرے ہونٹوں پر ایک شرمساری

شادی کے بعد پڑھا ہی وغیرہ تو کیا ہوتی، کوئی مزیدار کہانی پڑھتے ہوئے میں بے خیالی میں اپنے انداز سے لیٹ جاتی۔ ابھی میں نے آدھا صفحہ ہی پڑھا تھا کہ آپا کی چٹ سٹائی دی۔ ارے یہ کیا کر رہی ہو۔ جانے ان کی آواز میں کیا تھا کہ میں اچھل پڑی اور ساتھ ہی پیٹ میں اسٹے زور سے تل پڑا کہ بے ساختہ چٹ چٹ لگتی۔ اگر آپا کی جلدی سے آگے بڑھ کر سنبھال دیتیں تو میں شاید گر جاتی۔ مجھے سنبھالنے ہوئے انہوں نے جھڑوتے ہوئے کہا: اتنم یہ لڑکیوں والی کرکٹیں چھوڑ دو۔ اتنم ایک ذمہ دار عورت ہو اور یہی نہیں اس وجود کا دھیان رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ جانتی ہو اس طرح پیٹ کے بل لیٹنے سے اس کا سر چھٹا ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی میں خوفزدہ ہو گئی..... بھلا ایک ایک کیسے چاہے گی کہ اس کا بچہ Deframed ہو۔

یوں ایک سے دودھ دودھ ہونے کی وجہ کے احساس نے جہاں مجھے جینے کے نئے انداز سکھائے وہیں میرے ڈاؤن پڑوں..... سرال پیسے میں لنگھو کا محور بھی صرف میں ہی بن کر رہ گئی۔ یہ کرو! یہ نہ کرو! صبح آنکھ کھلتے ہی آیا دودھ کا پیالہ لیے سرہانے کھڑی ہوتیں۔ دودھ دیتی ہی مجھے الٹا نکالیں گی آنے لگتیں لیکن بھر یہ سوچ کر کہ دودھ پینے سے بچے کا رنگ دودھ جیسا ہو گا میں انکھیں بند کر کے پیالہ تمام لیجی..... بھیجی بھی تو مجھے اس بچے پر فخر آنے لگتا..... جس کی فکر ہر شخص کو دامن گیر تھی.....

اور میں سوچتی میری پسند ناپسند سب اس کی وجہ سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر شخص میرے وجود کی نفی کر کے ایک ان دیکھے وجود کو اہمیت دینے جا رہا ہے۔ میرا وجود میری ذات صرف اس لیے اہم تھی کہ ایک نفا وجود میرے اندر کھلا رہا تھا۔ عامر کو مجھ سے لڑا وہ اس وجود کی فکر تھی اور میری حیثیت ثانوی ہو کر

ہوتی جا رہی تھی۔ آپا نے گھر میں ایسے رسائل اور ایسے لوگوں کا داخلہ بند کر دیا تھا جن رسائل میں Deframed پھول کی تصاویر ہوتیں یا جن گھروں میں کوئی بچہ اپنا دل ہوتا۔ آپا ان عورتوں سے بھی مجھے بتائیں جن کے بچے ضائع ہو چکے ہیں کو کوئی سایہ نہ ہو جائے۔

اور آخر وہ لمحہ آن پہنچا جس کے لیے میں نے اپنی ذات کو بھلا دیا تھا۔ کروٹ کے بل لیٹا بیویوں کی تھی۔ میرا کھانا پینا، سونا جانا صرف اور صرف یہ مقصد لیے ہوئے تھا کہ میں ایک ہی زندگی کو ختم دینے والی ہوں۔ میں نے جب آپا کو وہ سوٹ دکھائے جو بیٹے کی پیدائش پر میں نے انہیں اور عمار کی دوسری بیویوں کو دینے تھے۔ عمار کو جب یہ چلا کر بنگلے کے خرچ کے لیے بھی میں نے کبھی ڈال کر پیسے جمع کیے ہیں تو وہ دھمکا اٹھے۔ ہسپتال جاتے عمار بار بار میرا ہاتھ تھام لیتے۔ آپا سورتیں پڑھ کر دم کرتی جاں میں بی۔ لیبر روم میں آپا نے قرآنی متشخص پیالے میں بی بی کی فاطمہ کا بیچ (ایک پودے میں بی بی فاطمہ نے بیٹے کی پیدائش کے وقت پھیلا تھا) پانی میں ڈال دیا اور کہیں گیس جب یہ پودا کھل جائے گا جب تم مجھے و جد کو دنیا میں لے آؤ گی۔

میں درد کی صلیب پر لگی۔ ڈاکٹر اور آپا کا ہاتھ تھامے ان کی ہدایات پر عمل کرتی گئی کہ اگر ایسا نہ کیا تو صحتی جان کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔ ڈاکٹر جب درد کی شدت میں ہونے پہنچ لینے کے لیے کہتی تو میں اسے ہونٹ کاٹ لیتی اور سوچتی کیا اس درد سے بھی کوئی زیادہ درد ہو سکتا ہے۔ درد کے سمندر میں ڈوبے ہوئے جب میں بیہوش ہوتی جا رہی تھی تو صحتی مٹی دھلی آوازوں نے مجھے درد کے سمندر سے نکال لیا۔ وہ سکھ کا لہو۔ میرے لیے بہت

ہے یا لڑکی۔ بس جانتی تھی تو یہ کہ وہ پورے کا پورا میرا ہوگا۔

ساتویں مہینے جب میرا بچہ کھانے کو بیٹھ نہ چاہتا اور دل حلتانے لگتا تو آپا کہیں کہ بیٹے کے بال جب معدے کو چھبے ہیں تو دل حلتانے لگتا ہے۔ ان کی اس جالانہ بات پر میں پوری طرح یقین کر لیتی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ کبھی ہی جان تو ایک جہلی میں بند ہے۔ آپا جب مجھے اس برہمن کا ذکر سنا میں تو میں ہنسی پھینکی کہ میں اس دفعہ بھی کھانا نعمت یا ناشکری کے ہاتھوں اسے گناہ نہ ٹھہروں۔ آپا نے جب پہلی بار مجھے کہا تھا کہ جو کھانے کو کبھی چاہے ضرور کھانا کہ یہ تمہیں وہ آئے والا وجود مانگتا ہے کہ ایک برہمن زادی نے جب کسی چمار کے ہاں گوشت کھاتے تھے تو کھانا اور اس کا کھانا کو کبھی چاہا تو اس نے مانگ کر کھا لیا۔

جب شوہر کو یہ چلا اس نے بیوی کو بھرشت ہونے کے کارن قتل کر دیا لیکن جب پیٹ سے بچہ برآمد ہوا تو گوشت کی بیوی نے بچے کے منہ میں دیکھ کر وہ برہمن بچھڑا کہ یہ فطری بیوی کی نہیں بلکہ اس بچے کی فطرت جس نے گوشت کھانے کی خواہش کی اور ماں نے یہ خواہش پوری کی تو میں نے قتل کر دیا۔ لہذا بی بی جس چیز کو کبھی چاہے ضرور کھانا ہے یہ تمہارے لیے ہی ضروری نہیں ہے بچے کے لیے بھی ضروری ہے۔ مجھے اسے جب بھجلی مرتبہ آپا نے یہ واقعہ سنایا تھا تو میں بہرہ دل ہٹا کرتی تھی لیکن اس بار میرا خیال چیز کو کھانے کو کبھی چاہتا تو بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا نہ چیز اس لیے کھاتے کہ میرے بچے کا دل چاہا ہو گا۔ نویں مہینے کے شروع میں آپا رات کو کبھی کبھی سرسبز کھیتے کو دیتیں اور میری گرم دودھ میں اصلی مٹی ڈال کر اور میں خاموشی سے بی بی تھیں۔ جوں جوں دن قریب آتے جا رہے تھے میں زیادہ دھی

چھلک پڑی ہیں۔ وہ بھی تو ان ننھے ننھے بچوں کو ترس رہی ہیں کہ آپا نے غور سے میری گھنٹی کو دیکھا اور مجھے سینے سے لگایا اور میرا منہ جو تھے ہوئے سرگوشی کی کرٹھیا بننے والی ہے۔

ڈاکٹر نے جب چیک اپ کے وقت بتایا کہ مجھے یا نچو اس مہینے ہے تو میں خوش اور حیرانی سے ڈاکٹر کو کھنگلے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس دولت سے لالہ ہوں اور مجھے ہی نہیں ہے چلا۔ آج بھی میری چھٹا مہینے یہ راز نہ نکلیں تو مجھے کیسے یہ چلا۔ جب پہلی مرتبہ میرے وجود میں اس کی کلیاٹ محسوس ہوئی اور یہ بھی اچھا ہی ہوا ورنہ یہ باجھ بیٹے میں کیسے گزرتی کہ اس سے پہلے جو تھے مہینے کے آخر میں یہ حادثہ ہوا تھا۔ یہ چار مہینے میں کیسے گزرائی۔

ڈاکٹر صاحب نے جب مجھے کہا کہ ہر ہفتے چیک اپ کے لیے آنا ضروری ہے اور جب آپا نے ڈاکٹر کو سوا ٹوٹ دیا تو میں نے سوچا۔ آخر ہر ہفتے یہ لالہ ٹوٹ کہاں سے آئے گا۔ عمار نے سنا تو کہنے لگے میں اور ناٹم لالہ کر لوں گا۔ تمہارے علاج میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

نعمت چمن جانے کے بعد جب دوبارہ ملے تو انسان اس کی قدر میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ میں پہلے مانتا کہ جب بچے سے نا آشنا کسی لیکن اب ماں بننے کے لیے ایک ایک لمحہ کو خوشی خوشی بسر کر رہی تھی۔ جب وہ میرے پیٹ میں کلیاٹا تو میرا خیال چاہتا سب کو یہ چلے۔ پینٹ اپنا پیروں سے چھو کر اسے محسوس کرتی اور سوچتی جانے وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ جانے اس کی صورت کیسی ہوگی اور مجھے بھی کبھی آتی ہے۔ وہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ جس کی میرے پیٹ میں پھیلی رہا تھا لیکن میں نہ تو اس کی صورت سے شناسا کی اور نہ یہ جانتی تھی کہ وہ لڑکا

سے ہمیں مسکراہٹ آگئی اور میں نے کہا ”ہم بھی خوب ہیں۔ اس کی منتوں کی ناشکری کرتے ہیں اور جب وہ ہمارے اعمال کے نتیجے میں انہیں واپس لے لیتا ہے تو ہم اپنی باتیں کو بھول کر یہ بھی اس کے سر ڈال دیتے ہیں کہ اس کی رضا جیسا بھی ہماری قسمت خراب ہے۔“

میری بات کے جواب میں عمار نے مجھے دوائی کا پیچہ پلایا اور میں نیند کے، دھندلوں میں گم ہوتی چلی گی۔

دن مہینوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ شادی کی سالگرہ پر جہاں لوگ مجھے مبارکباد دیتے وہیں میری خالی کھکھ کے لیے ہمدردی کرتے تو میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی۔

میری پور پر مانتا کہ جذبے میں ڈوب چکی تھی۔ میں جو بچی دھندہ بہتی تھی کہ ابھی تو میرے گھوٹے پھر نے اور عمار سے پیار کرنے کے دن تھے، یہ مصیبت کیوں لگے میں آن پڑی۔ اب عمار کے قریب جاتی تو ایک بیٹے کی خواہش لے کر۔ ڈاکٹر، کوئی عیز، مزار میں بھکاریوں کی طرح بیچے کے لیے بھجوا بیٹھائی۔

بیوی بوڑھیاں انہیں ارے! ابھی تم دونوں جوان جہان ہو۔ اللہ بھی نہ کبھی رعت کرے گا تو مجھے اپنا آنگ اگ صرف اور صرف ایک چیز کا تمنائی نظر آتا کہ کب یہ سوچی شام بری ہو۔ کب یہ خالی کھکھ بھر جائے۔

میں کرسی پر بیٹھی خالی الذہن سامنے کی تصویر کو دیکھ رہی تھی کہ مجھے کچھ میری چھاتوں سے گرم گرم دودھ کی چھوڑ لگی ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا دم سمجھا لیکن جب دیکھا تو میں ہنسی چلی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو برہم آئے۔ شاید بچے کی تصویر دیکھ کر میری آنکھوں کے ساتھ ساتھ چھاتیاں بھی

اپ رہنا چاہیے۔

شروع میں ہی اس صدمے نے ہمیں مایوس کر دیا۔ میں اور عامر پہرے دوں غمناک رہے (یہ نام دادی اماں نے رکھا تھا) اب آہستہ آہستہ مجھے دو انکسوں، ڈاکٹر کے نام ازیں ہو گئے۔ عامر کو میں نے تھپی دے دیا کہ وہ دفتر چلے جائیں لیکن وہ غمناک ایک لمحہ نہ چھوڑے۔ ڈاکٹر کے ہونے لگتا اور ہم اسے ہسپتال پہنچنے لگے اور آکسیجن لگتے ہی اس کا رنگ پلٹ آتا۔ عامر کو مسلسل نوکری سے غیر حاضری کے بعد جواب مل گیا لیکن جانے وہ اتنا پیسہ کہاں سے لائے کہ شہر بھر کے ڈاکٹر کو لئے اور نمبر ہمارے گھر پہنچے ہوتے تھے۔ پچھلے دنوں نے وہی جوڑے پہنے جو میں نے بیٹے کی خوشی میں بنوائے تھے۔ غمناک سرخ ستاروں پر ٹوٹی اور سرخ فراک پہنا یا تو میرا منہ دھلکا گئے لگا۔ نظر اتارنے کے لیے میں نے کالا تنک اس کے کان کے پیچھے لگا دیا۔

ایکسرے، ای۔ سی ٹی، الٹرا سوک تمام مشینوں کے نام مجھے یاد ہوتے چلے گئے۔ عامر رات بھر جاگ کر سنے کو دیکھتے اور وہ سو جاتے تو میں جاگ کر دیکھتی۔ اس کی بڑی بڑی شریقی آنکھیں باپ جیسی تھیں اور ہونٹ ٹھوڑی بالکل میرے جیسی۔ آپا کیتیں، غمناک بہت عقل مند ہے اس نے ماں اور باپ دونوں جیسے نقش لیے ہیں تاکہ یہ دونوں خوش رہیں۔

اس دن رات سے ہی میری طبیعت اداں تھی۔ جانے میں بدحواس کیوں ہو رہی تھی۔ آج میرا منہ دواہ اور دس دن کا ہو چکا تھا۔ پھر میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ عامر نے نہاتے ہوئے دوبارہ مل بند کر کے پوچھا۔ منارو تو نہیں رہا اور آخر تو لپٹے باہر نکل آئے اور کہنے لگے یار تیرے پاس رہوں تو

بڑی خوشخبری لایا۔ مبارک سلامت کے شور میں، میں سو گئی۔ خواب میں دو نئے نئے ہاتھ میری طرف بڑھتے رہے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد جب منے کو میں نے چھاتی سے دودھ پلانے کے لیے لگایا تو میری توتلی ہاتھ کو جیسے قرار مل گیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ دودھ پیسہ کر پلایا کرنا۔ منے کو گود میں لیے جب میں گھر میں داخل ہوئی تو ذرے ذرے نے میرا سواگت کیا۔ بھٹی مٹی چھین میرے سونے انگن میں شہنائی کی طرح کو بجھنے لگیں۔ تار پر نئے نئے فراک اور ٹینکوں دیکھ کر میرا رواں رواں تاپنے لگا۔

دواں نہلاتے ہوئے آپا نے مجھے سرخ جوڑا پہنایا۔ باداموں اور گھی والا دودھ پلایا جس میں ہلدی اور اجوائن ڈالی گئی تھی اور منے کو میری گود میں ڈالا۔ منے کو دودھ پلانے لگی کہ مجھے لگا جیسے اس کا رنگ نیلا ہوتا جا رہا ہے۔ بچانے میں کب تک چینی رہی تھیں میں ہسپتال پہنچنے تک میرے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد منے کو آکسیجن لگا دی۔ میں اور عامر پاگلوں کی طرح ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگے اور پھر آہستہ آہستہ منے کا رنگ بدلنے لگا۔ اسے نارمل ہوتے دیکھ کر میری چھاتی سے دودھ کی چھواریں بہنے لگیں۔ اس نے اپنے منے سے ہونٹوں سے جب مجھے تھما تو مجھے لگا جیسے میرا وجود ہلکا ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ بچے کی ای۔ سی۔ جی بلڈ ٹیسٹ اور جانے کتنے ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ بچے کا دل دائیں سائیڈ پر ہے اور ہمیں ہر وقت اس کا دھیان رکھنا ہے کہ اس کی آرٹری vane دب جانے کے باعث اس کا جسم نیلا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ میرا دل بھی دائیں سائیڈ پر ہے لہذا یہ گھبرا نے والی بات نہیں۔ ہاں خون جسم کو نہ سلائی ہونا خطرناک ہے لیکن بچے کی مناسب نگہداشت اور مستقل چیک



گم ہونے کا احساس

خاور قوم

ہمارے آس پاس بے شمار ایسے افراد موجود ہیں جو بے مثال صلاحیتوں کے باوجود گم نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ گم نامہ موجود کسی بھی طرح اپنے دیگر معبود ہم معصوموں سے کم تر نہیں بلکہ مناسب بارگاہ تک نہ ہونے، وسائل اور سہانے کی کمی اور دیگر گئی وجوہات کی بناء پر یہ لوگ خود کو دنیا کے سامنے منور نہیں پاتے۔

لا جواب صلاحیتوں کے باوجود گم نامہ زندگی بسر کرنا ہے احساس

احرام اور عزت ہے۔ اکثر لوگ خود ان جیسا بننا یا اپنے پیاروں کو ان جیسا بنانے کی خواہش دل میں بسائے رکھتے ہیں مگر ہم میں سے اکثر لوگ یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ ایسے کا سیلاب اور ارب پتی لوگوں کے علاوہ بے شمار ایسے بھی ذہین اور باصلاحیت تفلین کار ہیں جو اپنی حیثیت میں لا جواب ہیں مگر ساری عمر گم نامی کی زندگی گزار کر خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنی

ہم زیادہ تر ان لوگوں کو یاد کرتے اور اسکے مداح ہوتے ہیں جن کی ایجاد کردہ چیزوں نے براہ راست ہماری زندگیوں پر اثر ڈالا ہے اور ہمارے روزمرہ معاملات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ جیسا کہ انٹرنیٹ کے موجودہ دنوں سرن، فیس بک کے خالق مارک ڈوکر برگ اور پہلی ائی سیل ویب سائٹ ہائٹ میل کے مؤجد اور انیسکرو سائٹ کے بانی بل ٹیلن جیسے لوگوں کے لیے ہر کسی کے دل میں بے انتہا

اس کے چہرے پر اتنا سکون اتنی شائقی تھی کہ میں اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ایک نرس کہنے لگی ذرا بیچے کو پیچھے کیجئے۔ دوسرے مریم کو ساتھ لے دوں۔ میں نے کہا نہیں، اسے بلانا نہیں۔ وہ سو رہا ہے کہ پیچھے سے عامر کی بیچ سناٹی دی۔ (He is gone) جانے اس کی آواز میں کتنا کرب تھا۔ ڈاکٹر کی فوج ادھر چلی آئی۔ مجھے اور عامر کو باہر نکال دیا۔ دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا۔ وہ میرے بیچے کا چہرہ ڈھانپ رہے تھے اور مجھ سے الے ہم گھر آئے۔ اس کو نہلا دھلا کر جب لے کر چلے تو عورتیں سرکشاں کر رہی تھیں۔ بی بی تم تم کہا لو ورنہ تمہارا سایہ دوسری عورتوں پر پڑ جائے گا۔ میں نہانے کے لیے لگی تو دودھ بہہ بہہ کر میری سس بھونک رہا۔ نہانے کے بعد عورتوں نے میوہ میری گود میں ڈالا۔ دوسرے دن میں قبر پر گئی تو جانے اتنا دودھ کہاں سے آیا۔ دودھ کی ندیاں بہتی رہیں اور رات بھر فیک گب کپ سے اپنا دودھ پھوڑتی رہی۔

دوسرے روز جب میں سو کر اٹھی تو عامر کپڑے پہن کر تیار ہو رہے تھے۔ وہ گھر سے باہر نکلے۔ میں دروازے تک پہنچنے کے لیے آئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھے۔ پھر میری طرف واپس آئے اور مڑ کر کہنے لگے۔ جان اگر مرنا زندہ ہوتا تو میں ایسے نہیں اکیلا پھوڑ کر جا سکتا تھا؟ اگر میں گھر سے نہ نکلتا تو تیری فکری کہاں سے ملتی۔ لوگوں کے قرض کیسے اترتے؟ منے نے جا کر ہمیں اس خوف سے نجات دلا دی کہ جانے اب کیا ہوگا۔ عامر یہ کہہ کر تیزی سے پلٹ گئے۔ میں سوچنے لگی، اچھا، وہاں جو مٹا چلا گیا۔ اب مجھے کوئی فکر، کوئی ڈر تو نہیں رہا۔ اب نجات ہی نجات ہے۔ شائیت ہی شائیت ہے۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے تار پر پڑے منے کے کپڑے سینے میں دھون کر دیئے۔

دل مطمئن رہتا ہے ورنہ ایک پل کے لیے ادھر ادھر ہو جاؤں تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ میں کہتا چاہ رہی تھی کہ کب تک گھر بیٹھے رہو گے۔ آخر گھر کا خرچہ، ڈاکٹر، لیکن یہ کیا مٹا ایک دم نیلا سا لگا۔ ہم دونوں اسے لیے ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر جو حارشی شکلوں سے آشنا تھا پہچان گیا۔ لیٹرے کچھ کہے، مٹا ہم سے لیا اور مٹینوں میں لے گئے۔ جلدی جلدی سے اس کی لگائی، اسے زور زور سے جھپکتے رہے۔ اس کے ماتھے پر ٹپکے لگائے اور ماتھے پر ہی ڈرپ کی سوئی لگائی اور مجھے کہا کہ میں دیکھتی رہوں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے اس کی سسٹنر رکھ دیکھا۔ اس میں بیٹے لمبے میرے بیچ کی زندگی کی نوید سناتے۔ قطرہ قطرہ گلو گلو اس کے ماتھے کے راسے جاتا۔ مجھے یہ آس دلاتا کہ مٹا ٹھیک ہے۔ رات بھر یہ سلسلہ چلا رہا۔ میری چھاتیاں دودھ بے پیسنے لگیں۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا کیا میں اسے دودھ پلا دوں۔ ڈاکٹر نے مجھے اور عامر کو دیکھ کر اجازت دے دی۔ اس کے ہونٹوں میں کچھ کھانے کی سکت نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے دبا کر قطرہ قطرہ اس کے ہونٹوں میں اتارا اور پھر منے سے چند گھونٹ میرے دودھ سے لے کر پیئے۔ جب ڈاکٹر نے اسے دوبارہ مجھ سے الگ کر کے اس کی مامک پھانپا تو اس کے ہونٹوں سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کوئی بڑا آدمی درد سے کرا رہا ہو۔ رات کے بعد دن نکلا۔ سورج کی کرنوں کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا شاید یہ سورج میرے لیے روشن ہوا ہو۔ شاید یہ امانت ٹھیک ہو جائے اور پھر یہی سوچتے سوچتے مجھے انگھ آگئی۔ گھبرا کر دیکھا۔ اس کی سس میں لمبے پلن رہے تھے اور قطرہ قطرہ ڈرپ بھی جا رہا تھا۔ منے نے اب کراہنا بند کر دیا تھا۔ ساری رات جاگنے اور کراہنے کے بعد وہ سکون سے سو گیا تھا۔

ایجاد کردہ چیزوں سے ہمیں کسی نہ کسی طرح فائدہ پہنچتا ہے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم انہیں وہ مقام اور عزت نہیں دے پاتے جس کے وہ حقدار ہیں اور انہی کے جیسے دوسرے موجد معاشرے میں اعلیٰ مقام اور کامیابی سمیٹ لیتے ہیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ گمنام موجد کسی بھی طرح اپنے دیگر مشہور ہم عصروں سے کم تر ہیں بلکہ مناسب مارکیٹنگ نہ ہونے، وسائل اور سرمایے کی کمی اور دیگر تکنیکی وجوہات کی بناء پر یہ لوگ خود کو دنیا کے سامنے منو نہیں پاتے۔ مثال کے طور پر جیک ڈائمنگ نامی شخص کو ہم میں سے بہت کم لوگ جانتے ہیں لیکن اس شخص نے ان لوگوں پر ایک احسان عظیم کیا ہے جو ہمیں پرانے ٹائپ رائٹرز پر ٹائپنگ کا کام انجام دے کر اپنی روزی روٹی کما تے تھے لیکن جدید کمپیوٹر کے آنے سے یہ لوگ بیروزگار ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ جیک ڈائمنگ نے ان لوگوں کے لیے یو ایس بی USB ٹائپ رائٹر ایجاد کیا ہے جو کسی بھی کمپیوٹر سے منسلک کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ نئی تکنالوجی سے نابلد لوگ اپنی پرانی روشنی کو برقرار رکھتے ہوئے روزگار کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اب یہ ٹائپ رائٹرز ان لوگوں کے لیے کمپیوٹری پروڈیو بن گیا ہے اور وہ اس کی مدد سے ایسی طور پر کرتے اور ہر طرح کی کمپیوٹرنگ کا کام بھی لے سکتے ہیں۔ یہ ایک زبردست ایجاد ہے اور ان بزرگ افراد کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں جو اس عمر میں کمپیوٹر چلا نہیں سکتے۔ لیکن اس ایجاد کا موجد جیک ڈائمنگ اب بھی ایک گمنام اور عام

مبیش کا مالک نہیں ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے اپنی ہمدآپ کے تحت سائیکل کم فرار کو آکس کریم مشین میں تبدیل کیا ہے اور یہ مشین رات کے اندھیرے میں دور سے چمکنی

ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سان فرانسسکو کے ایک گمنام گروپ نے اپنی ہمدآپ کے تحت ایسا ایسا غبارہ "Weather Ballon" تیار کیا ہے جو 70 ہزار فٹ کی بلندی تک جا سکتا ہے اور یہ کسی نہ کسی سوچا ہوگا کہ ایک خالی ٹینک کو موسیقی کے آلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جی ہاں ایک خاتون ایسی ہے جس کے پاس خورد و سائنس کی ڈگری ہے لیکن وہ ایک خالی ٹینک کو موسیقی کے آلے کے طور پر استعمال کر کے میوزک ترتیب دیتی ہے۔

ایسے بے شمار لوگ ہمارے آس پاس موجود ہیں جو ہمیں ہوا سے چلنے والی گاڑی بنا ڈالتے ہیں اور ہمیں پانی سے چلنے والی موٹر سائیکل، جو کبھی سورج کی روشنی سے انفریکٹڈ مشر چلا دیتے ہیں اور کبھی اپنے ارادے کی چمکنی سے بے کار چیزوں کی مدد سے ایسی حیرت انگیز منفید بنا ڈالتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن ایسے باصلاحیت لوگوں کا ذکر ہمیں صرف دلچسپ و عجیب خبروں، ”ہیکرز“، ”ہیکرز“ جیسی ویب سائٹس یا پھر اخبارات کے اندرونی صفحات پر ہی ملتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسے باصلاحیت لوگوں سے یہ دنیا بھر پر پڑی ہے جو اپنے کھروں کے تہہ خانوں، گریجوں، باورچی خانوں یا بیڈروم کو اپنی ورکشاپ بنائے دن رات اپنے جوتن میں مگن ہیں۔ یہ میرے اور آپ کے جیسے عام لوگ ہیں لیکن ان کی تعلقات نام نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے بظاہر کھلونا نما نظر آنے والی ان کی معمولی ایجادات ایک روز دنیا کو ہلا دیں اور حیران کن پڑ پرائی حاصل کر کے ہماری زندگیوں کو بدل کر رکھ دیں۔

امریکہ اور کینیڈا میں ایسی 70 سے زیادہ ویب سائٹس بن گئی ہیں جو ایسے ہی تخلیق کاروں، موجدوں اور سائنسدانوں کو حشراتِ کروانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں جو گمنامی کی زندگی بسر کر رہے

ہیں لیکن دل میں بڑی تحقیق اور ایجاد کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ان کے پاس جذبہ بھی ہے اور کچھ کر دکھانے کا یقین بھی۔ یہ لوگ باصلاحیت بھی ہیں اور اپنی ایجادات سے انسانیت کو مستفید کرنے کی لگن بھی لے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کے لوگ اب ان لوگوں کی قدر کرنے لگے ہیں۔ دنیا کو ان کی صلاحیتوں سے روشناس کر رہا ہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ کئی کئی محلے محلے ایسے لوگ پھرے ہوئے ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے بے چین ہیں۔ ہمیں بھی ایسے گمنام شخص لوگوں کو آگے بڑھنے اور اپنے خوابوں کو کچ کر دکھانے کا موقع دینا ہوگا، کیا پتہ ان میں کون ہمارے لیے ایک اور ڈائلر عبدالقدیر خان بن جائے!

ویب ٹریفک کا ایک فیصد

آئی پیڈ یوزرز

ایک فیصد کوئی بہت زیادہ شرح غبار نہیں کرتی تاہم اس سے آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی بڑھتی تعداد کا اعزاز بخوئی ہو سکتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی تاہم نیٹ مارکیٹ میز کی شائع کردہ ماہانہ رپورٹ کے مطابق آئی پیڈ کے استعمال کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اپیل آئی پیڈ عیلت استعمال کرنے والے گلوبل ویب ٹریفک میں 1.03 فیصد کا حصہ رکھتے ہیں۔ پہلی بار آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوئی ہے۔

صرف انگل سام کی سرزمین (امریکہ) میں 2 فیصد سے زیادہ لوگ انٹرنیٹ سرفنگ کے لیے آئی پیڈ استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ مزید برآں آئی پیڈ استعمال کرنے والوں کے اعداد و شمار اس تیزی سے

اضافہ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ گزشتہ ایک سال کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ آئی پیڈ یوزرز کی تعداد میں ہر ماہ 10 فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ اعداد و شمار اس لحاظ سے بھی حیران کن اور زبردست ہیں کہ پہلا آئی پیڈ شخص 15 ماہ پہلے ہی مارکیٹ میں متعارف کرایا گیا تھا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اپیل آئی پیڈ عیلت کا استعمال محض فیشن یا خورد و غماز ہی نہیں بلکہ اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

ذات کام..... خدا حافظ

ایک عرصہ تک ویب سائٹس پر راج کرنے کے بعد ”ذات کام“ نامی ڈومین کا راج فتح ہونے کو ہے اور بہت جلد آپ کو دوسرے ناموں سے ویب سائٹس کی بھر پور نظر آئے گی جیسا کہ ”ذات گوگل“ ”ذات ایس این“ اور اسی طرح کے دیگر نام بھی نظر آئیں گے اور یہ مشہور زمانہ ”ذات کام“ کی جگہ لے لیں گے۔ یہ اس لیے ہونے جا رہا ہے کہ آئی کانس Icanon جو کہ ”انٹرنیٹ کارپوریشن فار اسائنمنٹز اینڈ نیوز“ نامی ادارے کا مخفف ہے اس نے اب یہ منظوری دے دی ہے کہ نئے نام بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ اس سے قبل یہ آزادی نہ ہونے کے سبب زیادہ تر ویب سائٹس کے نام ذات کام یا زیادہ تر سے زیادہ ذات آؤ آر جی تک محدود تھے تاہم اب یہ انٹرنیٹ کی تاریخ کے گزشتہ پچیس سالوں کی سب سے دلچسپ تبدیلی بن کر سامنے آنے والی ہے۔

اس وقت صرف 22 ٹاپ لیول ڈومین نم موجود ہیں تاہم اب یہ تعداد تیزی سے بڑھے گی کیونکہ مختلف کمپنیاں اب اپنے ناموں کے ساتھ ڈومین نم فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کر رہی ہیں۔



اس لڑکی کے اندر مجھے ایسی ہی اہمیت کا احساس ہوا کہ میں عرشے پر ہی ٹھہر کر ریگھم کا مکرسمندر میں جھانکنے لگا۔

جہاز آہستہ آہستہ لوگوں سے بھرنے لگا۔ ان میں زیادہ تر گورے، چینی اور عرب نسل کے جوان لڑکے اور لڑکیاں تھے جو مل جل کر کہیں منظر میں لگے تری کمانوں پر بلا لگا کر سنے لگے۔ تھوڑی دیر میں ولس جی ہوا جہاز نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

اب تک دن کے دس سے بارہ بج چکے تھے۔ اس دوران میری کئی افراد سے شناسائی ہو گئی تھی۔ میرا نام ترکوں جیسا ہے اس لیے ترکوں سے قدرتی طور پر جلد ہی انگریزی میں کپ شپ شروع ہو جاتی ہے۔

سیاحوں میں زیادہ تعداد طالب علموں کی نظر آتی تھی جو یورپ کے مختلف ملکوں سے سیاحت کی غرض سے یورپ سے آزاد اور خوبصورت ہونے کی وجہ سے چلے آتے تھے اور یورپ کی آبادی کے تناسب سے یہاں بھی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔ ان میں سے زیادہ تر نے اضافی لباس اتار کر اور جسم پر سکن لوشن لگا کر جہاز کی چھت کا رخ کیا۔ لڑکے بھی شائرشپنے وچیں کا رخ کرنے لگے۔

جلد ہی عرشے پر تھوڑے سے لوگ رہ گئے۔ میرے ساتھ میں ایک برٹش لڑکی میلن کمری تھی۔

اس سے تعارف ہوا تو اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں کئی پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی قریبی ترین کنبلی بھی ایک پاکستانی بڑا برطانوی لڑکی ہے۔ جب میں نے اسے عام تصور کے برعکس پاکستان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تو وہ میری باتوں میں دلچسپی لینے لگی۔ ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ سنبھرے بالوں والی لڑکی اٹھ کر ہمارے قریب چلی

رہے تھے یا پھر بار بار بیٹھے مگر بیٹوں کے لیے لیے کش لگا رہے تھے۔ سمندر کے پانی کا رنگ کچھ ایسا ہو رہا تھا جیسے نیلی روشنائی کی بہت بڑی دودھ کی نے اس میں اغیل دی ہو۔ جب پانی ساحل سے ٹکراتا تو شراپ کی آواز سے سفید جھماک پیدا ہوتی اور پانی ایک باریک ٹینک تہہ کچھوڑ کر واپس سرک جاتا۔ میں چلا ہوا کافی دور نکل گیا تو میری نظر ایک بچے سجائے جہاز پر پڑی جو پرانے بادبانی جہازوں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اس نے مجھے پرانی جنگی فکوں کی یاد دلادی اور میں نے اس کے لیے کٹ خرید لیا۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے عملے نے مجھ سے میرے جوتے لے لیے۔ نچلے پیرسٹرکٹا وہاں کی روایت تھی۔ میں چلا ہوا جہاز کے اگلے عرشے پر چلا آیا جو سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا سے پیدا ہوتی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ عرشہ تقریباً خالی پڑا تھا۔ وہاں صرف دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک سنبھرے بالوں اور نیلی پرکشش آنکھوں والی مصمم سی لڑکی تیراکی کے لباس میں پنچھی دور سمندر کی چمکتی سطح پر بنگوں کی طرح ڈوٹتی کشتیوں کو دیکھ رہی تھی اور دوری تیرہ چودہ سال کی مقامی لڑکی اس کی ساتھی لگتی تھی۔ جب میں عرشے پر آیا تو ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور ایک دہائی کی سیلہ کہہ کر دوبارہ سمندر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

میں بھی نظر میں سنبھرے بالوں والی لڑکی کے چہرے پر مجھے اہمیت سی محسوس ہوئی، جیسے یا تو میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا ہے یا پھر میں اسے جانتا ہوں۔ زندگی میں کئی مرتبہ ہوتا ہے کہ آپ کس شخص کو پہلی مرتبہ مل کر اس کے لیے اہمیت کا ایک گرم جذبہ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں جبکہ بسا اوقات کئی ملاقاتوں کے بعد بھی کوئی آپ کو ابھی لگتا ہے۔ ماہرین اس کا کوجن جنوں میں لگتے ہیں۔ بہر حال



مرقان جاوید

لکھنا

لوگوں کی فیمیں کرتے ہوئے اس نے کسمار کہ اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ میرے ہاتھوں میں صرف خوشبو رہ گئی۔ وہ آہستہ سے بولی ”تم بہت جذباتی ہو۔ یاد رکھو ہم آج ہی ملے ہیں اور صرف دوست ہیں۔ ہم دونوں سیاح ہیں اور کل کو یہاں سے اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔“

ایک جرمن دو شیر کا لسانہ جس کے دس میں بچے بیٹوں کا تعداد تھا

بعد پہنچا تھا، مجھے بتایا تھا کہ بچہ کلام کے ٹرپ کے لیے چھوٹے سمندر جہاز اور کشتیاں صبح دس اور گیارہ بجے کے درمیان روانہ ہو کر شام چھ سات بجے واپس لوٹ آتے ہیں۔

دو ایک دو دن سختی مگر اسے صبح کتنا مناسب نہ ہو گا کہ دن کے دس بج رہے تھے اور یورپ جیسے ساحلی تفریحی علاقوں کی محسوس دس بجے کے بعد ہی شروع ہوا کرتی ہیں۔ رات کو بڑی کج جائے کے بعد سیاح اکثر دن کے دس گیارہ بجے ہی آنکھیں ملنے یورپ کی اگلی شاپراہ پر سفر کرتے نظر آئیں گے۔ ایک روز میں ہی اس Pension کے مالک نے، جہاں میں پچھلے روز استہلال سے طویل سفر کے

بتایا ہے۔ وہ مرکو بیچنے کی جانب جھٹک کر ہنس پڑی۔
پھر اس نے بتایا کہ روڈ پر ملتی جڑنی سے باہر
لنگی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بھلی تھی جسے استنبول
میں لو لاکا مل گیا تھا جس کے ساتھ اس نے آئندہ
چند روز کا پروگرام لے کر لیا تھا۔ یہاں پر وہی مقامی
ترک لڑکی اس کی دوست بنی تھی جو اس کی
انگریزی پالش کرتی رہتی تھی اور یوں اس کی اسلامی
تعلیمی۔ جب میں نے اس سے تیرا کی نذر نہ کی وہ
پوچھ لگائی کہ بتایا کہ بچپن میں کسی نے اسے پانی
پوشہ دیا تھا۔ تب سے پانی کا خوف اس
کے دماغ میں ایسا بیٹھا کہ وہ روڈ کو تو تیرا کی
کرتے دیکھتی رہتی ہے مگر خود پانی میں اترنے کی
ہمت نہیں کر پاتی۔

ابھی بائیں جاری ہی تھیں کہ انجن سٹارت ہونے کی آواز آئی اور میلن اور دوسرے سیاح جہاز میں واپس آنے لگے۔ کوشش کے باوجود سلسلہ گفتگو واپس نہ جڑ پایا۔ یوں یقین سفر میلن کے ساتھ خوش کمپوں میں کٹ گیا۔

شام کو جہاز ساحل سے لگا تو سیاحوں میں ایسی بڑ بڑکھانچ کی کہ میں ادو کا سے الوداعی ملاقات کے بغیر ہی جدا ہو گیا۔

اسی روز یودرم کی اکلوتی شاہراہ پر منزلت کرتے، دکانوں اور گلیوں کو دیکھتے میں ایک کلب کے نیم تاریک گوشے میں آن بیٹھا۔ میں اب تک اولگا کو بھلا نہ سکا تھا۔ اس کے سنہری بال، نیلا آنکھیں، مقناصب جسم، خوبصورت ہاتھ اور سب سے بڑھ کر معمولیت بار بار نظر دل کے سامنے آ جاتے۔ جہاں اس سے اس طرح بغیر ملاقات کے چھوٹنے کی غلش سی تنگ کرتی تھی وہیں چھٹی حس بھی تھی کہ ایسے چھوٹے ساحلی قصبے میں اس سے بارہ ملاقات ضرور ہو جائے گی۔

تجربہ وارے ملک کا نام تو لی۔ وی پر بہت سن رکھا ہے مگر انھوں نے کہ میں حالات حاضرہ اور جغرافیہ میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی۔“

اس پر میں نے اسے بتایا کہ پاکستان ایشیاء ہمسایہ ہے اور یہ کہ ترکی کا دوست ہے۔

ہوئے میں نے مقامی لڑکی
 دیکھا۔ وہ لڑکی بھی مسکرائی اور بہت گرم جوش
 سے پاکستان کا ذکر کرنے لگی۔ اس کی گرم جوش
 دیکھتے ہوئے اولاد کی بھی دلچسپی بڑھ گئی اور اس
 نے بتا کر اس کی ایک دور پار کی سہیلی ہندوستان
 میں کنبہ کے پہلے میں تھی جی اور وہاں کے یوگیوں
 اور جڑیوں کا بہت ذکر کرتی تھی۔ یہ سن کر میں
 نے اپنی ٹھوڑی کھجالی اور اسے بتایا کہ میں بھی علم
 دست شناسی کی کچھ مدد بھہ رہا ہوں۔ اتنا سننا
 تھا کہ اس نے اشتیاق سے اپنے دونوں ہاتھ
 میرے آگے پھیلا دیئے۔ میں نے جھنجھکتے ہوئے
 اس کے ہاتھوں کو قہقہا لیا۔ اس کے ہاتھ عام یورپی
 لڑکیوں کے نسبتاً چھ ہاتھوں کے عکس بہت ملائم
 تھے۔ ہاتھوں کی مہین کوری شفاف جلد کے نیچے
 نیلی نیلی رگیں زردی سے دھڑکتی تھیں اور لامسی
 انگلیوں کے کوٹوں پر خوبصورت تراشیدہ ناخن
 نسوانیت کا شاہکار تھے۔

میں نے انہوں میں جھانکتے ہوئے سوال دیا
یا کہ اس کی اپنے ہوائے فریضہ سے حال ہی میں
علیحدگی کیوں ہوئی ہے؟ وہ سوال سن کر حیران رہ گئی
اور بول اٹھی کہ مجھے ان کی علیحدگی کا کیسے پتہ چلا؟
میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور عرضی
نوعیت کی پیش گوئیاں کرتا چلا گیا اور وہ حاشا ہوئی
چلی گئی۔ پھر یکدم اس کا ہاتھ دوسرے سے بچنے
کرتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک
اور بولا کہ میں نے پہلی مرتبہ بلا قیمت کی کوئٹا جیت

آئی اور ہیلن سے اگلے قیام کے مقام کا پوچھا۔ جس پورا شیڈول پڑھ کر آیا تھا اس لیے ہیلن کو تذبذب میں دیکھ کر بول ڈرامہ کوئی آدھ ایک گھنٹے کا سفر ہے۔ اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ دہی سا شکرہ ادا کیا اور ریلنگ کے ساتھ کھڑی ہو کر دھوپ والا سایہ چمٹا کر دور روکھنے لگی۔

میں اور مبین اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ جب میں نے اسے واڈی کیلاش کی رسومات کا بتایا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر میں نے ہنزہ میں واقع 'ہنگوویسٹ' کا ذکر کیا جہاں ایک مقام سے دنیا کی زیادہ سے زیادہ بلند ترین چوٹیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ راست بہادر پور کے سابق والیان کی دولت کا تذکرہ بھی اس کے لیے نئی چیز تھی۔ اس دوران سترہ سے بالوں والی لڑکی بھی ہماری دلگنگو کو بے انتہائی کاغذ اوڑھے دیکھی سے سن رہی تھی۔

ابھی ہماری گفتگو چل ہی رہی تھی کہ ایک جزیہ آگیا اور جہاز نگر انداز ہو گیا۔ ہیلن تیراکی کے لیے چلی گئی۔

اب عرشے پر صرف میں، سنہرے بالوں والی لڑکی اور اس کے مقامی دوست رہ گئے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میری اور اس کی نگاہیں گمراہیوں میں نے بہلو کہہ دیا اور ”عرقان“ کہہ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ مسکرائی اور ”اوکا“ کہتے ہوئے ہاتھ ملا۔

میں نے سہکراتے ہوئے جب اسے یہ کہا کہ وہ میری نظر میں آنے والی پہلی تری لڑکی ہے جس کے بال قدرتی طور پر ایسے گہرے سہرے ہیں تو وہ بے اختیار پڑیں اور بولی "میں جبرئیل ہوں۔" پھر اس نے جبرئیل کے کسی چھوٹے قصبے کا نام لے دیا۔ اس دوران اس کی مقامی دوست بھی ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ ہم نے ہاتھ ملائے۔ میں نے جب اولنگ کو پاکستان کا نام بتایا تو بولی "ہاں ہاں میں نے

پر سکون بخیرہ قلم کے کنارے آن بیٹھے۔

رات ایک دن کا لبادہ اُتار کر دوسرے دن کا پہنا دیا پہن رہی تھی۔

رومانوی جوڑے دنیا سے بے خبر باہم راز و نیاز اور بوس و کنار میں مشغول تھے۔ ایک لمبے بالوں والا پتی نوجوان باجاءہ پہنے ٹکار پر کوئی گیت کا رہا تھا۔ شاید اس نے زیادہ لی رکھی تھی یا پھر شیش استعمال

کے ہوئے تھا کہ اس کی زبان بار بار لٹکھڑا جاتی تھی۔ نیند کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ میں نے اولگا کی طرف دیکھا۔ اس کے بال سمندری ہوا میں لہرا رہے تھے اور ہلکی ننگی سے بچنے کے لے اس کے

ہاتھوں کو جسم کے نیچے چھپ کر کے پورے بدن کو سیاہ لباس میں لپیٹ لیا تھا۔ وہ سمندر میں دوڑ کر بڑے کسی جہاز کی مدغم پرتی روئیں کو دیکھ رہی تھی۔ چاندنی کے ذرات اس پر جھلما رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تو

جہاز کو دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھا تو میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ جھنجپ کر میں نے نظریں موڑ دیں۔ وہ سر پیچھے کی جانب جھٹک کر کھڑی اور اول لکھی

”دیکھو، تم تو شرما کر پیش کر گئے ہو۔“ میں بھی ہنس پڑا۔

پھر ہم نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے وہ اپنے جرن قبیہ کا بتانے لگی، اپنے چھوٹے سے باغیچے کا بتایا جہاں اس نے خود پھول لگائے تھے۔ اس نے ان بڑے جرن شہروں کا بھی بتایا جو

اس نے دیکھ رکھے تھے۔ میں بھی اسے اپنے شہر لاہور کا بتانے لگا۔ اسے شہر کی پرانی تفصیل کے اندر قدم شہر کا بتایا، کھانوں کا بتایا اور لوگوں کی عادات کا

بتایا۔ اسے ان میزبان کا بتایا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہے تھے جیسا کہ برتنوں پر قلمی کرنے والے۔ بات چلتے چلتے شاعروں اور ادیبوں تک چلی گئی۔ میں نے اسے ناصر کاظمی کا بتایا جو پورے چاند کو دیکھ کر دیوانہ

جھلما ہٹ سمندر کے پانیوں سے سڑ کر تھی ہوئی اس کی نیلی آنکھوں میں نظر آنے لگی۔ شاید اسے کوئی پرانا دکھ یاد آ رہا تھا۔

وہ رات غیب مدھوشی کی کیفیت میں گزری۔ میں نے اس سے بہت سی باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں، پانچواںوں کی باتیں، سڑوں کی باتیں اور

پیلے بوسے کی باتیں۔ وہ بہت توجہ سے میری باتیں سنتی رہی اور اپنی چھوٹی سی سادہ زندگی کی معصوم

باتیں سناتی رہی۔ رات ڈھلتی رہی اور فضا میں مستی کی جھک بدھتی رہی۔ یہاں تک کہ جب پورم کی جامع مسجد سے صبح کی آواز بلند ہوئی تو ہم

دونوں اپنے صحن آلود لباس درست کرتے اٹھے اور آگلی ٹیمپل کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے سویرے کے گئے چنے سیاحوں میں گم ہوتے چلے گئے۔

پورم استیشن سے کئی گھنٹے کی مسافت پر واقع ساحل تقریبی مقام ہے۔ یہ نوجوان سیاحوں کا گڑھ ہے۔ ٹیمپل ادھر کا رخ گم ہی کرتی ہیں۔ وہ مار مار کر کو پورم پر ترجیح دیتی ہیں۔ یہاں کے ٹائٹ کلب

پورے ترکی میں مشہور ہیں۔ ٹیمپل انجی کلبوں میں سے ایک ہے۔

اسے روز میں سرشام ہی ٹیمپل کلب میں آن بیٹھا۔ جھجے کے اوپر سیاہ جیکٹ پہن کر میں کم قابل نظر آتا جاتا تھا۔ شام کو شروع ہونے والا انتظار

رات کو ختم ہوا جب اولگا کلب میں داخل ہوئی۔ ایک فیڈ ڈیوٹر کے اوپر ڈھیلی ڈھالی سرخ ٹاپ پہنے وہ

چمچیلی رات کی نسبت بہت پر مدھر لگ رہی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ میری میز پر آئی اور بے دلی سے کر سی تھکیت کر بیٹھ گئی۔ میں نے اسے سگریٹ پیش کیا اور اتر چلا کر دیا۔ اس نے سگریٹ

سلاکیا اور گہرا کش لے کر آنکھیں موند لیں۔ میرے دل پر چوٹ سی پڑی۔ میں نے نرمی سے اس کے میز

ہو چاتا تھا، گرمیوں میں آگ تاپے سا غر صدفی کا بتایا اور تارڑ کی پائل کا بتایا۔ وہ بہت متاثر ہوئی اور

کہنے لگی کہ یہی لوگ تو قدرتی حسا فنکار ہوتے۔ پھر اس نے مجھے جرن ادیبوں کا بتایا۔ اس نے مجھے

بتایا کہ گو وہ زیادہ ادب تو نہیں پڑھی ہوئی کہ لوک جرن شاعری اس کے دل کو اپنے لبوں سے چم لیتی

ہے۔ جب اس نے اپنے ہونٹوں کو کول کر کے مجھے یہ بات بتائی تو میرے دل میں اسے اردو کے رومانوی

لیکے کی خواہش جاگی۔ میں اسے اردو کے رومانوی شعر سنائے لگا۔ وہ بہت دیر تک شعر سنتی رہی اور پھر

میری آنکھوں میں جھلکتے ہوئے بولی ”تم قینا ایک ایسے دل کے مالک ہو اور مختلف ہو۔ آج کل کے جرن لڑکوں کو تو ایسے شعر نہیں آتے۔“ میں نے اس

کے مرمریں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھا دیا اور لوں تک لے آیا۔ لبوں کی نئی محسوس کرتے ہوئے اس نے کسمیرا کے اپنے ہاتھوں کو سمجھ لیا۔ میرے ہاتھوں

میں صرف خوشبو رہی۔ وہ آہستہ سے بولی ”تم بہت جذباتی ہو۔ یاد رکھو ہم آج ہی ملے ہیں اور صرف دوست ہیں۔ ہم

دونوں سیاح ہیں اور کل کو یہاں سے اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے۔“

اگلے ہی آواز دور سے آتی سنائی دی ”اولگا ان لمحات کو بلیں کی قید میں دینا دل کے ساتھ نا انصافی ہے۔ میں کوئی اور خواہش نہیں رکھتا صرف تمہیں

ہونٹوں سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولی ”میں نے تمہاری دھچکی جہاز میں ہی محسوس کی تھی لیکن میں ایک عملی لڑکی ہوں۔“

”اور میں بھی ایک عملی لڑکا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ ایک واضح پسلی اس کے ہاتھوں سے سڑ کر تھی ہوئی اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نئی تیرگی اور چاند کی

تو وہ میرے سامنے ناچ رہی تھی، بجلیاں ڈھک رہی تھیں اور ڈانگ کلر لڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور بال فلیش لائٹ کی طرح روئیں میں چمکتے اور پھر

دوسرے چہروں کے پیچھے گم ہو جاتے۔ اس کا جسم ایک والہانہ لیکن پر امتداد حرکت میں تھا۔ موسیقی کی

لے پر اس کے قدم غلوں پر پڑتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میرے دل پر پڑ رہے ہوں۔

کچھ دیر تو میں اس کا ناچ دیکھ رہا، پھر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی تو ایک کونے میں اس کی استانی ٹیٹی نظر آئی۔

میں اپنی نشست سے اٹھ کر اس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ ان نظروں میں

آشنائی تھی۔ جب میں کر سی کھٹکا کر اس کے ساتھ بیٹھ رہا تھا تو وہ مجھے بتانے لگی کہ جہاز سے اتر کر

جہاز مجھ دور تک میں باوجود تلاش کے نہ مل سکا تو انہوں نے مجھ لاکر میں تیلن کے ساتھ چلا گیا ہوں

گا۔ اسے جب میں نے مسکرا کر بتایا کہ میں تو خود ان دونوں کو تلاش کرتا رہا لیکن پھر یہ سوچ کر شرمایا

میری عدم توجہی کو دیکھتی سمجھ کر وہ وہاں سے چلی گئی، میں خود بھی چل دیا تو ہم دونوں اپنی اپنی ٹھل

فیمینوں پر مسکرا دیئے۔ تھوڑی دیر میں اولگا باجپنی کا پتہ ہماری طرف

آئی تو اس کا چہرہ متنا رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سانس درست کرتے ہوئے بولی ”خیر زہتم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ہم دونوں کافی دیر ہمیں تلاش

کرتی رہیں۔“

میں نے تسکین سے لے کر اپنی صفائی پیش کی اور پوچھا کہ کیا وہ کلب کے پیچھے اوپن ایئر تھریں جو

بحیرہ قلموں پر کھلتا تھا، پیر سے ساتھ بیٹھا پسند کرے

گئی؟ تو اس نے فوراً حای بھر لی اور یوں ہم نیم

تاریک چیتے چمکاتے کلب کی عمارت سے نکل کر



محمد سلیم اختر

انزال

”کیا اس بند کرد“ مارکوس غریبا۔ ”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ تم نے میری بہن کو جرائم کی دغا میں مبتلا۔ اس کی عزت و ناموس سے کھینچ رہے۔ پھر تم نے اسے میں اس وقت چھوڑ دیا جب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ بچہ مر گیا اور وہ اب تک اس حادثے کو برداشت نہیں کر سکتی۔“

جیسے وہ کسی کا مجرم تھا اور غلطی سے حارثا کو پاتا تھا گراے اس کا موقع نہ مل سکا

جنگ ابھل کر کھٹم کر دینا چاہتا ہوں۔
”قہ یہ تھا وہ معاملہ“ کیپٹن جارج نے ایک فائل کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ مختلف یادداشتوں پر مشتمل فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔ ”یہ خبر جھوٹ تھی جو سکتی ہے لیکن خبر کا دعویٰ ہے کہ راحرے اس وقت یہاں موجود ہے۔ ممکن ہے انیساس مئی میں اسے گرنی نے پریشان کر دیا ہو بہر حال اب

وہ جون کی ایک گرم سر پہر تھی۔ کیپٹن جارج کے دفتر میں پنکھا چل رہا تھا۔ اگرچہ دفتر میں گرمی زیادہ نہیں تھی لیکن۔ ارغ رساں انسپٹر مارکوس کا پورا جسم پسینے میں شرابا۔ تھا۔ وہ اس وقت اپنے چپ کیپٹن جارج کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی پوندیں چک رہی تھیں۔ اس نے ایک طویل سانس لی جیسے سینے کے اندر ہونے والی

اُترے تو کچھ ہوش آیا۔

وہ رات بھی ہم نے باتیں کرتے گزار دی۔ معصوم باتیں، بے معنی باتیں، بے ربط باتیں، ایسی باتیں جو شاید کسی خود اپنے آپ سے بھی نہ کی تھیں۔ اس رات میں نے خدا سے بہت دعا کی کہ صبح نہ ہو کر پھر جج کا تارایا ہی ماہل نیلے آسمان پر جھلکانے لگا۔

جاننے سے کچھ دیر پہلے باتیں کرتے کرتے وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر حلق سے کچھ نکلتے ہوئے بولی ”شاید یہ کل قریب میں امیر چل جاؤں۔ وہاں سے ایک آدھ ہفتے میں استیصال چلی جاؤں گی۔“

یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ جب خاموشی ماحول کو چراگم کرنے لگی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی سے دوسرے ہاتھ کو مسل رہی تھی۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

میں نے ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ طاری کی اور اسے بتایا کہ میں دو تین روز ابھی بورڈ میں رہوں گا پھر واپس استیصال لوٹ جاؤں گا۔ میں نے اسے بورڈ کے اپنے Pension کا کارڈ بھی دیا اور اس کی پشت پر استیصال میں نیلے مسکے کے قریب واقع اپنے ہونٹ کا پتہ بھی لکھ دیا۔

وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر کارڈ لے لیا اور اسے تنکے لگی۔ جب کانکی دیر گزر گئی تو جیسے خود کسی خیال میں چونک گئی اور بولی۔
”عرفان کاش تم جرنی میں پیدا ہوئے ہوتے۔“

اس پر میں ہنسنے لگا۔ دل سے مسکرا دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:
”میں خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔“

پر دھڑے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس کے اعصاب کو سکون کی ضرورت نظر آتی تھی اور میں اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ قہوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولی ”جب سے میرے ہوائے فریڈ نے مجھ سے دھوکہ کر کے مجھے چھوڑا ہے میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔“

اس نے ایک اور کس لیا اور آنکھیں دھیرے دھیرے بند کر لیں۔ پھر بند آنکھوں کے ساتھ وہ یوہڈائی۔

”تم لو کے اتنی آسانی سے لڑکیوں کو دھوکا کیسے دے لیتے ہو؟ اور پھر بھول بھی جاتے ہو۔“

ابھی میں اس کے سوال کی سختی ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف پر سوچ نظروں سے دیکھا اور کھیا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔

”آؤ آج کہیں اور چلیں۔ کلب میں بہت شور ہے۔ ہاربر کے پاس ایک کینے ہے وہاں چل کر بیٹھنے ہیں۔“

میں تنکے تنکے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ باہر کی تازہ ہوا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے اسے قریب کر لیا اور ہم دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا اور کوئی جرسن کیت دھکی آواز میں گنگناہٹ لگئی۔ پھر وہ اچانک رگ گئی۔ میں نے تشریش سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہونٹوں کو چوم لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قہر تھم گیا ہو۔ میری آنکھوں میں مٹی تیر گئی اور اور گرد کی ہر شے پر ستارے دکھ اٹھے۔

ہم کینے تک کسی طرح پہنچے مجھے خبر نہیں۔ کینے میں کافی کے تلخ کھونٹ جب میرے وجود میں

تھا..... ”میں جانتا ہوں کہ اس وقت تم کیا محسوس.....“ وہ یکا یک خاموش ہو گیا۔

اس نے مارکوس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ لی تھی کہ وہ شدید بیچانی کیفیت کا شکار ہے۔

”میں سمجھ رہا ہوں“ مارکوس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”اس قصے کو بھول جاؤ۔“

”دراصل میرا مطلب تھا۔“

”میں نے کہا تھا..... بھول جاؤ۔“ مارکوس نے کہا۔

”کیا کوئی ذاتی وجہ ہے؟“

”ہاں..... راحمے نے میری بہن کو جہرام کی دنیا میں شہید کیا تھا۔ آج سے دو سال پہلے تک مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے..... اس کے

بعد راحمے نے میری بہن کو اچھالی ذلت آمیز حالت میں چھوڑ دیا تھا اور اس نے تنہا ہے کی پیدائش کا تکلیف دہ حطلے کیا تھا..... اس کے

جڑے پیچھے گئے۔ ”لیکن بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ شدید بیمار ہو گئی اور پھر مر گئی اس حد سے اس کی بدلتی حالت خراب کر دی تھی۔ اس روز میں نے

فیصلہ کیا تھا کہ راحمے کو اس جہرام کی خوفناک اور عبرتناک سزا دلوا دوں گا۔“

میٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں لیکن.....“

”کچھ نہیں سارجنٹ! میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“ مارکوس نے سخت لہجے میں کہا۔

میٹ خاموش ہو گیا۔ کار کی رفتار خاصی تیز تھی۔ مارکوس نے کار ایک چوراہے سے گھٹی اور

اس کا رخ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ اس نے دل ہی دل میں راحمے کی کمین گاہ کا پتہ

تجربہ کار آدمی کے ساتھ رہنا چاہیے۔“ اس نے ہموار لہجے میں کہا۔

”لیکن جناب“

”ہی! سارجنٹ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے حتیٰ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ایک فرض سوچ دیا گیا ہے اب اس پر عمل کرتا ہے۔ یہ حکم ہے۔ سمجھیے؟“

کمین گاہ کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے بات ختم کر دی ہو لیکن مارکوس ابھی مزید احتجاج کی تجاویز نکال رہا تھا۔

”بہت بہتر جناب لیکن“ اس نے کہا اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ دفتر سے باہر نکل گیا۔ وہ

سکواڈ دوم میں سارجنٹ میٹ کو تلاش کرنے چل دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے ذاتی طور پر کچھ نہ کرنا پڑے گا۔

سارجنٹ میٹ ایک نو عمر اور ذہین آدمی تھا۔ وہ اس موجودہ مشن کے بارے میں بہت ہی سنجیدہ تھا۔

جب کاروں کا ڈرائیو کرنا تھا تو وہ اس کے پہلو میں خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک گرم سر پہرتی اور سڑک پر ٹریفک زیادہ تھی۔ پولیس کار پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ کار

پولیس کی ہے۔

”کیا تمہارے خیال میں راحمے واقعی واپس آ گیا ہے؟“ میٹ نے کہا۔ لیکن کاروں خاموش رہا۔ اس نے ڈرائیوگ صرف اس لیے کی تھی کہ

اپنے کچھ بولے اصرار پر قائل پا سکے۔ اس نے اسٹیرنگ پر گرفت مضبوط رکھی۔ انھوں نے جوڈوں سے سفیدی بھنگ رہی تھی۔ اس نے کن انکیوں سے

سارجنٹ میٹ کی طرف دیکھا اور کہا ”کمین گاہ خیال ہے کہ تجربے پر اطلاع فائدہ نہیں دی ہے۔“

”میری خواہش ہے کہ اطلاع درست ہو اور ہم اس پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں۔“ نو جوان

سارجنٹ کے لہجے سے جوش و خروش ظاہر ہو رہا تھا۔

جناب“ مارکوس نے جواب دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کمین گاہ بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس کا کوئی ذاتی معاملہ بھی کسی ایسی صورت حال میں لوٹ ہو سکتا ہے۔ وہ اس کی بات سے مطمئن ہو گیا۔

”بہت خوب“ سارجنٹ نے یادداشت کی غفلت میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے تاہم ہر طرح سے محتاط رہنا چاہیے۔

میٹ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں اسے پہلے ہی اطلاع دے چکا ہوں کہ وہ تمہارا سامھی ہو گا۔

مارکوس کے جڑے پیچھے گئے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے لیے میٹ کو ساتھ رکھنا ضروری نہیں تھا

بلکہ اسے کسی کی رفاقت یا معاونت کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔

”مجھے کسی ساقھی کی ضرورت نہیں ہے جناب“ اس نے مختصراً کہا۔

سارجنٹ نے تردید کرتے ہوئے سرفی میں ہلا دیا

”راحمے ایک خطرناک گزندہ فرما ہے۔“

اس نے کہا ”میں اس کے مقابلے میں اپنا کوئی ایک آدمی نہیں بھیج سکتا۔ ضروری ہے کہ اس کے

سامنے ایک کی بجائے کم از کم دو آدمی ہوں۔“

”لیکن مجھے میٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“ کمین گاہ نے مارکوس کے لہجے کو محسوس کیا تو وہ فکڑ

آہیز انداز میں کہیا لیکن میز پر بٹائے آگے بڑھا۔

”تمہیں میٹ کی ضرورت نہیں ہے یا تم اس کی رفاقت پہ نہیں کرتے۔“

”اس کا کوئی ذاتی چیلنج نہیں ہے جناب“

”کیا وہ ایک بہترین سارجنٹ نہیں ہے؟“

”یہ درست ہے لیکن.....“

کمین گاہ نے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں نے اس شخص کا انتخاب اس لیے کیا ہے تاکہ وہ کچھ اعتماد بحال کر سکے اور اس کے لیے اسے کسی

جگہ وہ یہاں موجود ہے ہمیں چاہیے کہ اسے گرفتار کر دیں۔“

مارکوس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کمین گاہ کہیں دور سے بول رہا ہو۔ اس نے کمین گاہ کی بیشتر باتیں شاید سنی ہی نہیں تھیں۔ راحمے کا نام سننے ہی اس کا پورا جسم کھٹے ہوئے تاری طرح تن کیا تھا۔

جنابت کا نلیہ جیسے پیسے بڑھ رہا تھا تبش کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

راحمے اس کا شریک کار تھا لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب وہ پولیس میں بھرتی نہیں ہوا تھا۔

راحمے ایک ذہین اور شاطر آدمی تھا جس کے نزدیک پولیس کی ہر آدمی اتنی قیاد اور بالآخر جلد از

جلد زیادہ دولت کمانے کے پتھر میں اس شہر سے چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی پورے دو سال بعد ہوئی

تھی۔ یہ آدھ کمین گاہ سارجنٹ کے لیے بڑی اہم تھی۔ لیکن

راحمے کی آدھ سب سے زیادہ اہمیت کلیمار مارکوس کے لیے تھی۔ وہ اس کے ظاہری حسن اور دلکشی سے

بہت متاثر تھی۔ راحمے نے بھی اسے لہجائے کے لیے تمام شاطرنہ چالیں آزمائیں تھیں۔ اس ملاط

کے بعد وہ جلد ہی ریوالور بردار ڈاکو بن گیا تھا اور اس سے انسپٹر مارکوس کی بہن کلیمار کی زندگی ویران ہو

گئی تھی۔

”تمہاری طبیعت تو مجھ سے انسپٹر؟“

مارکوس نے گہری سانس لی۔ اس نے دو سال پہلے یہ تجویز کیا تھا کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں وہ

راحمے سے اپنی بہن کا انتقام لے کر رہے گا۔ اس وقت مارکوس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ

بالآخر ایسی شخص کی گرفتاری کا فرض اس کے کندھوں پر ڈال دیا جائے گا۔ اگرچہ ایسی خبروں سے وہ زیادہ

متاثر نہیں ہوتا تھا لیکن یہ راحمے کا معاملہ تھا کہ وہ نہ وہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ”مجھے یقین ہے

جس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ اس نے ضبط کرنے کی کوشش کی کیونکہ اس نے۔

فٹ پاتھ پر تھے اور ایسی جگہ پر ”خفیک ہے“

۲۱

۲۲

۲۳

۲۴

۲۵

۲۶

۲۷

۲۸

۲۹

۳۰

۳۱

۳۲

۳۳

دو ہرایا اور زیر لب کہا ”تم جہاں ہو۔ وہیں رہو
رامرے! میں آ رہا ہوں۔“

جب وہ اس عمارت کے قریب پہنچے جہاں کے بارے میں اطلاع تھی کہ رامرے وہاں چھپا ہوا ہے۔ مارکوس نے گلز پر کارروک دی۔ جب اس نے

انجن بند کیا تو میاٹ پیچے اترنے کے لیے سیٹ سے اٹھنے لگا۔ مارکوس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں سارجنٹ۔ وہاں ہی بیٹھے رہو۔“

”کیا مطلب جناب؟“ سارجنٹ نے حیرت سے کہا۔

مارکوس نے بغلی ہولٹر سے ریوالور نکالا۔ یہ اعشاریہ تین آنکھ کا پولیس چٹل تھا۔ اس نے ریوالور کو چیک کرتے ہوئے کہا ”تم گاڑی میں بیٹھے رہو۔ میں اس معاملے کو سنہال لوں گا۔“

سارجنٹ چند لمحوں تک مارکوس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”نیشنل جارج نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہارے دوش بدوش رہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا ریوالور نکال کر چیک کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔

بھجھلاہٹ اور جوش سے مارکوس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے کن اکھیوں سے میاٹ کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا میاٹ کو کچھ شہ ہو گیا ہے؟

”یہ میرا حکم ہے سارجنٹ!“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کار میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو۔“ سارجنٹ نے دوبارہ بغلی میں سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مجھے افسوس ہے جناب۔“

مارکوس کا غصہ بڑھ کر اپنی انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے سخت نگاہوں سے سارجنٹ کی طرف دیکھا

۳۴

۳۵

۳۶



جیلانی بانو

جھنجھلی روٹی

مجی جھنجھلی گیس کہ وہ سب انداز چاہتے ہیں۔ رات بھر بونچ کو کندہ کریں گے۔ صبح سارا فرش دھولانا پڑے گا۔ اس لیے مجی نے ڈبلی سے کہا کہ ان لوگوں کو چلانے دو۔ کوئی جواب نہ دیا۔ بارش تیز ہوئی تو غوری اور انہیں ہماگ جائیں گے مگر ٹھنڈے ساریات نیند نہیں آئی۔ ڈرلگ رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ چانک توڑ کر اندر نہ جائیں۔

محاضرتی تفریق اور اس کے اثرات کو واضح کرنا سنگ کی طرح

تھا۔ میں ان وقت جب ہم سب ناشتا کرتے ہیں۔ اچانک جھونپڑیوں میں سے دو نے چلانے کی آواز سن آئے۔ لکھیں۔ مجی اکتا کر سلاش اور چھری پلٹتے ہیں رکھتیں اور کڑکی بند کر کہیں۔ آج پھر کوئی پچھو مر گیا، ساری کالونی میں جہرام بھیل رہے ہیں۔ کم بختوں کو سب سے پہلے جتنے سے سارا کوئی کام نہیں رہا ہے۔ اب تو میں بھگتیں لکھاؤں گی جلی، عظیم ہو رہی ہے۔ جب تک یہ ساری جھونپڑیاں نہیں نہیں کی جکیں

وہ سب کھینٹ کھینٹ ہمارے لان میں آگئے تھے۔ وہ سب بچے ہمارے بچکے کے سامنے والی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ننگے دھڑکے۔ کالے کلو نے اور بے حد لڑاؤ کندے بچے ہیں۔ جب بھی کوڑی سے باہر جھانکا تھا کوئی نہ کوئی دلچسپ لڑائی دیکھنے کو ملتی تھی۔ پھر زار و بعد دیکھتے وہی لڑنے والے بچے مل جاتے کہ کوڑے میں کیلے کے چھٹکا تھا کہ کوڑے سے بچے آئے ان جھونپڑیوں میں کوئی نہ کوئی مر جاتا

اور سار جٹ میاٹ سینڈ تھا سے فرش پر جھکا ہوا تھا۔ وہ نہ جانے کب اور کس طرح ہوش میں آ کر وہاں پہنچ گیا تھا۔ مارکوں نے پلٹ کر رامزے کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں اور منہ مکمل گیا تھا۔ وہ اب بھی مارکوں کو گھور رہا تھا۔ بیسے وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا تھا لیکن مارکوں نے اسے مہلت نہیں دی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے ٹھوکر مار کر رامزے کو دیواری کی طرف دھکیل دیا۔

ایک نسوانی چیخ سن کر مارکوں کا ہاتھ کا پ گیا۔ دروازے میں سار جٹ کی لاش کے پیچھے جو لڑکی کھڑی ہوئی تھی اس کی آنکھیں حیرت، خوف اور غیر یقینی کے عالم میں پھٹی ہوئی تھیں۔ ”نیمیری بہن“ مارکوں نے خود کھائی کے انداز میں کہا۔ ”یہ تم نے کیا کر دیا۔“ وہ چیختی ہوئی آگے بڑھی اور بھائی سے چٹ گئی۔ ”یہ اسی انجام کا حقیق تھا۔“ مارکوں بڑبڑایا ”کیا تمہیں اس کے مرنے کا افسوس ہے پاگل لڑکی؟“ اس نے خاموشی سے ایک خط نکال کر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ مارکوں نے لرزتے ہوئی انگلیوں سے خط کھولا اور پڑھتے ہی اس کی آنکھیں سمٹ کر خفیف سی جھریوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ رامزے کا کاٹھا تھا۔ جو اس نے کیسی ساسی سے کلیر کے نام لکھا تھا۔ آخری جملہ طوفان کی طرح مارکوں کے ذہن میں چکر لگنے لگا۔ ”مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی کلیر۔“ میں ناشی کی تمام غلطیوں کا ازالہ کرنے آ رہا ہوں۔“

اس نے خاموشی سے ایک خط نکال کر بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ مارکوں نے لرزتے ہوئی انگلیوں سے خط کھولا اور پڑھتے ہی اس کی آنکھیں سمٹ کر خفیف سی جھریوں میں تبدیل ہو گئیں۔ وہ رامزے کا کاٹھا تھا۔ جو اس نے کیسی ساسی سے کلیر کے نام لکھا تھا۔ آخری جملہ طوفان کی طرح مارکوں کے ذہن میں چکر لگنے لگا۔ ”مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گی کلیر۔“ میں ناشی کی تمام غلطیوں کا ازالہ کرنے آ رہا ہوں۔“

”خاموشی رہو۔“ مارکوں کی غراہٹ خوفناک تھی۔ ”اب تمہیں اپنے ہیما تک ناشی کو یاد کرتے ہوئے موت کی آغوش میں سو جانا چاہیے۔“ اس نے اوپر تلے تین فائر کیے۔ دو گولیاں رامزے کے سینے میں گئیں اور تیسری اس کی ٹانگ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے باوجود اس کی بھرتی قابلِ وقاعدہ تھی۔ وہ رپا اور تک پیچھے میں کا میا بھ گیا تھا۔ جب وہ پلٹا تو مارکوں نے چوتھا فائر کیا لیکن اس سے پہلے ہی رامزے کوئی چلا چکا تھا۔ گولی مارکوں کے کان کے پاس سے سننا ہی ہوئی گزری اور عقب سے ایک دلدرد چیخ سنائی دی۔

مارکوں نے چوک کر دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا

”پتا“ لیکن میں اٹھائیں کیونکہ بنگہ جگ یاد کی ماں باپ نے میرے سامنے بنایا تھا۔ پھر ہمارا کسے ہو گیا۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ رہی تھی۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی تو سامنے رہنے والے سارے مزدور چھینٹوں کی طرح ہمارے بنگہ کو چنے رہتے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جانے کسے یہ اونچا بنگہ یوں ابھرا جیسے سب مزدوروں نے مل کر اسے زمین کے نیچے سے نکالا ہو۔

شام کو جب سب مزدور چلے جاتے تھے تو یاد کی ماں ڈیلی کے پاس آکھڑی ہوتی اور بس ہنس کر ڈیلی سے ایک آدھ پیسہ مانگ لیتی۔ نری کا بھینگ بھی وہ کھرب بھٹی لٹی چھت پر جب سینٹ کا کام ہو رہا تھا تو یاد کی ماں دوسری مزدوروں کے ساتھ مل کر ڈیلی کی تعریف کے جھگڑے کرتی تھی۔ وہ گیت سن کر ڈیلی خوب ہنسنے لگتی تھی کہ یاد کی ماں پر بہت غصہ آتا تھا۔ جب ڈیلی سمجھاتے کہ وہ بڑی محنت سے کام کرتی ہے جیسی تو اتنی ٹھوڑی ہے۔ یاد کی ماں کا ذکر ہو رہا ہو تو مجھے شہرہ ہوتا جیسے ڈیلی بے محنت کی گولی منہ میں رکھے ہوتے ہیں۔

کچھ کام نہیں کرتی وہ بے حیا کہیں کی۔ جب دیکھو مزدور کے ساتھ کسی کھی کر رہی ہوتی ہے۔ محی بل کر کہتیں۔

یاد کی ماں اور سب عورتیں جگ بڑی بے شرم تھیں کیونکہ ان کی پوری قوم کی عورتیں ساری کے ساتھ بلاؤ نہیں پہنتیں تھیں۔ بالکل نکلی ہوتی تھیں۔ جانے کیوں؟ اور مزدوری کرتی تھیں۔ پھر پھوڑتی تھیں۔ انہیں اخائی تھیں۔ بیڑیوں پر چڑھتی تھیں۔ ذرا بھی تھیں جس کی وہ نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کو نکلی نظر آ رہی ہوتی گی۔

ڈیلی آخس سے آنے کے بعد مکان بننے ہوئے دیکھتے تو می وہاں کھڑے ہو کر بڑی غرت سے کہتی

کام ختم ہو اور می اسے رات کے بچے ہوئے پاسی وال چاول دیں۔ ایک دن می نے یاد کو جو کھانا دیا اس میں ڈبل روٹی کے وہ ٹکڑے بھی شامل تھے جو بیج میں نے دانتوں سے کاٹ کر می کے ڈر سے پلیٹ کے نیچے چھپا دیے تھے۔

می یہ تو میری جھوٹی ڈبل روٹی ہے یاد کی کومت دیتے۔

جب۔ می نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے چپ کرایا میں میری سمجھ میں نہیں آئی کہ می جھوٹی ڈبل روٹی یاد کو کیوں دے رہی تھی۔ می سے کھانے کے کہ جب یاد اور اس کے بہن بھائی گیت کے پاس بیٹھ کر کھانے لگے تو میں نے یاد کی کہا۔ یاد تو یہ تو س مت کھا۔ جھوٹا ہے۔

جھوٹا ہے تو کیا بات؟ یاد کھانے میں جتنی ہوتی تھی۔ آج کی ڈبل روٹی اتنی حقیر دے تو نہیں تھی پھر یاد اسے اتنے مزے لے کر کیوں کھا رہی تھی۔ صبح تو مجھ سے یہ کی طرح نہیں کھاتی تھی۔ می نے سینڈوچ بنا کر دیا تو میں نے منہ میں رکھا اور پھر پلیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ میں دواڑے کی ریلنگ پر چڑھا نہیں کھانا کھاتے دیکھنے لگا۔ اچانک مجھے بھی خوب زور کی جھوک لگی۔ جتنی چاہ رہا تھا کہ اپنی پلیٹ لے کر بھیجیں ان کے ساتھ کھانے بیٹھے جاؤں۔ پھر جھوٹی ڈبل روٹی یاد کی تو مجھے لپکاٹی آگئی۔ محی کتنی خراب ہیں۔ انہوں نے یاد کو جھوٹا کھانا یاد کیا نہیں اس کی سزا ملے گی۔ یہ بات میں سکول جاتے ہوئے بھی سوچ رہا تھا۔

پھر ہماری ہندی نیچر نے گاندھی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ غریبوں کے سبکدوش تھے تو میں نے نیچر سے پوچھا میڈم کوئی آدمی غریبوں کو جھوٹی ڈبل روٹی کھلا دے تو کیا ہوگا۔

پاپ ہے یہ تو۔ کہ معلوم کسی دن غریب آدمی امیر بن کر اسے بھی دکھ پہنچا سکتا ہے۔ نیچر نے سمجھایا

مگر یاد یاری پجاری تو کبھی امیر نہیں بن سکتی۔ میں نے سوچا۔

شام کو می نے فرنج میں سے نکال کر مجھے سیب دیا۔ محی کل آپ نے یاد کی جھوٹی ڈبل روٹی کیوں دی۔

ہائے رام میرا بیٹا کتنا حساس ہے۔ محی نے ہنس کر ڈیلی سے کہا۔ کھانے سے اسے کبھی ٹکڑ ہے۔ میرے جامعہ لوگ جھوٹا کھانا کھانے کے عادی ہیں۔ یاد کی دادی پوری کالونی سے بھیک مانگ کر لاتی ہے۔ وہ بھی تو ہماری جھوٹی ہوتی ہے نا؟

پھر می نے سیب کے چھلکے الگونی سے نیچے بھیک کر کہا۔ اب تم قمارشاد دیکھو۔ یاد اور اس کے بھائی وہ سب چھلکے زمین سے اٹھا کر کھا لیں گے۔ یہ کیسے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹے۔

میرے محی بڑی دھمے دھمے لہجے میں بات کرتی ہے۔ بڑے ٹھٹھے انداز میں اس لیے میں ان کی بات مان لیتا ہوں۔

دوسرے دن میں سکول سے آیا تو می گھر میں نہیں تھیں۔ ڈیلی نے بتایا کہ محی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔

فرنگ کال آیا تھا۔ اس لیے می دوپہر کے پلین سے ہمیں چل گئی تھیں۔ اس لیے میں خوب رویا۔

روتے روٹے سو گیا۔

آدھی رات کو آکھ کل تو کیا دیکھتا ہوں کہ یاد کی ماں دواڑے کے بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے اور اپنے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر جھوٹا سیب ڈیلی کے منہ میں رکھ رہی ہے۔

اجھا تو آج وہ آگئی ہمارے گھر جھوٹی ڈبل روٹی کھانے کا انتقام لینے ڈر کے مارے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

برداشت ہونے کے باوجود بھی انہیں سہتا ہی پڑتا ہے۔ ہر مٹ کی بد مزاجی اپنا روپ دکھانے لگی تھی۔ ہر مٹ کی بد مزاجی کے بارے میں سوچے ہی گھڑیس ہاتھ روم سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ ریڈیو کا سوچ آن کرنے کے بعد وہ چرتی کے ساتھ کھانا تیار کرنے میں جت گئی۔ ہر مٹ کے واپس آنے میں صرف ایک گھنٹہ ہی تھا اور اس کے آنے سے پہلے کھانا ہر صورت تیار ہونا چاہیے تھا۔ آج اسے پھول کا سوپ، روٹل پکین، مین چائپ اور چیری کی پانی بنانا تھیں۔ چیری کی پانی ہر مٹ کی مرغوب ترین ڈش تھی۔ گھڑیس جانتی تھی کہ ڈانگک نیل سے اٹھنے سے پہلے وہ ساری پانی نکل چکا ہوگا۔ وہ تھا ہی اتنا چٹورا۔ اس کی دوسری عادتیں بھی اتنی کھلی تھیں کہ گھڑیس کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ شدید نفرت۔ گھڑیس کا بس نہ چلنا تھا کہ اسے شوٹ کر دے۔ وہ خود چھائی کے تختے پر نہیں جانا چاہتی تھی۔

کام میں مصروفیت کے ساتھ ساتھ وہ ریڈیو سے فخر ہونے والی موسیقی کی لے پر گھٹکا بھی بنی تھی۔ دفعۃً اسے موسیقی کے ڈک جانے کا احساس ہوا۔ پھر ایک اناؤنسر کی آواز گونجنے لگی۔ ”سائمن! ہم ایک اہم اعلان کرنے کے لیے موسیقی کے پروگرام کو عارضی طور پر روک رہے ہیں۔ شرف کے آپس سے اعلان کیا گیا ہے کہ جادوس بیکری کے ایک ملازم البرٹ مینلو نے آج صبح بیکری کی تیار ہونے والی چیری پانی میں ایک مکین چبے چے مارڈر لانے کا اعتراف کیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ البرٹ مینلو کافی عرصے سے ذہنی مریض رہا ہے اور آج صبح اسی پاگل پن کے دورے کے تحت اس نے یہ حرکت کی ہے۔

جن خریداروں نے آج صبح جادوس بیکری کی

لڑا رہی ہوگی۔

”تم کس سوچ میں ڈوب گئیں گھڑیس؟“ جی نے بڑے رومانی لہجے میں سرگوشی کی اور گھڑیس کے بالوں کو انہیوں سے سلجھانے لگا۔

ایک کیف و سرور میں کھلی ہوئی لذت نے گھڑیس کو اپنی گرفت میں لے کر بالوں کے اوپر پہنچا دیا۔ وہ گزشتہ دو ہفتے سے اس رومان کی کیف آفرینیوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ وہ خرابیوں کی جنت میں تھی۔ خواب حقیقت کا روپ دھار کر اس کے انگ انگ کو سرور بخش رہے تھے لیکن ابھی تک گھڑیس کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ حقیقی دنیا میں خوشی حاصل کر رہی ہے۔ جی ان کے کمان کے ایک حصے میں گزشتہ دو ماہ سے کرائے پر رہ رہا تھا۔ پندرہ دن قبل تک ان کے درمیان سرسری علیک سلیک ہی ہوئی تھی۔ پھر چاکلے کی جی نے ہر مٹ کی عدم موجودگی میں گھڑیس سے راہ و رسم و آشنائی پیدا کر لی تھی۔ گھڑیس اپنے بے بہم اور بد مزاج شوہر کی بد مزاجی اور بے اعتنائی کی ماری ہوئی تھی۔ جی کی ہر چوش محبت اسے اپنے سیلاب میں تنگ کی طرح بہا کر لے گئی۔

ہر مٹ کا خیال آتے ہی گھڑیس نے اپنے آپ کو جی کی گرفت سے رہا کر لیا اور اس کے اصرار کے باوجود وہاں سے چل دی۔

ہاتھ روم میں جا کر اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے گھڑیس کو مدقوں بعد چہرے پر شادابی کی موجوں کا احساس ہوا۔ ہاں جی کی محبت اسے بڑھاپے کی رنگور سے واپس لے آئی تھی۔ مدقوں بعد اسے اپنے چہرے پر چادریت نظر آئی، بارہ برس بعد۔ ہر مٹ سے اس کی شادی ہوئے تیرہ برس بیت چکے تھے۔ ایک ہی سال کے بعد ہر مٹ کا وہ روپ سامنے آ گیا تھا جو بیویوں کے لیے ناقابل



ایس۔ امتیاز امیر

اختیاط

کیسانیت زندگی کے لطف کو شکر کر دیتی ہے اور جب کیسانیت میں اذیت کا پہلو بھی شامل ہو تو نہایت ہی خواہش فطری ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے وہ عورت اپنے شوہر سے تنگ آ گئی تھی۔!

ایک محرم مناکا حال جس نے ایک نوجوان سہارا ڈھونڈ لیا تھا۔!

”ہوتا۔ ہر مٹ تو کسی گینڈے کی طرح موٹا ہے، بھدا ہے اور بد مزاج ہے جسے ہر وقت بس کھانے کی فکر ہی پڑی رہتی ہے۔“ جی ڈارنگ! اگر اس کی واپسی پر میں گھر میں نہ ہوں تو وہ پریشان ہوگا۔“

”اور اسے شاید تم پر شبہ بھی ہو“ جی نے کہا۔

گھڑیس دل ہی دل میں ہنس دی۔ اسے معلوم تھا کہ ہر مٹ اس پر شبہ نہیں کر سکتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھڑیس اس کی نامطین بیوی خود سے آٹھ نو سال چھوٹے ایک زبردست تعلیم لڑکے سے رومان

”چھ ہج گئے ہیں جی! اب مجھے جانے دو!“

گھڑیس نے ٹیلی آکھوں والے جی کی آغوش میں چمکنے ہوئے کہا۔

”ابھی نہیں ڈارنگ، ابھی نہیں!“ نوجوان جی نے کہا۔ ”آخر انہی جلدی بھی کیا ہے؟“

”تمہیں معلوم ہے جی مجھے جا کر ہر مٹ کے لیے کھانا تیار کرتا ہے۔“ ہر مٹ کا نام لینے ہی گھڑیس کے منہ میں کڑواہٹ بھر گئی۔ اس نے سوچا یہ نوجوان چلتا دھلا سہارا سماجی! کاش یہ میرا شوہر

تیار کردہ چیری پانی کے پیکٹ خریدے ہیں انہیں مطلع کیا جاتا ہے کہ اس چیری پانی کو استعمال کرنا مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کے پاس اس قسم کا کوئی پیکٹ ہوتا تو براہ کرم فوری طور پر شرف سے دفتر میں اطلاع دیں۔ چاروس نکیری کی چیری ان دکانوں اور سپر مارکیٹوں میں فروخت ہوتی ہے۔

اس کے بعد اناؤنسر نے جو کچھ گاٹھلیڈس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اب مزید کچھ سننے کی ضرورت بھی نکستی۔ چیری پانی کا جو پیکٹ وہ خرید کر لائی تھی وہ سامنے ہی پڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروس نکیری ہی کا تیار کردہ تھا۔ فوری طور پر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ پالٹر اس کی خاموشی دعا میں قبول ہو چکی تھیں۔ اسے کئی شین قوت نے اپنے شوہر سے نہایت حاصل کرنے کا بہتری موقع فراہم کیا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ منصوبہ فوری طور پر بن سکتا تھا۔ اناؤنسر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مہلک۔۔۔ ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا خبر میں نے جو پیکٹ خریدیا ہے وہ کل تیار کیا گیا ہو اور اس میں زہری آمیزش نہ ہو! مجھے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے! اس نے ریڈیو بند کر دیا اور جلدی سے گمران میں چلی گئی۔ وہاں ایک شیفٹ پر مختلف قسم کی کپڑے مار دواؤں، مصنوعی کھاد، کیمکی مار پاؤڈر وغیرہ کے ڈبے پڑے ہوئے تھے اور وہیں ایک ڈبا جوے مار زہر کا بھی تھا۔ وہ اس ڈبے کو لے کر تقریباً دوڑتی ہوئی واپس چکیں میں آئی۔ ہر برٹ کے آنے میں اب بہت تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ وہ کبھی کبھار وقت سے دو چار منٹ پہلے تو آ پہنچتا تھا مگر تاخیر سے بھی کبھار میں تھا۔ گاٹھلیڈس کو اس کے آنے سے پہلے پہلے چاروس نکیری کے خریدے ہوئے پیکٹ کی چیری پانی تیار کرنا تھی۔ اس پائل آدمی کے لمائے ہوئے چوہے

نکستی جہاں جا کر وہ ہر برٹ کو مارتے ہوئے دیکھنے کی اذیت سے بچ سکتی۔

آخر اس نے سوچ سوچ کر ایک کام نکال ہی لیا۔ وہ لان میں جا کر پودوں کو پانی دینے لگی۔ اچانک اس کی نظر مکان کے اس حصے کی طرف اٹھی جہاں بھی کی رہا تھی۔ اسے چکن نظر آ رہا تھا جہاں بنی کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ گاٹھلیڈس کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اس نے ایک ہوائی بوسہ اڑھایا اور پھر کسی کام سے چلا گیا۔ گاٹھلیڈس کو مایوسی ہوئی۔ آف یہ ہرجائی مروا ہے نہیں بھی کیوں چلا گیا ہے؟ پتا نہیں ہر برٹ کی انشورنس پالیسی اور چاروس نکیری پر مقدمہ چلا کر تکمیل طور پر وصول ہونے والا ہرجائی کو کب تک میرا سامان دینے کے قابل رکھے گا؟ تقریباً ایک لاکھ روپوں کے گاٹھلیڈس نے سوچا۔

کانی دیر بعد جب وہ بینک کی کیمپلی دیوار کے پاس گلاب کے پودوں کو پانی دے رہی تھی بینک سے موسیقی کی آواز آئی۔ اس کے ہاتھوں سے دائرہ پاپ چھوٹ گیا۔ ہر برٹ نے ریڈیو آن کر دیا تھا۔ مگر اب وہ خصوصی شین دوبارہ نشر کیا گیا تو یہ سوچ کر ہی اس کے اعصاب تن گئے۔ چیری پانی کا اثر قواب تک شروع ہو چکا ہو گا۔ ہر برٹ حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد کیا کرے گا؟ ڈاکٹر؟ پولیس؟ یا وہ مجھے قتل کر دے گا؟

پھر اسے بینک سے ایک روپوش ڈولی ہوئی کراہ کی آواز آئی۔ اس کے بعد دم کی آواز آئی۔ ہر برٹ فرش پر گر پڑا۔

”گاٹھلیڈس۔۔۔ گاٹھلیڈس۔۔۔!“ ہر برٹ نے اسے پکارا۔ چکنوں کے بعد وہ دردناک آواز خاموش ہو گئی۔

گاٹھلیڈس فوری طور پر اندر نہیں گئی۔ وہ دائرہ پاپ اٹھا کر پودوں کو پانی دیتی رہی۔

بے ذائقہ اور بے پلوچے مار زہر سے چیری پانی کے حربے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ چٹاڑے لے لے کر کھاتا رہا اور گاٹھلیڈس کا خون اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ اسے کوئی ڈھارس بھی تو یہ کہ آج ناقابل برداشت اذیت کا آخری دن ہے۔ ہر برٹ کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا، پلٹنا پھرتنا، بائیں کرنا، اس سے پیار محبت کرنا، یہ سب کچھ کبھی اذیت کا باعث بننا تھا اور آج یہ اذیت ختم ہونے والی تھی۔

اس نے فوری طور پر چکن سے بلکہ اس گھر سے ہی باہر جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ہر برٹ سے اپنی تمام تر نفرت کے باوجود اسے مارتے ہوئے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی تھی۔ وہ ایسے وقت واپس آنا چاہتی تھی جب ہر برٹ مر چکا ہو۔ ممکن ہو تو وہ واپس ہی کسی اور فلو کو دیکھی اپنے ہمراہ لانا چاہتی تھی تاکہ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کا ایک گواہ مہیا ہو سکے۔ پہلے تو اس نے بھی کے پاس جانے کے لیے سوچا مگر پھر فوراً ہی یہ خیال ”مزور کر دیا۔ بھلا وہ کس بھانے اس کے پاس جا۔۔۔“ ہو گئی وہ اس معاملے سے بھی کو باکل الگ تھلک رکھنا چاہتی تھی تاکہ بھی حقیقت سے واقف نہ ہو سکے۔ ہر برٹ کا قتل اسے بھی حادثاتی موت ہی محسوس ہوا اور بعد میں وہ اپنی تپو چو سہارا دینے کی خاطر اس سے شادی کر لے۔ اس موقع پر بھی کے پاس جانے سے پولیس کی نظروں میں بھی نہ آسکتا تھا۔

میری ان! مجھے اس کے پاس چلا جانا ہے! گاٹھلیڈس نے سوچا۔ میری این ان کی جھانکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کب کب اس نے باہر سال تک اپنی جان پر کیا کیا قسم سے ہیں۔ آکر میری این کو مطلع ہو جانا کہ گاٹھلیڈس نے ہر برٹ کو ہلاک کر دیا تو شاید وہ خوش ہوتی مگر کسی کا کیا بھروسہ! اس نے میری این کے پاس جانا بھی مناسب نہ سمجھا۔ کوئی جگہ بھی ایسی

ہر برٹ آتی تو حسب معمول اس کا مزاج بیڑا ہوتا تھا۔ گاٹھلیڈس نے پرسکون رہنے کی پوری کوشش کی۔ دونوں کھانا کھانے بیٹھے۔ ہر برٹ نے عادت کے مطابق ہر شے میں کوئی نہ کوئی نقص ڈھونڈ نکالا اور گاٹھلیڈس پر طنز کرتا رہا۔ ہر لمحہ وہ گاٹھلیڈس کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔

گاٹھلیڈس سوٹ ڈش کھانے کی عادی نہیں تھی اس لیے ہر برٹ ساری چیری پانی کھا کر اور اس نے چیری پانی میں کوئی بھی نقص نہیں نکالا۔

اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔“

”یہ تو ضروری نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بھی فوری طور پر کسی کے مرنے کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ پولیس مین نے اس کا چہرہ بخود دیکھتے ہوئے کہا۔ گلیڈس نے زور ہو کر نظر چرائی۔ ہاتھیں یہ پولیس مین کیا سوچ رہا ہے گلیڈس کوئی اعزاز نہ لگا سکی۔

”آپ کے شوہر کے چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ زہر خورانی کا کیس ہے، تلا پڑا ہوا ہے چہرہ!“ گلیڈس کا بدن زور سے لرز اٹھا۔

”اوہ مجھ مر! معاف کیجئے گا میرا مطلب آپ کو خوفزدہ کرنا نہیں تھا لیکن۔۔۔ لیکن چند سوالات کا جواب آپ ہی دے سکیں گی۔ کیا کسی وجہ سے آپ کے شوہر نے دانشہ طور پر زہر نہیں کھا لیا؟“ ”اوہ نہیں، ہرگز نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی ہمارے گھر میں زہر موجود ہی نہیں ہے۔“

”کیا چوہے مارزہ بھی نہیں ہے؟“ پولیس مین نے سوال کیا۔ گلیڈس جواب دینے میں ہچکچاتی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ یہ شخص میرے لیے کسی قسم کا پسندیدہ تیار کر رہا ہے۔ شاید اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ اس نے متذبذب ہو کر کہا۔ ”مجھے۔۔۔ مجھے اس بارے میں یقین نہیں ہے۔ ممکن ہے چوہے مارزہ ہر نہیں پڑا بھی ہو۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر نہیں! ہر مرٹ گھر میں ایسا چیز نہیں رکھ سکتا تھا۔“

”تقریباً ہر گھر میں ہزاروں قسم کی زہریلی دواں موجود ہیں مجھ مر!“ پولیس مین نے کہا۔ ”جراثیم کش ادویات، مصنوعی کھاد، نیند کی گولیاں! اس طرح کی چیزیں ہر گھر میں ہوتی ہیں۔“ پولیس مین نے خاموش رہ کر گلیڈس کے بولنے کا انتظار کیا۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو پولیس مین نے اچانک کہا۔ ”کیا آج شام کے وقت آپ نے خصوصی ٹیلیفون

کا فون دیر بعد جب وہ کچن میں آئی تو ہر مرٹ واقعی سر چپکا تھا۔ اس نے ہر مرٹ کی ٹیٹو ٹولی اور دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ ہر مرٹ زندہ نہیں تھا۔ گلیڈس کے لیے نفوس اور طعنوں اور حقیر کے الفاظ سے تحریر کردہ ایک کتاب ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھی۔ اب سکون ہی سکون تھا، آرام ہی آرام، راحت ہی راحت۔ گلیڈس نے ریڈیو بند کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے دجود کو دو مضبوط ٹوجہاں بازوؤں کی گرفت میں محسوس کرنے لگی، تصوراتی طور پر! کاش مستقبل میں وہ مضبوط بازو ہمیشہ میرا سہارا بنے رہیں۔ پھر گلیڈس نے پولیس کو فون کر دیا۔

پولیس مین جو چھری سے بدن اور ٹیٹا آنکھوں والا تھا بڑے غور سے اس کی داستان سنتا رہا۔ اس نے گلیڈس کی باتوں میں برائے نام مداخلت کی۔ اسے دیکھ کر گلیڈس کو بار بار اپنا محبوب جی یاد آ رہا تھا۔

اس کا بیان مختصر اور واضح تھا اور انداز بیان بڑا برجستہ! اس کے کہنے کے مطابق ہر مرٹ حسب معمول دفتر سے واپس آتے ہی ڈنر کھانے میں لگ گیا تھا۔ ہر مرٹ دیر تک کھاتے رہنے کا عادی تھا۔ گلیڈس نے تھوڑا سا کھانے کے بعد کھینچ لیا تھا اور پھر لائن میں پانی دینے کے لیے باہر چلی گئی تھی۔ ایک کھینچے بعد جب وہ واپس اندر گئی تو اس کا شوہر مر رہا تھا۔

حالت میں فرش پر دراز تھا۔ ”آپ نے فوری طور پر پولیس کو فون کر دیا؟“ پولیس مین نے کہا۔

”جی ہاں، اسی وقت!“ گلیڈس نے جواب دیا۔

”لیکن آپ نے پولیس سے پہلے ڈاکٹر کو فون کیوں نہیں کیا؟“

”ہر مر۔۔۔ ہر مرٹ سانس نہیں لے رہا تھا۔“



اشارہ

یورو گوا سے ہو رہی یورو گوا کی مختصر، دلچسپ کہانی
ایک خوش گلی کی نامہ بری اسے مردوں سے شکایت کی

ستار ہار

جنت! میں یہ چند سطور آپ کی خدمت میں
بجج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ انہیں اپنے
نام سے شائع کرا دیں گے۔ میں نے یہ درخواست
آپ سے اس لیے کی ہے کہ میں جانتی ہوں، اگر

جنت! میں یہ چند سطور آپ کی خدمت میں
بجج رہی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ انہیں اپنے
نام سے شائع کرا دیں گے۔ میں نے یہ درخواست
آپ سے اس لیے کی ہے کہ میں جانتی ہوں، اگر

”مختصر! آپ کے شوہر کی ہلاکت کا سبب ابھی
تک معلوم نہیں ہوا۔“
”میں ہوا؟ کیسے نہیں ہوا؟ ابھی آپ خود ہی
تو۔۔۔“

”ہاں میں نے کہا تھا کہ چیری پائی میں زہر ملا
ہونے کے بارے میں میں خصوصی ٹینٹن شری گئے
ہیں لیکن ابھی ایک کھنے قبل صورتحال کی وضاحت
کے لیے ایک اور خصوصی ٹینٹن بھی تشریف لیا تھا۔ جس
آدمی نے زہر ملانے کا اعتراف کیا تھا، شریف کے
خیال میں اس نے شخص اپنی پہلی کرانے اور اخبار
میں اپنی تصویر چھپوانے کے لیے جھوٹا بیان دیا تھا۔
شریف کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ
اس شخص کا تو چیری پائی بنانے والے کارکنوں سے
کوئی تعلق ہی نہ تھا اور اس کے لیے ایسی کوئی حرکت
کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ وہ شخص شخص اپنی تصویر
چھپوانے کی خاطر۔۔۔“

”مگر۔۔۔ مگر ریڈیو پر تو۔۔۔؟“ گلیڈس
بیہوش ہونے کے قریب تھی۔ ”ہاں ریڈیو پر بلاشبہ
فوراً ہی زہری آ میز کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ دراصل
تحقیقات کی مکمل تک شریف شہریوں کی جان کے
لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ ہم اس بیکری
کے بے شمار کبکوں سے چیری پائی کے ٹیکٹ واپس
حاصل کر کے اطمینان حاصل کر چکے ہیں کہ وہ شخص
جھوٹا تھا۔ بہر حال ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا
ہوں۔ آپ کے شوہر کی ہلاکت کا اصل سبب تو
میڈیکل رپورٹ آنے پر ہی پتا چل سکے گا۔“

اس سے گلیڈس نے اس کی نیلی آنکھوں میں
دیکھ کر سوچا کہ یہ شخص جی سے کس قدر ملتا ہے مگر اس
کی آنکھیں تو مجھے قاتل قرار دے رہی ہیں۔۔۔
کاش۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟

”سنا تھا مختصر؟“
”خصوصی ٹینٹن؟ کس بارے میں؟“ گلیڈس
نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”جاروس بیکری کی گڑبڑ کے بارے میں!“
”نہیں تو، میں نے آج سارا دن ریڈیو آن ہی
نہیں کیا۔“ گلیڈس نے کہا، اور پھر فوراً ہی گھبرا بھی
گئی وہ سوچ رہی تھی، شاید ریڈیو کی باڈی پر ہاتھ لگا
کر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ وہ ابھی تک گرم ہے یا
نہیں! اگر وہ اس طرح پکڑی گئی تو؟ مگر پولیس میں
نے ریڈیو کی طرف دیکھا نہیں تھا جس سے
گلیڈس کو قدرے اطمینان ہوا۔

”گلیڈس! آپ جاروس بیکری والی گڑبڑ کے بارے
میں کچھ نہیں جانتیں؟“
”نہیں، مجھے واقعی کچھ نہیں معلوم! آخر بات کیا
ہے؟“ گلیڈس کی ادکاری عروج پر تھی۔

”میں بتاتا ہوں۔ آج سہ پہر سے شام تک
ریڈیو پر وقفے وقفے کے ساتھ ہی خصوصی ٹینٹن نشر
کئے گئے تھے جن کے ذریعہ لوگوں کو جاروس بیکری
کی تیار کردہ چیری پائی میں جو ہے مار زہر ملا ہونے
کی خبر دے کر محتاط رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ آپ
نے کوئی ایسا ٹینٹن نہیں سنا؟“

”نہیں۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ آج دن بھر
میں نے ریڈیو سنا ہی نہیں۔“ گلیڈس نے کہا اور پھر
اچانک مصنوعی طور پر متوجہ ہو کر بولی ”مگر۔۔۔ مگر
ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے؟ کہ۔۔۔ کہ چیری پائی
میں زہر ملا ہوا تھا؟ آہ۔۔۔ ہر رٹ نے بھی تو چیری
پائی ہی کھائی تھی، جاروس بیکری کی تیار کردہ!
غور کیا۔ گلیڈس آپ کا مطلب ہے کہ میرے شوہر کا
انتقال اس بیکری کی بدعاتی می کی وجہ سے ہوا ہے؟
آہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں ان پر مقدمہ دائر کر دوں
گی۔۔۔ میں۔۔۔“

ہرد اور عورت کی نفسیات

ایک ماہر نفسیات نے مردوں اور عورتوں کے متعلق دلچسپ حقائق جمع کئے ہیں۔

☆ مرد بڑا سلائی جلاتے وقت سلائی اپنی طرف رگڑتا ہے جبکہ عورت عموماً مخالف سمت میں رگڑتی ہے۔

☆ مرد لباس کے سلسلے میں دوسروں کی تقلید کرتے ہیں اور عورتیں لباس میں انفرادیت قائم رکھنے پر زور دیتی ہیں۔

☆ مرد اپنے ناخن دیکھنے کے لیے منہ بند کرتا ہے لیکن عورت اپنی طرف ہاتھ پھیلا کر دیکھتی ہے۔

☆ مرد سوار استعمال کرنے کے بعد اسے تھوکتے ہیں جبکہ عورتیں انہی سے منہ صاف کرتی ہیں۔

☆ مرد عموماً عورت کو ان کاموں سے روکتا ہے جو وہ کرتی ہے لیکن عورت مرد کو وہ کام کرنے کو کہتی ہے جو وہ نہیں کرتا۔

☆ عورت اگر راستہ بھول جائے تو کسی سے راستہ پوچھتی ہے مگر مرد خود ہی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(مرسل: تبسم انور یلپی)

بقی روٹ پر چلنے والی غلام پر سوار ہوتا ہے۔ میری عمر تین برس ہے۔ میں بے فکر کی لڑکی ہوں اور دینی بھی نہیں ہوں۔ میری جلد بھی زیادہ بھوری یا سیاہ نہیں ہے۔ میرا ہاتھ چوڑا ہے لیکن ہڈیاں نہیں اور آنکھیں بھی چھوٹی نہیں ہیں۔ آپ انہی طرح مردوں کی عادت جانتے ہیں کہ وہ غلام پر سوار ہوتے وقت عورتوں کو ضرور دھرتے ہیں اور پھر سوار ہو کر ان کے قریب پہنچتے ہیں۔ یہ بات میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں کیونکہ میں ان کے چہروں سے ان کے دل کی کتاب پڑھنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ پانچ

حکروں سے بیزار ہونے لگی، مگر ان حکروں سے آنکھیں جھپکا جی نہ سکتی تھی کہ غلام پر میں ملازم ہوں، اور یہ بات میں آپ کو بتانا چکی ہوں۔

اپنے فرائنٹ شخص کی انجام دہی کے دوران روزانہ عین میں مردوں کی فطرت کا مطالعہ کرتی رہتی ہوں اور میرے ساتھ سڑہ ہارے واقعات ہوتے ہیں

جب مردوں نے شہر پار کر ڈا اور قریب آنے کی کوشش کی تو میں نے انہیں بڑی صفائی سے فچہ دے دیا۔ کسی کے بیٹے ہوئے قدم دیکھ کر میں ہلکے سے مسکرائی رہی..... جب قدم نے چھوٹا سا فاصلہ اور بھی طے کر لیا تو میری مسکراہٹ تیز ہو گئی۔ اب مرد کیا کرتا ہے، وہ بے نیاز ہو کر اوپر دیکھتے ہوئے آنکھیں جھپکا

ہے، پھر غلام کے فرش پر نظر ڈالتا ہے، اس کے بعد عورت کی طرف دیکھتا ہے، یا یوں کہیے کہ ان سڑہ مردوں میں سے کسی ایک نے یہ تمام حرکتیں کر کے

بیزار یا ناراضی کو نہ دیکھ کر وہ مسکراتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں یہ اعزاز لگا رہا ہے کہ اس کے پاؤں اور میرے پاؤں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور پھر اپنا

پاؤں اس صاب سے اٹھاتا اور آگے بڑھاتا ہے کہ اس کا پاؤں میرے پاؤں یا ٹانگ سے جو بھی جائے اور میں یہ بھی سمجھوں کہ یہ سب کچھ اتفاقاً ہوا ہے اور اس سے پہلے کہ جب مرد قاضی کا اعزاز لگا کر آنکھیں

اوپر اٹھائے اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے تو میں اپنا پاؤں دھرتی چلی ہوتی ہوں، پھر غیبی میں اس مرد کے چہرے کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ وہ نظریں اٹھا کر مایوسی سے میری طرف دیکھتا ہے۔ ادھر میری آنکھوں میں اس کے لیے انتظار ہوتا ہے۔ ایک داغ

انتہا! ابھی بات یہ ہے کہ میری ذمگی میں ایک بار ایسا ہوا کہ میرے دل نے مجھے تڑپ دی کہ میں ایک شخص کے پاؤں سے پاؤں بڑھا دوں۔ میں نے اپنا پاؤں اٹھا اور اس مرد کے پاؤں سے بڑھا دیا۔

جناب، مرد وہ آپ سے لیکن آپ نے میرے اشارے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو شدید روئل کا انتظار

کرتے ہوئے منہ اور ناراضی سے گھورتے بھی لگتے ہیں اور بعض تو اس اہانت کا بھی برا نہیں مانتے اور بے حذر قدم آگے بڑھا دیتے ہیں۔

میں بے سطور آپ کو اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپ اسے نام سے بتا سناور کہ شائع کر دیں تاکہ مردوں کو کچھ علم آ سکے اور وہ ایسی حرکتوں سے باز

رہیں۔ میں غلام کے جھگے میں ملازم ہوں اور میرے پاس خاصی نقدی بھی ہوتی ہے اور نقدی کی حفاظت کے لیے محافظوں کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ آپ کی تحریر میں جان ہے۔ آپ کا پرنٹیر الاشاعت ہے۔

ان مردوں کو مطلع کر دیتے کہ وہ محافظ خود نقدی کی حفاظت کرتے ہیں وہ غورلوں کی حفاظت پر بھی مامور ہیں۔ وہ عورتیں جو میرے جیسی ہیں، بے فکر، رنگ

نہ زیادہ سیاہ نہ سفید وہ اپنا چوڑا کر بڑھائیں، آنکھیں بھی چھوٹی نہیں۔

محترم خاتون! آپ نے جو مراسل بھیجا ہے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ سڑہ آپ نے مردوں کو غیہ اور ہرزہ

آپ کا ساقیتہ نئے مردوں اور ان کی حرکتوں سے پڑتا ہے۔ آپ کا مراسل پڑھ کر میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا ہے، کیا آپ اس کا جواب دینا پسند کریں گی؟ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کا اپنا بھی یہی نہیں چاہا

کہ آپ کسی مرد کے پاؤں سے اپنا پاؤں بڑھا لیں؟

جناب! ابھی بات یہ ہے کہ میری ذمگی میں ایک بار ایسا ہوا کہ میرے دل نے مجھے تڑپ دی کہ میں ایک شخص کے پاؤں سے پاؤں بڑھا دوں۔ میں نے اپنا پاؤں اٹھا اور اس مرد کے پاؤں سے بڑھا دیا۔

جناب، مرد وہ آپ سے لیکن آپ نے میرے اشارے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

اقوال حضرت علی رضی اللہ عنہ

- ☆ کشادہ روی سے پیش آنا سب سے پہلی نگیں ہے اور خندہ پیشانی سے رہنا شریف کی خصلت ہے۔
- ☆ شہریتوں کا قلعہ اور حیا پوری شرافت اور لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا اپنی نعمتوں کو بڑھانا ہے۔
- ☆ ہوشیاری نہایت مضبوط راہ ہے اور غفلت نہایت موزی دشمن ہے۔
- ☆ عقل فہم کا ذریعہ اور عقل مذمت کا باعث ہے۔
- ☆ عقل نہایت مستحکم اور مضبوط اساس اور پرہیزگاری نہایت بہترین لباس ہے۔
- ☆ بہشت ان لوگوں کو ملتی ہے جو نیک کاموں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔
- ☆ دوزخ ایسے لوگوں کا آخری مقام ہے جو نیک کاموں میں کوتاہی کرتے ہیں۔
- ☆ عقل نہایت بہترین نعمت اور جہالت سخت موزی دشمن ہے۔
- ☆ علم بہترین شرافت اور عمل نیک، نہایت اچھا خلیفہ اور جاشین ہے۔
- ☆ اتفاق شرک کا بھائی اور غیبت سخت برا جھوٹ ہے۔
- ☆ جہالت سے پاؤں پھسلتا ہے اور ظلم سے نعشیں دور ہو جاتی ہیں۔
- ☆ زہد دین کی بڑ اور سچائی پرہیزگاروں کا لباس ہے۔
- ☆ دین نہایت مضبوط ستون، پرہیزگاری بہت اچھا تو شر ہے۔
- ☆ طاعت نہایت محفوظ سامان اور قدرت الہی میں فکر کرنا اچھا سہارا ہے۔
- ☆ پرہیزگاری اچھا ساجی اور اہل مضبوط قلعہ ہے۔
- ☆ عقل سوچ اور فکر کو درست کرتی اور عدل مخلوق کو سنوارتا ہے۔
- ☆ عذر پیش کرنا عقلمندی کی دلیل، بردباری فضیلت کا سرنامہ ہے اور معافی بزرگی کی نشانی ہے۔
- ☆ حیا نہایت براسمجی اور برائی نہایت برادر اور ازہ ہے۔
- ☆ عقلمند وہ ہے جو اپنی زبان (لغویات) سے بند رکھے اور ہوشیار وہ ہے جو زمانے کی رفتار پر چلے۔
- ☆ بری بات کہنے کا انجام برا ہے اور جواب سے عاجز رہنے کی نسبت گنہگار اور بے زبان ہونا اچھا ہے۔
- ☆ طاعت عقلمندوں کیلئے گویا مال نیست ہے (کہ جو بے شوق سے حاصل کرتے ہیں) اور علماء لوگوں کے حاکم ہیں۔
- ☆ مرد آدمی مال کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور مال وہی ہے جو آدمی کے کام آئے۔
- ☆ سخاوت شرافت طبع کا شمرہ اور منت رکھنا نیکی کی بر باد کرتا ہے۔
- ☆ زندگی بھئی مٹھی اور بھئی کڑوی ہوتی ہے اور دنیا جو کہ دیتی اور نقصان پہنچاتی ہے۔
- ☆ متوسط طور پر خرچ کرنے سے تھوڑا مال بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور فضول خرچی اور زیادہ خرچ کرنے سے بہت مال بھی ختم ہو جاتا ہے۔
- ☆ زہد یقین کی بنیاد اور راستی دین کا سر ہے۔



مرزا ظفر بیگ

کما کہانیاں

اس نے اگلے پانچ روز آئی سی یو میں کبھی کی حالت میں گزارے لیکن اس کے بعد ہی اس نے Mamma Mia کے الفاظ سنکھانے شروع کر دیئے۔ اس نے یہ فلم دیکھی تھی جس میں نیرل اسٹرپ نے اداکاری کی تھی۔ جلد ہی Layla بغیر کسی امدادی چیز کے اپنے آپ سانس لینے لگی۔

کوما سے جاگ اٹھنے والوں کی کہانیاں، جاگنے کے بعد اگر ذہن تیزیاں بدل گئیں

کو ما ایک ایسی کیفیت ہے جس میں حشاہ فرد طویل اور کبھی بیوقوفی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ عام طور سے یا تو کسی بیماری کا نتیجہ ہوتی ہے یا پھر کمر

چوٹ وغیرہ کے باعث ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات کوما کے مریض بھی اپنی نیند سے نہیں جاگتے اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں اور بعض اوقات کچھ

دیتے۔ اس نے یہ فکر دیکھی کہ جس میں میرل اسٹریپ نے اداکاری کی تھی۔ جلدی Layla بغیر کسی امدادی چیز کے اپنے آپ سانس لینے لگی۔ اب اس خوفناک تجربے کی واحد یاد اس کی ٹانگوں پر بلڈ پاورٹنک کے دیسے یا نشان ہیں۔

کوما سے جاگنے کے بعد اس بچی نے سگریٹ و شراب نوشی شروع کر دی

تین سالہ لڑکی Ya Wen کے ساتھ سڑک پر ایک حادثہ پیش آیا جس میں ایک تیز رفتار وین نے اسے ٹکرا دیا جس میں اس کی جان تو بچ گئی لیکن وہ کوما میں چلی گئی۔ اسے شدید چوٹیں بھی آئی تھیں۔ پانچ روز تک کوما میں رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آئی تو ایک بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ نہ جانے کیوں اچانک ہی اسے سگریٹ نوشی کا شوق ہو گیا اور وہ شراب بھی خوب پینے لگی۔

Ya Wen کی ماں Gao کا کہنا ہے کہ وہ اچانک ہی کسی بڑے بالغ فرد کی طرح سلوک کرنے لگی تھی۔ اس کی ماں نے اسے دیکھا کہ وہ واش روم میں چپ کر اپنے ڈیڑی کے سگریٹ کے پکٹ سے سگریٹ نکال نکال کر پی رہی تھی۔

شروع میں اس نے اپنے ڈیڑی کے سگریٹ چرا کر کام چلایا اور بعد میں ایک مقامی دکان سے ادھار خریدنے لگی۔ اس کی ماں Gao ایک شیلز میں رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اب میری بیٹی کو سگریٹ نوشی کا عادی ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اب تو لباس کے حوالے سے اس کی پسند اور انتخاب بھی بدل چکا ہے۔ وہ صرف مردانہ (لڑکوں والے) کپڑے ہی پہنتی ہے۔ Ya Wen کے باپ نے اب سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے اور یہ فیملی شہر کی دوسری جانب نقل مکانی کر چکی ہے لیکن

منسلک ہے۔ یہ ایسا انجیکشن اسٹریچر ہے جو بیداری اور سونے جاگنے کے بیچ اور کے لیے اہم ہے۔ کوما میں جانے والے مریض کے لیے ضروری ہے کہ اس کے bilateral cerebral cortices کے استحکام کو بھی چیک کیا جائے اور ساتھ ساتھ reticular activating system (RAS) پر بھی نظر رکھی جائے۔

☆☆☆

تین سالہ بچی گنگناہٹ ہوئی کوما سے جاگ اٹھی

تین سالہ Layla Towsey کو گردن توڑ بخار ہوا تو وہ کوما میں چلی گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹروں نے اس کی منجلی سے کہا کہ اسے ادویات کہنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ اس کے زندہ بچنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے مگر یہ تین سالہ بچی ابھی دنیا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ اچانک ہی کوما سے اس طرح جاگ اٹھی کہ اس نے Abba کا اپ ہٹ Mamma Mia گانا شروع کر دیا۔ اس نے پانچ روز کوما میں گزار دیے تھے جس کے بعد ہی اس میوزیکل ریکوری نے اسے جگا دیا۔ Layla کی ماں لینی ان اذیت ناک دنوں میں صرف یہی سوچتی رہی کہ اس کی معذور اور لاچار بیٹی کیسے ہوگی اور اس کی زندگی کیسے گزرے گی۔ ڈاکٹروں نے تنقید کے بعد ایسا تھا کہ Layla گردن توڑ بخار کا شکار ہوئی ہے اور ساتھ ہی وہ دماغ اور بڑھکے ہڈی کی سوزش و ملن یعنی meningococcal septicaemia میں بھی مبتلا ہے۔ اس کے بعد اس نے اگلے پانچ روز آئی سی یو میں گہری بیہوشی کی حالت میں گزارے لیکن اس کے بعد ہی اس نے Mamma Mia کے الفاظ گنگناہٹ شروع کر

سر پر لگنے والی شدید ضرب جو کسی گاڑی کے اٹلنے یا بلندی سے گرنے سے لگی ہوں۔ بعض اوقات مریض کو جان بوجھ کر دواؤں کے ذریعے کوما کی کیفیت میں منتقل کیا جاتا ہے تاکہ دماغ کی شدید چوٹوں کے بعد دماغ کی کارکردگی کو تحفظ دیا جاسکے یا مریض یا مریض کو بیماری یا اس سے صحت یابی کے دوران مزید شدید ترین تکلیف سے بچایا جاسکے۔ متاثرہ فرد کے شعور و ادراک کو برقرار رکھنے کے لیے دو اہم عصبیاتی اجزاء کا بالکل ٹھیک ٹھیک کام کرنا ضروری ہے۔ پہلا cerebral cortex یا گریے یا خائستری رنگ کا مادہ ہے جو دماغ کی بیرونی پرت کو ڈھکے رکھتا ہے اور دوسرا ایک اسٹریچر ہے جو brainstem میں واقع ہے۔ اسے reticular activating system کہتے ہیں اور مختصراً اسے RAS کہا جاتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ دماغ کے دیگر اجزاء میں سے کسی ایک یا دونوں کی انجری متاثرہ فرد کو کسی کی حالت میں پہنچا سکتی ہے۔ انسانی cortex کچھ اور سخت خائستری مادے کا گروپ ہے جو نوروں کے نیوکس پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے axons بعد میں سفید مادہ تشکیل دیتے ہیں اور یہ کائنات کے ادراک کا بھی ذمہ دار ہے اور یہ sensory input یا حسیت کو thalamic pathway کے ذریعے ریلے کرتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام عصبیاتی افعال کا انتہا پر ہے، سادہ رفتاری طور سے لے کر پیچیدہ افکار تک۔ دوسری جانب Reticular activating system (RAS) برین آئیم میں ایک زیادہ ابتدائی اسٹریچر ہے جو بہت مضبوطی کے ساتھ

عرسے بعد وہ جاگ اٹھتی ہیں۔ ذہن میں ہم کوما سے جاگ اٹھنے والے کچھ افراد کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں جن میں کوما نے بہت اہم لیکن ناقابل یقین تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ کوما ایک یونانی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ”گہری نیند“۔ طب میں کوما طویل بیہوشی کی ایک ایسی کیفیت کو کہا جاتا ہے جو چھ گھنٹے سے زیادہ مدت تک جاری رہ سکتی ہے۔ اس دوران متاثرہ فرد کو کبھی بھی صورت چمکانیں جاسکتی۔ عام طور سے کوما میں جانے والا فرد جگانے کی کوشش کے جواب میں کسی رد عمل کا اظہار نہیں کرتا چاہے اسے تکلیف دہ اعزاز سے ہی جگانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ کوما میں جانے والا فرد نہ ہی تیز شو سے جاگ سکتا ہے اور نہ ہی تیز روشنی سے بیدار کر سکتی ہے۔ اس کے سونے اور جاگنے کا نارمل سائیکل ختم ہو جاتا ہے اور وہ ارادی حرکات کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ کوما میں مبتلا فرد کو comatose کہہ کر بیان کیا جاتا ہے۔

Scale Glasgow Coma مطابق: ”کنیڈوٹن یا مختصر خیالی کے شکار فرد کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوما کی پہلی ترین شکل میں مبتلا ہے۔“

انسان کوما میں کیوں اور کیسے مبتلا ہوتا ہے؟ اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں، جن میں درج ذیل شامل ہیں: نشہ (جیسے شراب نوشی یا خفیات کا استعمال، عام دواؤں یا تجویز کردہ دواؤں کا غلط یا حد سے زیادہ استعمال) میٹابولک اہتار ملین، سینزل نروس سسٹم کی بیماریاں، عصبیاتی چوٹیں، جیسے hemiations یا، hypoxia, hypothermia, hypoglycemia یا شدید ترین چوٹیں، جیسے

جب ماں نے کوما میں جا کر

بیٹے کو جنم دیا

کبھی نئی ماؤں کے لیے ان کے نومولود بچے کے گلابی گلابی روشن روشن چہرے کی چلبلی جھلک ایک ناقابل فراموش منظر ہوتا ہے لیکن Valerie Leah کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب اس نے اپنے بیٹے آلیور کو جنم دیا اس وقت Valerie کوما میں تھی۔ Valerie کی عمر 35 سال ہے۔ وہ ماں بننے جا رہی تھی۔ جب اس کے حمل کی مدت 27 ہفتے ہوئی تو وہ سوائن فلوک کا شکار ہو گئی۔ ڈاکٹروں کی کوششیں کسی طرح وہ ماں اور بچے دونوں کو بچا لیں چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ Valerie کو کوما میں رکھ کر اس کا cesarian section کریں گے لیکن تین ہفتے بعد Valerie نے واقعتاً بچے کو جنم دیا جسے بالآخر وہ اپنی گود میں لینے کے قابل ہو گئی۔ Valerie اور اس کے شوہر کے دو بیٹے پہلے بھی تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری اصل مشکلات اس وقت شروع ہوئیں جب ہماری پوری ہی فیملی H1N1 وائرس کا شکار ہو گئی۔ Valerie سب سے آخر میں اس سے متاثر ہوئی لیکن اس کی حالت کافی تیزی سے بگڑنے لگی۔ اسے سانس لینے میں بھی مشکلات آنے لگیں تو آخر کار اسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ جب اس کا علاج کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسے مکمل طور پر مسکن دواؤں کے زہراثر لاکر لائف سپورٹ پر رکھا جائے۔

اس کے بعد بے بی آلیورسی سیکشن کے ذریعے دنیا میں آ پہنچا۔ اس کا وزن دو پونڈ دس اونس تھا اور اسے خصوصی نگہداشت کے لیے فوری طور پر سیکشن کیئر نرسری پہنچا دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد جب دبیرہ

آج بھی Ya Wen کی نظر جب کبھی سگریٹ پر پڑتی ہے تو وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے رونے اور جھلکنے لگتی ہے۔

اس نے کوما سے نکلتے ہی

ماں سے کہا: ”دفع ہو جاؤ“

ایک ماں نے پورے 41 دن تک اپنے شدید زخمی بیٹے کو ما سے باہر آنے کا انتظار کیا اور جب وہ ہوش میں آیا تو اس بد قسمت ماں کو یہ الفاظ سننے پڑے: ”دفع ہو جاؤ۔“

دراصل اس نوجوان کا بابت کرنے کا یہی انداز تھا۔ اس طرح وہ یہ جتنا ناچتا تھا کہ میں ٹھیک ہوں اور مزید ٹھیک ہو جاؤں گا۔ جو انے ہانچنے نامی یہ ماں ہسپتال میں اپنے بیٹے Joey کے بستر کے سامنے ٹھہری تھی۔ وہ دن رات منتظر رہتی کہ شاید اس کا بیٹا کچھ بولے۔ جب سے اس کے بیٹے نے کار ایکسیڈنٹ میں موت کو شکست دی تھی، اس وقت سے وہ کوما میں تھا۔ آخر قدرت کو اس پر رحم آ گیا اور 22 سالہ Joey کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس کی زبان نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

بے چین ماں جو انے ہانچنے نے بے قراری کے عالم میں آگے جھک کر بیٹے کے الفاظ سننے کی کوشش کی۔ بیٹے نے جو الفاظ کہے، وہ ماں نے سن لیے لیکن اس کی ناں، یہاں بھی بیٹے کا بھرم رکھتے ہوئے بولی: ”یہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ابھی الفاظ کو صحیح طرح ادائیگیں کر رہا۔“

Joey کا ایکسیڈنٹ جون کے مہینے میں پوسٹ ماؤتھ میں ہوا تھا جس میں اس کے سر پر شدید چویش آئی تھیں۔ اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی تھی اور سر کی ہڈی بھی۔ اس وقت وہ ہسپتال میں ہے، اس کا علاج جاری ہے۔ اس کی ماں کو پورا یقین ہے کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔

تھی کہ وہ جرمن زبان نہایت عمدگی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بول رہی تھی۔

اس کے کمی ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اس نے حال ہی میں اپنے سکول واقع Knin جنوبی کروشیائی جرمن سکسٹی شروع کی تھی۔ مقامی ہسپتال کے چیف Dujomir Marasovic نے اس حوالے سے کہا: ”ہم ابھی تک یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کوما میں کیوں گئی اور وہ بظاہر کروشیائی زبان بولنا کیسے بھول گئی۔“

دادا کوما سے نکلتے کے بعد جوان ہو گئے

ایک Frail Angeo De Luca بیمار کرنے والے اور شفیق دادا ہیں جن کی عمر 81 سال ہے۔ Biasca سونٹرو لینڈ میں رہتے ہیں۔ ایک روز وہ آلوپے کے درخت پر چڑھے

وہ اپنی عمر کے 30 ویں عشرے میں تھی۔ متاثرین کے حوالے سے تفصیلی اعداد و شمار پورے ہیں کیونکہ اکثر کیسوں کی یا تو شناخت ہی نہیں ہو پاتی یا ان کی رپورٹ ہی نہیں ہوتی۔ تاہم ماہرین کا خیال ہے کہ برطانیہ میں narcoleptics کی تعداد 30,000 تک ہو سکتی ہے۔

کروشیائی لڑکی کوما سے

جاگی تو جرمن زبان بولنے لگی
سامعہ ریلک نامی 13 سالہ لڑکی کوما میں چلی گئی اور جب جاگی تو وہ ایک دوسری زبان بول رہی تھی۔ اس کیس نے ڈاکٹروں کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ کوما میں جانے سے پہلے وہ کروشیائی زبان بولتی تھی لیکن 24 گھنٹے کوما میں رہنے کے بعد جب وہ جاگی تو وہ کروشیائی زبان بولنے کے قابل نہیں رہی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ

لڑنے یا 11 لیڈز اور پائیک کے سیکشن سینٹرز میں گزارے جہاں برین ڈیج کے مریض بھی رکھے گئے تھے۔ ان میں حاضر پولیس افسر اور افغانستان کے فوج بھی شامل تھے۔ لڑا ج بھی شارٹ فرم میوری لاس میں جٹلا ہے اور بعض معاملات میں اس میں اعتماد کی کمی بھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی ریکوری سلیپس نے اس کے لیے Kirklees Community Adult Learning Awards کی ریکوری جیت لی ہے۔

وہ ”آنی لو یو“ کہتے ہی کوما میں چلی جاتی ہے

ایک پرغلوں اور جاں نثار ماں ایک عجیب و غریب بیماری سے لڑ رہی ہے جس کی وجہ سے وہ جب بھی اپنے بچوں سے ”آنی لو یو“ کہتی ہے تو کوما میں چلی جاتی ہے۔ اس ماں کا نام Wendy Richmond ہے اور اس کی عمر 53 سال ہے۔

وہ جب بھی جذباتی ہوتی ہے یا ہنسا یا رونا چاہتی ہے تو ایک ایسی کیفیت میں جٹلا ہو جاتی ہے جسے ”waking sleep“ کہا جاتا ہے۔ یہ کیفیت اسے ہر مرتبہ ہیرالڈز کر دیتی ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے علاج میں دی جانے والی دوائیں کافی بھنگی ہیں اور ان کے لیے مقامی NHS trust بھی فنڈز فراہم نہیں کرتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے کولپسنگ سے بچنے کے لیے اپنے جذبات و احساسات کو پاک کرنا ہوگا۔

مسز رحیمہ کا تعلق پٹنمور، شیفلڈ سے ہے۔ اپنے لڑکیوں سے ہی وہ نیند کی بیماریوں cataplexy اور narcolepsy میں جٹلا رہی آئی ہے لیکن ان کی تشخیص اس وقت ہوئی جب

نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے چہرے پر پٹ پر ہاتھ پھیر کر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اس کے بعد جب اسے یہ پتہ چلا کہ اس نے اپنے کوجنم دیا ہے تو وہ بہت حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔

کوما میں رکھنے کے بعد وہ

سب کچھ بھول گئی

لڑا سلیپس کی بہتوں سے کوما میں تھی۔ اس کا دماغ ڈیج ہو گیا تھا لیکن بھادر اور باہت لڑا سلیپس نہ صرف بچ گیا بلکہ وہ موت سے لڑنے لڑنے آخر کار اسے شکست دینے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی ناقابل فراموش کہانی 2008ء میں اس وقت شروع ہوئی جب وہ Linthwaite کے علاقے Golcar میں اپنے گھر سے ایک شارٹ روٹ پر اپنی گاڑی چلائی ہوئی جا رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی زندگی گویا اوندھی ہوئی اور وہ مکمل طور پر منتشر ہو کر بھٹ گئی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور وہ کس طرح کیا کرے گی۔ ایک ہفتہ بعد 23 سالہ لڑا سلیپس کا سابقہ نہایت شدید اور طویل دوروں سے بڑا۔ اس کا پارٹنر فیلن اسے فوری طور پر پڈرز فیلڈ رائل انفمری لے گیا جہاں اس نے کئی دن گزارے جبکہ ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص کی کوشش میں لگے رہے۔ پھر انہوں نے لڑا سلیپس کو ایک تین ہفتے پر مشتمل کوما میں منتقل کرنے کا طاقت ور قدم اٹھایا تاکہ اس کی زندگی بچائی جاسکے۔ آخر کار اسے encephalitis تشخیص کی گئی، یہ وہ بیماری ہے جس کی وجہ سے دماغ میں حدت و جٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک وائرس یا انفیکشن یا پھر کائنات سے ہوتی ہے۔ جب لڑا کوما سے باہر نکلتی تو اس کی یادداشت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی۔ اب تو وہ سادہ ترین کام تک نہیں کر پا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسے چانا پھرنا اور باتیں کرنا بھی دوبارہ سیکھنا تھا۔

کراچی میں سیارہ ڈائجسٹ کے سول ایجنٹ

تازہ شماروں خاص اسلامی نمبروں اور دیگر کتابوں کی خریداری کے لئے براہ کرم

گلستان نیوز اینجنسی

فری مارکیٹ۔ فری روڈ کراچی سے رابطہ کریں۔ 773755, 7762443

Email: sayyaradigest@gmail.com

پیدلہ پور آفس: 240، مین مارکیٹ ریلوے گارڈن۔ 042-7245412

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی ترکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور ذہنی ترکیب پیش کی جائیں گی۔ ان ترکیب پر عمل کر کے نہ صرف آپ اپنے کھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کر سکتی ہیں بلکہ روزانہ ڈشز پکانے کی یوریت سے بھی نجات حاصل کر سکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین ترکیب فراہم کر سکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری ترکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email: sayyaradigest@gmail.com
www.facebook.com/sayyaradigest



(تحریر: مریم فرحان)

ذیل کی دستور میں ہم آپ کو جس خاص ڈش کی ترکیب بتانے جارہے ہیں وہ متحدہ عرب امارات کی تقریباً تمام ریاستوں میں انتہائی مقبول اور پسندیدہ ہے۔ اس کو تانا بھی بے حد آسان ہے اور ذائقہ میں اپنا جواب بھی نہیں دیتی۔

ہومس چک پیز ڈپ

HOMMUS CHICK PEAS DIP

اجزاء:

آلے ہوئے سفید چنے: 1½ کپ

ایک چائے کا چمچ

2 جوئے

3/4 کپ

لیون کاوس: تقریباً نصف کپ
کٹے ہوئے پارسلے: 2 کھانے کے چمچ کٹے
ہوئے گارلش کرنے کیلئے
توکیب: تمام اجزاء کو ہینڈر میں ڈالیں اور اچھی طرح ہینڈ کر لیں۔ اس کچر کو اچھی طرح کاڈھا اور گرم کی طرح کا کر لیں۔ پھر اس میں حسب ذائقہ نمک اور تھوڑا سا لیون کاوس شامل

توڑتا ہوا 25 فٹ گہری کھائی میں جا کر اڑا زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ 24 گھنٹے سے پہلے اس ٹرک کا پتہ بھی نہیں چلا کر وہ کہاں ہے۔ ٹیری ویس کی کیفیت سے بھی کراچی گردن سے بچنے والے حصے میں وہ عمل طور پر پیرالائز ہو گیا تھا اور کو با میں چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایس سے تھوڑا سا خیال تھا کہ ٹیری کے ہوش میں آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ٹیری کے میڈیٹوری اور اس کی بیوی میڈیٹوری سے ایک rehabilitation سینٹر میں داخل کر دیا۔ اس کے گھر والے ہر دوسرے ویک اینڈ پر اپنے فام باؤس پر لے جاتے اور اس سے باتیں کرتے اس امید پر کہ شاید جانی بچائی جگہ، شامسا قرب و جوار سے شہور میں واپس لے آئے۔ چار ہفتے قبل ٹیری کی کمی اپنے بیٹے سے بیٹے نظر نہیں آتی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ ایک مشکل سفر ہوتا ہے اور پھر ایک جگہ ہی ان کے بیٹے نے اپنی اکھیں کھول دیں اور باتیں کرنے لگا۔ ویس کا تعلق آرکنساس سے ہے۔ وہ اب اپنی بیٹی امیر سے خوب باتیں کرتا ہے جس کی عمر اس وقت 19 سال ہو چکی ہے۔ اس ایکٹیوٹ کی وجہ سے اس کے دماغ کو جو چوٹ لگی اس کے باعث اس کی یادداشت بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ سمجھ لیں کہ وہ آج بھی 1984ء میں جی رہا ہے۔ جب اس کی ماں نے اس سے پوچھا کہ امریکہ کا صدر اس وقت کون ہے تو اس نے جواب دیا: ”رونالڈ ریگن“

سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا ایکٹیوٹ جگہ کو ہوا تھا اور مینے کی 13 تاریخ تھی جبکہ جب وہ کوما سے واپس آیا تو بھی یہی دن اور یہی تاریخ تھی۔
(بھگرے سڑے میگزین روزنامہ ایکسپریس)

ہوئے تھے کہ نہ جانے کیسے وہ نیچے زمین پر گر گئے جس کے فوری بعد وہ کوما میں چلے گئے اور پورے چار روز تک کوما میں رہے۔ ہسپتال میں ان کا علاج بھی ہوا اور غالباً ایک آپریشن بھی لیکن جب وہ اس کیفیت سے باہر نکلے تو ان کی ٹنگلی میں خوف و ہراس پھیل گیا کیونکہ وہ ایک باوقار، مہذب اور متقی دادا کے بجائے ایک ایسے اوباش نوجوان بن گئے تھے جو جوان لڑکیوں کے پیچھے گھومنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جو طور طریقے اختیار کیے ان کی وجہ سے ان کی ٹنگلی کو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنی پڑی۔ انہیں ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ عیاشی کے پیچھے بالکل دادا جیٹو نے اپنی بچت میں سے تین ہزار پاؤنڈ ایک ہفتہ قید خانے میں ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر لٹا دیئے جو عمر میں ان کی پانی کے برابر تھی۔ دادا جیٹو کے بیٹے ڈینیئل نے مقامی عدالت میں درخواست دی جس کے بعد ججوں نے اس کے ڈیڑی کے دو مکانوں اور ان کے چنگ اکائٹس کو اس کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ ججوں نے یہ فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ ملزم جیٹو ذہنی کیفیت میں مبتلا ہے اس صورت میں وہ اپنے مالیاتی اور خوردنی مسائل۔

وہ 19 سال بعد کوما

سے جاگ اٹھا

ٹیری ویس نامی شخص 19 سال بعد کوما سے جاگا، اپنی ماں کی طرف گھوما جو اس کے بستر سے لگی بیٹھی تھی اور کہا: ”موم!“

اس کے بعد ٹیری نے بیٹی کا لفظ ادا کیا جس کے بعد ایک اور لفظ ”ملک“ کہا۔ ٹیری ویس کی عمر 19 سال تھی جب اس نے اپنی بیٹی کی سالگرہ منائی تھی کہ جب 13 نومبر 1984ء کو اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ وہ جس ٹرک میں سفر کر رہا تھا وہ ایک جگہ ہی گھوما اور سڑک کے کنارے لگی رکاوٹوں کو

کھورا اور بڑی الائچی کے دانے اچھی طرح کس کر لیں۔ اب چولہا بجائی آج پر دکھ کر شیرے میں سوچی اچھی طرح کس کریں۔ تکیان کر کے چولہا بند کر لیں اور فلیٹ ڈش میں پھیلا کر اوپر میوہ جات ڈال دیں۔ پھر پوسٹین شیٹ رکھ کر ہاتھ سے ایک سا کر لیں۔ تھوڑا سا ٹھنڈا ہونے پر نشان (Cuts) لگا دیں اور پورا ٹھنڈا ہونے پر نکلے سے کاٹ لیں۔

☆☆☆

(تحریر: سائبر عمران)

میٹھی عید یعنی عید الفطر پر ہم نے آپ کو نمکین اور میٹھی دونوں طرح کی منفرد ڈشز کی recipes بتائی تھیں۔ اب بادی سے عید الاضحیٰ یعنی گوشت والی عید کی۔ بقرہ عید ہو اور گوشت سے بننے والی مزیدار ڈشز نہ ہوں تا مکن یہ بات ہے۔

اس لیے اس بار ہم آپ کو دو طرح کے کباب بنانا سکھائیں گے جو دیکھنے میں بھی منفرد ہوں گے اور مزے میں بھی۔ یوں تو آپ نے بہت طرح کے سج کباب کھائے ہوں گے لیکن آج جو کباب ہم آپ کو سکھا رہے ہیں وہ ہیں roll کی شکل میں۔



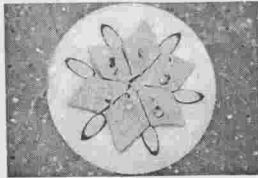
سپائسی کباب رول

Spicy Kabab Rolls

(اجزاء: سج کباب کیلئے)

توکبیب: قیسہ میں سین، مکی پیاز، پیتا، آدھی فرنی پیاز، اورک ہسن پیٹ، پاگرم مصالحہ، ثابت مرچ کی ہوئی، نمک، دہی 2 ٹمبل سپون ڈال کر ثابت دھیا تھوڑا سا ہوا ملا کر کس کریں اور گول کباب بنالیں۔ آئل میں پیاز فرنی کی ہوئی، دہی ایک پیالی، نمک، مرچ (ثابت مصالحہ چاہیں تو) ڈال کر گریبی بنالیں اور اس میں کباب ڈال کر پکھنے دیں۔ پھر ڈھک کر کیڑوہ ڈال دیں اور مزید کچھ دیر پکا لیں تاکہ اندر سے گل جائے۔ آخر میں کوئلے کی smoke دے لیں۔

تکڑے والا سوچی حلوہ



اجزاء:

چینی: 2 پیالی
سوچی: 500 گرام
مکی: 1/2 پیالی
قرق گلاب: 1 ٹی سپون
بڑی الائچی کے دانے: 2 عدد
کھوپرا سا ہوا: تھوڑا سا
میوہ، بادام: کٹے ہوئے
پیت، تاریل: کٹے ہوئے

ترکیب: پانی اور چینی سے شیر بنالیں۔ اب اس میں بچا ہوا تھوڑا سا مکی بھی کس کر لیں۔ سوچی تھوڑے سے مکی میں بھون لیں لیکن اس کا رنگ نہ بدلے۔ اب اس کو ٹھنڈا کر کے اس میں

اس عید کا لازمی جزو ہیں، تاہم اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ قربانی کا گوشت روایتی اعزاز میں پکانے کو نہ خواہن کب بھی چاہتا ہے اور نہ ہی دیگر اہل خانہ روایتی ڈشز کو پسند کرتے ہیں۔ البتہ کباب وغیرہ خوب شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ سو ہم آپ کو کباب کی ایک خاص ترکیب بتا رہے ہیں۔ جو انتہائی مزیدار اور روایتی ڈشز سے ہٹ کر بھی ہے۔

گلاوٹ کے کباب



اجزاء:

آدھا کلو
قیسہ: 2 ٹمبل سپون
سین: (توے پر بھنا ہوا)
دہی: 1 پیالی
پیاز: 2 عدد فرنی
مکی پیاز: 1 باریک پسی ہوئی
پیتا: 1 ٹمبل سپون
اورک ہسن پیٹ: 2 ٹی سپون
نمک: 1 ٹی سپون
جاہت دھیا: 2 ٹی سپون
پاگرم مصالحہ: 1 ٹی سپون
لال مرچ لٹی ہوئی: 2 ٹی سپون
(توے پر بھنی ہوئی)

اس کے علاوہ کیڑوہ اور آئل۔

کے پیش کریں۔

☆☆☆

شہنی مسٹرڈ گلاوٹ چکن



اجزاء:

مسٹرڈ پیٹ: 1/3 کپ
شہد: 1/4 کپ
میوینز: 2 کھانے کے چمچ
سیک ساس: 1 چائے کا چمچ
چکن، بلیٹ چکن: 4 عدد (دھوئیں میں کٹے ہوئے)
ترکیب: گرل کو پیلے سے گرم کر لیں۔ پھر ایک باؤل لے کر مسٹرڈ پیٹ، شہد، میوینز اور سیک ساس کو اچھی طرح کس کر لیں اور اس آمیزہ کے دو تہیں چمچ کاٹش کرنے کے لیے لٹال لیں۔ اس کے بعد بقیہ آمیزے میں چکن کو ڈال دیں اور کم از کم 30 منٹ تک بھر پیٹ کریں۔

گرل چین پر پکا سا آئل لگائیں اور پھر 18 سے 20 منٹ تک چکن کو گرل کریں۔ اس دوران چکن کا ڈرغ تبدیل کرتے رہیں۔ آخری 10 منٹ میں تھوڑا تھوڑا شہد مسٹرڈ ساس سپون سے لگاتے جائیں۔ آٹلی بنزیوں اور آلو کی باریک کٹیوں کے ساتھ پیش کریں۔

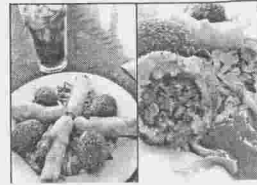
☆☆☆

(تحریر: فاطمہ قیوم)

عید الاضحیٰ کی آمد ہے اور گوشت سے بنے کھانے

لبنانی کباب

تیل: 2 چائے کے کچے
 قیہ (باریک): 1 عدد
 پیاز (باریک کٹا ہوا): 1 عدد
 اورک: 1 کلو
 ہری مرچیں (کٹی ہوئی): 6 عدد
 کچا پیٹ: 1 کچ
 گرم مصالحہ: 1 کچ
 سرخ مرچ: 1 چائے کا کچ
 نمک: حسب ذائقہ
 بھنا اور پازیرہ: 1 چائے کا کچ
 اجزاء (پیشوری کے لیے)



اجزاء:

میدہ: 2 کپ
 مکھن: 4 اونس
 نمک: 1 چائے کا کچ
 گوند سے کیلے
 قیہ: قیہ میں سارے اجزاء ملا کر
 chopper میں چیں لیں اور اس کے لیے لیے سیخ
 کباب بنائیں۔ اب ان کبابوں میں دو پیچ آئل میں
 پکا سا فرنی کر لیں۔
 پیشوری کیلے میدہ میں مکھن اور نمک ملا لیں
 یہاں تک کہ وہ crumb کی طرح ہو جائے۔
 اب ٹھنڈے پانی سے گوندھ لیں۔ اسے تھوڑی
 دیر کے لیے فریج میں رکھیں۔ اب پیشوری کو تیل
 کر تین تین انچ موٹائی کے ٹکون کاٹ لیں۔ اب
 کباب کو ہر ٹکون پر رکھیں۔ پانی سے ٹکون کے
 کنارے غم کر لیں اور انہیں رول کر لیں۔ اب
 سارے رولز کو بلیٹک غرے میں رکھ دیں اور
 اٹھ سے 1000 °C پر بیک کریں یہاں تک کہ وہ گولڈن
 براؤن ہو جائے۔

توکب:

تمام مصالحوں اور قیہ کو چٹائی میں
 ڈالیں اور پانی خشک ہونے تک چنے کو پکنے دیں۔
 قیہ غلط ہو جائے تو اس میں آلو، مرچ اور میکرونی
 ڈال کر گرہ بند کریں۔ اب کباب کی شکل دیں۔
 کبابوں کو پہلے اٹھ اور پھر ریڈ کرمز میں پکھنیں۔
 ان کو تیل میں جل لیں۔ گولڈن ہو جائیں تو کچپ
 کے ساتھ سرو کریں۔



عارف صبح خان

بنے تو چھنے

مسکرانا اور ہنسا سحت کیلے مفید ہے مگر بعض اوقات ہنسی دیاں بھی بن جاتی
 ہے اور انسان چاہ کر بھی اس بے وقت کی ہنسی کو روک نہیں پاتا، خواہ مخواہ میں
 مفت کی شرمندگی کئے پڑ جاتی ہے۔ خاصی دیر بعد اپنی حماقت کا احساس ہوتا
 ہے مگر خود کو کونے کانے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔

ظہور مزاح کی چاشنی لے، خواہ مخواہ بننے کے نقصانات واضح کرتی کلکتہ خیر

تحقیق بتاتی ہے کہ ہانگوں کے پاگل پن کی
 بڑی وجہ اخبار بنی ہے۔ اخبار کے دو صفحات تو
 جرائم سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اخبار کا بڑا
 حصہ اشتہارات اور سیاستدانوں کے بیانات
 پر ہوتا ہے جبکہ باقی کے دو صفحات میں فلمی
 اداکاروں اور گلوکاروں کی خبریں ہوتی ہیں اور باقی
 اخبار شفاشی کالموں سے اٹا پڑا ہوتا ہے۔ اخبار
 پڑھنے کے بعد سوائے ٹینشن اور ڈپریشن کے کچھ
 ہاتھ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل، پاگل ہوئے
 کے بعد بھی اپنی عادت ترک نہیں کرتا اور اخبار
 پڑھتا رہتا ہے۔ اگر وہ اخبار کی جگہ کتاب پڑھنے کا
 عادی ہوتا تو کہیں ڈھنگ کی نوکری کر رہا ہوتا اور

پاکل خانے کے بجائے گھر میں عزت کی زندگی بسر کرتا۔ رضیہ بیٹ کے ناول پڑھ لیں، دنیا حسین اور نگین نظر آتی ہے۔ تمام خواتین کا ادب محبت کی چاشنی سے لبریز ہے آپ جس ادیب شاعر کو پڑھ لیں یوں لگتا ہے زندگی میں محبت اور عشق کی پھوار ہو رہی ہے آپ کے چہرے پر دلآویز مسکراہٹ آتی ہے اور کبھی کبھی تو محبت کا اظہار گہرا ہوتا ہے کہ آپ بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ پاگلوں کے ذہن میں البتہ ایک بات اچھی ہے کہ وہ خود بخود ہنسنے لگتے ہیں انہیں ہنسانا نہیں پڑتا کیونکہ کسی کو ہنسانا بذات خود ایک مشقت ہے جبکہ عام انسانوں کو ہنسانا پڑتا ہے کیونکہ وہ از خود ہنسنے لگتے ہیں۔ ویسے ہنسنے کے لیے کسی انکسار سزا کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ”ہنسا“ تو خود ایک انکسار سزا ہے۔

مغرب میں سردی بہت ہوتی ہے وہاں کے انسانوں کا خون اسی لیے جم رہا ہے اور کبھی جمجھ رہتی ہے۔ ہنسنے کے معاملے میں سارے انگریز پنج واقع ہوئے ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگ جتنا دوتے ہیں اس سے زیادہ ہنستے ہیں۔ اکثر اوقات جو بندہ آپ کے سامنے ٹھکسلا کر ہنس رہا ہوتا ہے وہ دس منٹ بعد ہاتھ روم میں جا کر رو رہا ہوتا ہے اور جو بندہ آپ کے سامنے ہلک ہلک کر رو رہا ہوتا ہے وہ رفع حاجت کے بہانے بیت الخلاء میں جا کر ہنس رہا ہوتا ہے کہ واہ کیا او بتایا..... ہمارے ہاں ”الو“ بیوقوف کو اور ضرب میں ٹھکنے جانور کو کہا جاتا ہے۔ معلوم نہیں جی کیا ہے مگر یہ جیج ہے کہ الو بڑا فضول اور سڑیل جانور ہے۔ وہ واحد جانور ہے جسے ہنسنے سے بچنا ہے مگر ہمارے ہاں ہر شخص دوسرے کو الو بنا کر خوش ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو ہنسنے کی خاطر الوؤں جیسی حرکتیں کر گزرتے ہیں اور اتنا ہنستے ہیں کہ ان کی ممانعت جانوروں میں آنے لگتی ہے۔

ہنسنے کا پہلا نقصان تو یہ ہے کہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ جو لوگ کل بہت ہنس رہے تھے آج منہ لٹکے بیٹھے ہیں۔ لگتا ہے نماز جنازہ پڑھا کر سیدہ دفن آگئے ہیں۔ بڑا چھوکر بھائی کیا بات ہے تو فرمائیں گے..... بس کچھ دل مردہ ہو رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ بھائی دل مردہ ہو رہا ہے تو زیادہ سے زیادہ ہنسی ہوگا کہ مر جاؤ گے اور ہم کل تمہارے قل پر پتے چار رہے ہوں گے۔ شکر کرو کہ میرے مردہ نہیں ہوا۔ پیچھے سے آواز آتی ہے..... ”اچی وہ تو پہلے ہی مردہ ہو چکا تھا۔“ اس کے ساتھ ہی بریکوں والی ٹی کی آواز آتی ہے اور دائیں بائیں سے کھٹی کھٹی ہنسی کی آوازیں آگئی ہیں۔ یہ ایسی آوازیں ہیں کہ کوئی رولٹ یا پتلا سٹیج سے تو اس کی ہنسی چھوٹ جائے۔ کھی کھی کھی..... پچس پچس..... ہی ہی ہی..... ہو..... ہا..... ہاؤ..... ہے ہی!! جس بندے نے مردہ ولی کا ذکر پچھڑا تھا اس کے چہرے پر غصہ ہے لیکن ان آوازیں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بندہ ہاتھ میں پیچھے دھٹ اٹھائے اصلی جرم کو ناک رہا ہے۔ لوگ اسے کھولنا اور جہنم بھننا دیکھ کر بے حال ہو رہے ہیں۔ کسی ایک ٹی کی ہنسی کا فوارہ ابل پڑتا ہے اور پھر قہقہوں کا طوفان اٹھ اٹا ہے۔ قہقہوں کی آوازیں ہاں کے کاؤن تک پہنچتی ہے تو تھوڑی دیر میں ڈپلان کی خرابی پر فوس آ جاتا۔ ہاں کو بالکل اچھا نہیں لگتا کہ وہ تو بیوقوفوں کی طرح سارا دن میٹنگیں بھگتاے، احکامات جاری کرے، قانون پر سائن کرے، فون پر مختلف کمپنیوں کو کال کرے اور اس کے ماتحت کام کے بجائے ہنسی مذاق کریں اور ڈپلان چھوڑ کر انجوائے کریں۔ چنانچہ فوس میں واضح طور پر درخ ہوتا ہے کہ دفتری اوقات میں

ہنسنے سے..... کچھ دن کے لیے سب کی ہنسی کو بریک لگ جاتی ہے مگر کب تک..... ماتحت عہدہ نامی کا دور نامہ میں فوس لیتا ہے..... ہاں کی عدم موجودگی میں ہنسی کا سارا خزانہ لٹا دیا جاتا ہے اور سب ہاں کی احتیاط شخصیت پر دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ہر شخص بساط کے مطابق ہاں پر جھلے کتا ہے جبکہ بعض ہاں پر لٹیفے کھڑکراتے ہیں۔ یہ وہ شخص لٹیفے ہوتے ہیں جو صرف ہنسانے کے لیے ہوتے ہیں انہیں کسی بھی طرح احاطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ آپ صرف لٹیفوں کی لطافت پر سوچ کر ہنس سکتے ہیں۔

ہنسنے کا ایک اور بھی نقصان ہے۔ وہ صرف ہنسنے والوں کو ہوتا ہے یعنی یہ کہ وہ بہت جلد موٹا پے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چٹکے عموماً سڑیل اور چڑچڑے پائے گئے ہیں۔ یہ لوگ بہت کم ہنستے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر کی خراب ہوا باہر نہیں نکلتی لیکن صحت مند یا کول منول لوگ بہت ہنستے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی تازہ ہوا اندر مقدار میں ان کے اندر پہنچ جاتی ہے۔ شاید اسی لیے ان کے اعضاء کھل جاتے ہیں۔ جب ایک بار ہنسنے کی عادت پڑ جائے تو ہوا اندر جا کر کھل جاتی ہے اور آپ کی سائریں کو شہید نقصان پہنچاتی ہے۔ کسی سوکھے سڑے کو آپ مرل یا تیلی کہہ دیں تو وہ فوراً بکنا بکنا شروع کر دے گا لیکن آپ کسی سونے کو ”دھو“ کہیں تو وہ برا متائے بخیر ہنسنے لگے گا.....

البتہ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ وہ اپنی ہنسی کتنی پر ہنس رہا ہے یا آپ کی ہنسنے کی پڑائی پر ہنسنے کا نقصان ہے بھی ہے کہ آپ میں درگزر کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ لوگوں کا ہر دوا ہنس میں سمہ جاتے ہیں کیونکہ آپ ہنس کھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کافی ہے، زندگی آتی جانی ہے اور

لڑنا ہے سستی ہے۔ چنانچہ آپ زیادہ کھانے کمانے کی طرف مائل نہیں ہوتے بلکہ اس طرح آپ کی غیرت بالا خرسو جاتی ہے۔ آپ کا جوش مرجاتا ہے اور ادا خواہ جاتی ہے۔ آپ ہر ایک کی بری بولی سننے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ہنسنے کی وجہ سے کوئی آپ کی اہم بات کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ ایک دوست نے دوسرے دوست کو آکر بتایا کہ یار تمہاری بیوی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ دوسرے دوست نے کہا یار مذاق نہ کرو۔ وہ اتنی جلدی اللہ کو پیاری نہیں ہو سکتی۔ پہلے دوست کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بولا کہ یار وہ تمہیں پیاری نہیں تھی اسی لیے جلدی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ تو افسوس کا مقام..... مگر یار کتنے خوش قسمت ہو کہ اب اپنی پسند کی دوسری شادی کا موقع مل جائے گا..... ویسے یار یہ تمہیں دل سے تو پسند نہیں تھی ناں..... چلو اللہ جو بھی کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ کاش! یہ موقع مجھے بھی ملتا لیکن میری قسمت ایسی کہاں..... یہ کہہ کر اس نے اپنے دوست کو ایک رنڈے کا قصہ سنایا اور ہنسنے پھٹے پھٹ ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بیوی مرنے کے لطفے سناتے رہے۔ شام کو دوست کو یاد آکر وہ تو اپنے دوست کو بتانے آیا تھا کہ اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔ دوسرے دوست نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا کہ یار تمہاری بیوی کی بچ مچ کر مٹی ہے۔ مگر پہلے دوست نے یقین نہ دیا کہ ضرور رحم مذاق کر رہے ہو۔ بڑی مشکل سے دوست کھر چلنے پر آمادہ ہوا۔ مگر جا کر دیکھا تو بیوی واقعی مر چکی تھی۔ پہلا دوست بچوں کی طرح رونے لگا..... ہائے یہ تم نے کیا کیا..... تم مجھ سے پہلے چلے گئیں..... میں تو اکلا رہ گیا۔ ارے اب لوگ مجھے بھی ”رنڈوا“ کہیں گے۔ یہ تو بالکل گالی جیسا لگتا ہے۔ میں رنڈوا نہیں بننا چاہتا۔

ارے کون کون مجھے سہارا دے گا، کون میرے بچوں کو پالے گا؟؟؟ ارے..... کوئی؟؟؟ دوست کی فریاد ایسی تھی کہ دوسرا دوست اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور دوست کی فریاد سن چکی ہوئی خواہش پر ہنسنے پھٹے اس کے پیٹ میں ٹپ ٹپ لگنے لگوں نے بہت بار مٹایا اور مرحومہ کے چاروں بٹے کتنے بھائی اسے پاگل خانے داخل کر آئے۔ پاگل خانے آکر وہ ڈاکٹروں کی جھب بھائیں سناتا تو اسے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ بار بار ڈاکٹروں سے کہتا کہ بھائی مجھے خدا کے واسطے چھوڑ دو۔ میں بالکل ٹھیک اور صحیح اللہ ماع ہوں تو یہ بات سن کر ڈاکٹر ہنسا شروع کر دیتے اور کہتے..... شروع میں سب ایسے ہی کہتے ہیں بعد میں اپنے ساتھیوں میں گھل مل کر باہر جانے کی خند چھوڑ دیتے ہیں۔ دوست کو اپنی ہنسی کی وجہ سے اکتالیں دن پاگل خانے میں رہنا پڑا کیونکہ اس کا دوست اپنی بھلی بیوی کا چالیسواں مناکہ اور دوسری بیوی کے ساتھ سہاگ رات گزار کر مچ اٹھے یہ پاگل خانے بھاگا چلا آیا اور بولا کہ یار معاف کرنا میں جلیبی بیوی کے غم اور دوسری بیوی کی نگرش میں بھول ہی گیا۔ وہ تو رات کو میری نئی دہن نے بڑے پیار سے کہا کہ اب میں آگئی ہوں..... اب تو کوئی آپ کو ”رنڈوا“ نہیں کہے گا ناں؟ یہ سن کر مجھے اسی وقت تم یاد آ گئے لیکن وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں جھیں پاگل خانے سے نکلوانے آتا۔ چلو آؤ..... آج میرا ویسہ ہے۔ پہلے دوست نے کہا کہ یار میں تو پہلے ہی بنوڑ تھا۔ یہاں آکر تو ہنسا میری بالی بن گیا ہے۔ یار یہاں پاگلوں کے ساتھ ڈاکٹر بھی بڑا ہنساتے ہیں۔ بہر حال تمہارا سہ لیے بھی خوشخبری ہے۔ میں بھی مقلد ہو گیا ہوں۔ میری بیوی خلع کے کر بلی

گئی ہے۔ میں بھی اسی ہنسنے دوسری شادی کر رہا ہوں۔ لیکن کس سے؟ پہلے دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔ پاگل خانے کی لیڈی ڈاکٹر سے..... ہنسا جڑا بھی ہے اور سزا بھی..... لیکن یہ ہے کہ ہنسنے کا خیزا ضرور چھٹتا پڑتا ہے۔ کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ آپ خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں اور ٹپ ٹپ آپ کو کوئی دلچسپ واقعہ یا اپنی محنت یاد آ جاتی ہے جسے یاد کر کے آپ بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں اور یہ ہنسی اس طرح پھوٹی ہے جیسے گھونڈ پھوٹا ہے کیونکہ ہنسی غیر ارادی فعل ہے اس لیے بے موقع اور بے وقت ہنسی کا ریلہ بہر نکلتا ہے۔ بعض دفعہ تو انتہائی نامناسب موقع پر آپ ہنسی کے پیرا اثر آ جاتے ہیں اور جو بھی آپ کو سمجھتی ہنسی کا ادراک ہوتا ہے۔ آپ اسے بریک لگانے کی سعی کرتے ہیں مگر بریک لگانے سے ہنسی کا میوزک ایک دم بے ڈھنگا ہو جاتا ہے۔ آپ ہنسی روکتے ہیں اور ہنسی ایک ایسی مستحکم شکل اختیار کر لیتی ہے کہ دوسرے دانستہ متوجہ ہو جاتے ہیں اور عام طور پر لوگوں کا ذرا بے لگاؤ، ٹھٹھک اور غلطون ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ میں مفت کی شرمندگی لگے لگا جاتی ہے۔ آپ کو غاصی دیر بعد اپنی محنت کا احساس ہوتا ہے اور آپ خود کو کونے کونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ خاص طور پر آپ کا دل چاہتا ہے کہ اسے چھپے چھپے پری کاٹ لیں کہ اسی پر ہنسی نمودار ہوئی تھی لیکن آپ کے اختیار میں یہ بھی نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کی دورنگ کیفیت پر حیران اور محظوظ ہو رہے ہوتے ہیں۔ اچھا خاصا تماشہ لگ جاتا ہے، کوئی آپ کو دوباہ یا سن چلا سمجھ کر آٹا آپ پر ہنسنے لگا ہے۔ اس کے پاس ہنسنے کا جواز ہوتا ہے مگر آپ ہنسنے کی وجہات بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں،

اچھا بھلا آپ کا دقتار اور عجب دیدہ بہ منی ہو جاتا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ آپ تو جوان ہی ہوں۔ آپ ایک اوجیز عمر آدمی یا پائیلٹ بزرگ بھی ہو سکتے ہیں۔ ذرا اس لمحے کے متعلق سوچئے کہ جب آپ..... آپ ہی آپ مکرر دیتے ہیں تو لوگ آپ کے بارے میں کیا کیا سوچتے ہو گئے۔ پہلا خیال تو یہی آتا ہوگا کہ آپ ضرور کوئی خطی یا غری بیڑے میں ہیں یا ممکن ہے کہ آپ کسی پانی کی عمر کی لڑکی کو چھپچھپا کر رہے ہیں..... ایسے سن کر کوئی کہے پوچھ بیٹھے کہ..... کیوں میاں جی کیا چکر ہے..... نئی شادی کا ارادہ ہے کیا؟؟؟؟؟ تو بتائیے اس وقت آپ کی حالت کیا ہو گئی؟ عین ممکن ہے ہنسی تو راقبہ کا روپ دھارے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی عزیز یا دوست کی مرگ میں شامل ہیں۔ سامنے آپ کا کالا جھنک دوست سفید براق کفن میں ابدی نیند سو رہا ہے، آپ اپنے دوست کے تمام سیاہ کارناموں اور سابقہ ناقابل بیان باغی سے واقف ہیں۔ دوست کی ماں روتے روتے ہارے ہار کہتی ہے..... ارے دیکھو تو میرے بیٹے پر کیا نور آ رہا ہے۔ جتنی قضا بھی تو اتنی ہی عمر میں مر گیا..... میرا بچہ بڑا نامزدی پر تیز نگار تھا۔ کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ دفتر سے سیدھا گھر آتا اور گھر سے سیدھا دفتر جاتا تھا..... ہائے خدایا تو نے میرے مصوم بچے کو کھانا لیا..... ابھی تو اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ جملے سن کر بے ساختہ آپ کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ بات تو واقعی ہنسنے کی ہے مگر صورتحال رونے کی ہے۔ اس لیے یہ ہنسی آپ کی بے عزتی کا سامان کر دیتی ہے۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے کسی انتہائی قریبی رشتہ دار کا جنازہ پڑا ہے مگر شری

قسمت آپ کو کوشش کے باوجود روٹا نہیں آ رہا۔ آپ مسلسل کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ایک آدمہ آنسو ٹپک پڑے۔ آپ حسرت سے اپنی خالہ کا جنازہ دیکھ رہے ہیں جنہوں نے بڑی محبت سے آپ کو پالا تھا۔ اچانک آپ کو اپنی خالہ کی رقم بوڑنے کی بات یاد آ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے جملہ عیوب یاد آنے لگتے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کیونکہ خالہ میں عیوب کا تناسب زیادہ تھا۔ اچانک خالہ کے دانت میں پھنسی ہوئی پوٹی پر آپ کی نظر پڑتی ہے اور آپ کو خالہ کا پیٹھ بین یاد آ جاتا ہے۔ خالہ مرنے سے پہلے ہنسی چاٹ کر کے گئی ہیں۔ یہ سوچتے ہی آپ کو خیال آتا ہے کہ افسوس خالہ اپنے سوئم دسویں اور چالیسویں کے کھانے نہیں کھا سکیں گی اور قبر میں بڑی کڑھمی رہیں گی کہ ہاتے میرے ہی نام کی دھمیں پک رہی ہیں اور میں ہی نہیں کھا سکتی۔۔۔۔۔ یہ خیال آتے ہی آپ کو ہنسی آ جاتی ہے اور یہ ہنسی ناان شباب ہوئی ہے کیونکہ ہنسی کے ساتھ ہی خالہ کے پیٹھ پن کے بہت سے واقعات گدگدانے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہنسی کا ولیم بھی بڑھنے لگتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے نتائج و عواقب مرتے دم تک آپ کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کسی فوٹگی میں تعزیت کے لیے پہنچتے ہیں۔ کوئی شخص روتے روتے ایسی بات کہہ دیتا ہے جو بھنے کا محرک بن جاتی ہے۔ آپ کو جو گئی ہنسی آتی ہے آپ پوری قوتوں سے اس بد بخت کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جتنا ہنسی کو دبا تے ہیں وہ اتنی ہی بے مہار ہوتی چلی جاتی ہے اور اتنی منہ زور ہو جاتی ہے کہ منہ پر ہاتھ رکھنے کے باوجود کھی کھی ہو ہو، گھر گھر گھر کی آواز پیدا کر کے آپ کا راز فاش کر دیتی ہے۔ آپ بعد میں خفت

اور ذلت اٹھاتے تھک جاتے ہیں۔ ایسے غناک ماحول میں آپ کی ہنسی جلتی پرتیل کا کام کرنی ہے۔ لوگ خشکیں لگا ہوں سے دیکھتے ہیں آپ کی ہلک ہنسانی ہوتی ہے۔ لوگ محفلوں، تقریبات، گلیوں، بازاروں، گھروں میں اس بات کا چچا کرتے ہیں اور شیطان سے زیادہ آپ پر نفرتیں بھیجتے ہیں۔

ہنسی سے کسی طرح فرار ممکن نہیں۔۔۔۔۔ غصے سے فرار ممکن ہے مثلاً آپ کو شدید غصہ آتا ہے اور آپ کا دل چاہتا ہے کہ غصہ دلانے والے شخص کا سرمہ یا قیہ نہ سکی، مجرہ ضرور بنادیں مگر جب آپ غصے میں لال پیلے برہمی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں تو غصہ دلانے والے سے کوئی معطلہ چیز حرکت سرزد ہو جاتی ہے جس سے آپ کی ہنسی نکل آتی ہے۔ آپ فی الفور ہنسی پر قابو پانا چاہتے ہیں اور دوبارہ غصہ بحال کرنے کی جگہ و دو کرتے ہیں لیکن ہنسی غصے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ ہنسی کا فوارہ آپ کے لبوں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ آنکھوں کے لال لال ڈورے مکرانہوں کے جھولے جھولے لگتے ہیں حالانکہ آپ کی پیشانی مارے غصے کے شکن آلود ہوتی ہے اور منہ سے کف جاری ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جو گئی ہنسی کا غلبہ ہوتا ہے آپ بے بسی سے ہنس رہے ہوتے ہیں۔ یوں غصہ دلانے والے کو ڈھیل مل جاتی ہے اور وہ آپ کو پکھڑے دے کر نو دو گیارہ ہو جاتا ہے یا پھر نہایت ڈھٹائی سے آپ کے ساتھ ہنسی کے موتی لٹانے لگتا ہے۔ آپ ہونٹ ہنچنے کے باوجود ہنسنے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح غصہ دل کا دل میں رہ جاتا ہے اور بعد میں آپ بُری طرح سے خود کو کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں کہ ہنسی کی وجہ سے آپ کا ہمیشہ کے لیے رعب بھی گیا اور غصہ اُتارنے کا نادر موقع بھی!! نہ آپ ہنستے نہ اس



گھسان کارن پڑا موجب سچے جائز نظر آئیں کہاں
خوب جانتے ہیں وہ جو کی ٹائی کرتے رہے
وقت فصل گندم کے خرٹے انہیں نظر آئیں کہاں
اوروں کے لیے جو کارٹوں کی بیج بچھاتے ہیں
خود پھلوں کی منتراکتے ہیں پھول ان کیلئے آئیں کہاں
جھوٹ فریب افزائی کا جہاں کھیل رچا ہو
انسانیت کی تدلیں ہوتی رمت کے خرٹے آئیں کہاں
قول وصل میں فرق لوگ جھوٹ کی مالا جیتے ہوں

آپس میں اعتماد بھروسہ لوگوں میں پھر آئے کہاں
جس دہس میں جعلی پیر اور جعلی عالم بیٹے ہوں
پبلک میں اخلاق کا بنیٹن تانپتہ اسلام کی خوشبو آئے کہاں
میڈیا میں جہاں کھٹے دالی کالی بھیڑیں بستی ہوں
کہتے ہوئے ان جڑوں کے بندوں میں ضمیر کی چین آئے کہاں
قیادت جھوٹ پلندہ کرپشن ان کا دھندہ ہو
اپنے دامن واغدار ادول پہ کچھ پھینکتے ہیں
ہر دن جو بیٹے وعدوں پر پبلک کو دھوکہ دیتے ہیں
ہر عمل میں ان کے خیانت دغا فریب جھگٹے ہیں
بے بصیرت ہیں یہ لوگ خود کو دھوکہ دیتے ہیں
ایسی منفی قیادت میں ایمان کی حرارت آئے کہاں
(قاسمی محمد یوسف بسطط)

محبت حرف اول ہے

محبت حرف اول ہے، محبت حرف آخر ہے

محبت زندگی کا روشنی کا ستارہ ہے

محبت بے کنارہ ہے

محبت خالق اول کی بستی کا

نظارہ ہے، اشارہ ہے

محبت نور اول ہے، محبت نور آخر ہے

شاتم رسول (علیہ السلام) کو مفت مشورہ
لاکھوں کی بے سیکڑی ہر "پسنے خاں" کو
پھر بھی بچا سکے ہے نہ وہ اپنی جان کو
یہ مفت مشورہ ہے ہر اک حکمران کو
قابو میں رکھو ذرا اپنی زبان کو
(میر وقار عزیز بدراولپنڈی)

غزل

خداں بنا دیا کبھی گریاں بنا دیا
دو دن کی زندگی نے پریشاں بنا دیا
اللہ رے سوز غم کی مسلسل نوازشیں
ہر داغ دل کو رنگ چھاننا بنا دیا
حاضر تھے وہ تو روح دریاں حیات تھے
غائب ہوئے تو موت کا ساماں بنا دیا
اللہ رے زندگی کی پریشاں خیالیاں
دل کو حریف زلف پریشاں بنا دیا
رکھ لی جنوں نے آہل پائی کی میری لاج
کارٹوں کو رنگ حسن گھٹاں بنا دیا
اللہ چشم بخود کا اثر امتیاز
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں بنا دیا
(ایس۔ امتیاز احمد - کراچی)

احوال وطن

فصل گل میں نوح کناران رنجیدہ ہیں بلبلیں
خزاں رسیدہ چمن میں صبح بہاراں آئے کہاں
موسم برشک گرم و خشک ہواؤں نے چاٹ لیا
برسات بھرے باد آسمان پہ نظر آئیں کہاں
ان میں نام کے چانازوں کی ٹولیاں نظر آتی رہیں

میں آنے والے سہانے دنوں کے سنے لئے وہ
سب کو چائے چیش کرتی ہے۔ سہانہ خواتین میں
سے ایک ٹھوڑی تمام کی پیار سے ناقدانہ جائزہ لیتی
ہے۔ خاتون کے اندر سے اپنے اور پر فہم کی ملی جلی
خوشبو آ رہی ہے۔ خاتون ہونے والی بہو کو حاشا
کرنے کے لیے دھڑا دھڑا انگریزی کے الفاظ کا
استعمال جاری رکھتی ہیں اور اسی دوران انگریزی
لفظ کا لفظ اتنا غلط بولتی ہیں کہ لڑکی کو بھی آ جاتی
ہے۔ لڑکی ہنسی کنٹرول نہیں کر سکتی کہ اس کے لیے منہ میچ کر
لیتی ہے جہاں اسے پر فہم کی کم اور پسنے کی زیادہ
بدول آتی ہے۔ وہ ہڈ پڑکتے ہوئے کو بھی سے ایک
دوسرے میں بیست کرتی ہے لیکن اس عمل سے
ہنسی رخساروں اور آنکھوں میں ضدی بچوں کی
طرح پھیل گئی ہے اور دفعتاً ہنسی تمام سرحدوں کو توڑ
کر باہر نکل آتی ہے۔ ہونے والی ساں اچانک
اپنے اوپر ہنسنے سے کھینٹی ہو کر خشکی سے چہرے
جھٹکے سے چھوڑ دیتی ہے۔ اے اے! کیا میرے سر
پر سینگ دیکھ لئے جو ہنسی رہی ہے۔ ارے بھی
ہنسی نہیں کرتی یہاں شادی..... کسی لڑکی سے بے
شرمی سے ہنسی رہی ہے تو یہ تو ہے!! یہ کہہ کر وہ بے جا وہ
جا!! گھر والے لڑکی کو اور لڑکی کو کوئی رتہ جاتی
ہے۔

بہر حال ہنسی جسے لوگ چہرے کا حسن اور
اخلاق کی جان قرار دیتے ہیں اکثر اوقات آپ کو
اس بری طرح پھنسا دیتی ہے کہ آپ کے لیے
عذاب جان بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہنسی آؤٹ
آف کنٹرول رویہ ہے اور اکثر بلا اجازت یا
بلا ضرورت آ جاتی ہے اور جب آ جاتی ہے تو جاتی
نہیں..... مگر جب جاتی ہے تو کھاڑا کر کے ہی
جاتی ہے۔

مسکرائے

ایک وکیل نے اپنے موکل کی وکالت کرتے ہوئے
جج سے کہا حضور والا! میرے موکل کا مقدمہ بعینہ
اس قسم کا ہے کہ جس قسم کے فلاں فلاں مقدمات
تھے۔ ان مقدمات کے فیصلوں کی مثالیں آپ
قانون کی کتاب کے صفحہ نمبر 419 اور 420 پر
ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔
جج نے قانون کی کتاب کھولی اور وہ صفحات نکالے۔
ان صفحات کے درمیان سوسو کے چار نوٹ رکھے
ہوئے تھے۔ جج نے نوٹ احتیاط سے جیب میں
رکھتے ہوئے متانت سے کہا: ان مقدمات کے فیصلے
کے لیے اس قسم کی تین اور مثالیں پیش کی جائیں۔

☆☆☆

یوٹی شو پر سے: کہاں چار ہے ہو؟
شوہر: خودی کرنے۔

یوٹی: زیورات کا ڈبہ کہاں لیے چار ہے ہو؟
شوہر: میں کوئی بیوقوف ہوں جو دنیا سے خالی ہاتھ
چلا جاؤں۔

☆☆☆

چالاک دن کے دام میں پھنستے!!

ہنسی کا دورہ اس وقت بھی ضرور پڑتا ہے جب
کسی لڑکی کو دیکھنے کے لیے لوگ آتے ہیں۔ یہ
ایک عجیب و غریب صورتحال ہوتی ہے۔ لڑکی خوش
بھی ہوتی ہے اور روز روز کی رونمائی سے پریشان
بھی..... پھر دیکھنے والے بھی اکثر جھبے لگ آتے
ہیں تاہم لڑکی کی خواہش ہوتی ہے کہ جو بھی پارٹی
آئے وہ اسے پسند کر کے "ہاں" کر جائے۔ لڑکی
بڑی متانت سے آتی ہے۔ گلابی چہرے پر گلابی
دودھ اور دودھ بچ مشرق کا بیتا جاکا شاہکار
لگتی ہے۔ چہرے پر دروازی مسکراہٹ اور آنکھوں

محبت اک ستارہ ہے، محبت روز اول سے
محبت روزِ محشر تک، سہارا ہی سہارا ہے
کبھی فرہاد اور بخشنوں، کبھی کسی کبھی بھوں
کبھی راجھا کبھی لٹا، کبھی پرہیز اور شیریں
بی بن کر کشتناتی ہے، حسین کھات لاتی ہے
جب ی گدگداتی ہے.....
سہانے گیت گاتی ہے، کبھی نغمے سناتی ہے
کبھی پکڑوں کی جھار سے.....

کبھی الفت، رفاقت ہے
کبھی رحمت، صداقت ہے
محبت وصلہ دیتی ہے، دیتی ہے یہ مگر ابھی!
کبھی بے باک کرتی ہے
کبھی جری بناتی ہے، یہ سوز و غم کھاتی ہے
ہمیشہ مکرراتی ہے
زمانے کے غم خاتمہ.....
ہمیشہ مکرراتی ہے
محبت حرف اول ہے، محبت حرف آخر ہے

(ڈاکٹر سید ضحیم احمد)

غزل

جب بھی وہ یاد مجھے آیا ہے
دل میں اک درد ابھر آیا ہے
بے چینی، آسیب زدہ ماحول
اس شہر میں کبھی کچھ پایا ہے
کڑی دھوپ کا سفر ہے لوگو!
چادروں طرف نہ کوئی سایہ ہے
رات کے پچھلے پھر کی خاموشی
پھر اپنا کوئی مجھے یاد آیا ہے
کتنے ظالم لوگوں سے واسطہ پڑا میرا
خود ہی قتل کیا خود ہی کدھا بھی دیا ہے
سولی پر چڑھا دیا مجھے لوگوں نے
منصف اپنے شہر میں نہیں کوئی نظر آیا ہے
فصل شہر پہ جا کے کون باہر دیکھے
شہر کے اندر نہ مجھے کچھ نظر آیا ہے
(دکھنتر، راولپنڈی)

غزل

بنا قعر سبھی چاہتے ہیں یہاں سرفرازی کیا
وہ پیر ہوں مرید ہوں یا نمازی کیا

محبت میرا آہنگ ہے، محبت سب کا آہنگ ہے
کبتیں یہ پھول سی کوئل.....
کبتیں یہ پیش و منگ ہے
محبت ایک لغت ہے

عشق تو ہے معنائے جذبہٴ آفاقیت
پھر اس میں حقیقی کیا اور مجازی کیا
لذت اہل سے ہو نہ سکا آشنا جو خضر
چاہیے تھی اسے الکی عمر درازی کیا
سکون لمحہ تو ترے اعمال میں ہے پنہاں
زین یہاں کی کیا اور خاک مجازی کیا
آتا نہیں لمحہٴ ہجر و وصال دوبارہ کبھی
غمے دلوں کو دینی حیثیت امتیازی کیا
علم وہ جو دل میں سائے پھر عمل بن جائے
بھلا کرے عارضی یادداشت علم کی غمازی کیا
کمال نہیں ایمان و یقین اگر تو عبادت کسی
اندیشہ ہائے دل ترا اور ظاہری پاک بازی کیا
دولت علم نے ہی بخشی ہے آہ سحرگاہی
دل عطار ہو روی ہو یا رازی کیا
(عصمت اقبال مین، منگلادھیم)
دیکھرا ورتم

میری آنکھوں کا تارا
میرا تار پیرا
مرے دل کا سرور
مجھے کر دے سرور
اس کے ہونٹوں کی ہنسی
غم کی کر دے نفی
اس کے چہرے پہ نور
جیسے رب کا ظہور
میرے گھر کی خوشی
ہے اسی سے جزی
تو نہ ملتا مجھے
کیسے پانی تھے
تیرے لب کی نون نون
جیسے ہوا اللہ ہو
ہے سکون کا کشاں
پیارا اک جہاں
رہتا دل میں سدا
لب پہ ہے یہ دعا
گود میں ٹو رہے
جتن کی پینڈ لے
میری جھیل ہے ٹو ہاں
ٹو کپے تو میں ہاں

(فریدہ خاتم لاہور)

لاچ

کوئی تو کہہ گیا ہے
لاچ بری بلا ہے
(ظفر تھما، ملتان)

غزل

مزرعتی شب غم، یاد بھی دل دکھانے آئے
ہجر کی راتوں میں کوئی شمع جلانے آئے
جو کہتے تھے ہم تیرے ہیں آخر ہوئے بیگانے
دل خوش فہم کو امید وفا دلانے آئے
جو خفا ہے ہم سے گزے مومنوں کی طرح
کوئی تو میرے سخن گلشن میں پھول کھلانے آئے
خاموش ہے ساری فضا تیرے جانے سے
یاد بھی پرانے قرض وفا کا چمکانے آئے
ٹھوکر ایسی کھائی ہم نے تیرے عشق میں جاوید
دارغ جدائیوں کے پھر سے کوئی مٹانے آئے
(محمد اسلم جاوید، فیصل آباد)

لغزم

اپنا دکھ یہاں رکھنا
اسے دکھائی لڑکی اسے بھولی بھالی لڑکی
تیرا دل دکھوں کی آماجگاہ ہے
مگر تو پھر بھی

اپنے دکھوں کی اس بناری کو
نہ دکھو نا

اس کو ہمیشہ بند ہی رکھنا
کسی سے کچھ نہ کہنا

نہ ہواؤں سے

نہ فضاؤں سے

نہ پہنچوں سے

نہ سکھوں سے

نہ اڑنے چوں سے

کہ یہ سب تیرا راز

اک شخص نے سنا
قصبے میں تھا قصائی
جب ہڈی اس نے پھینکی
کشتے نے سمجھ..... اٹھائی
غریبا چل پڑا وہ
سکوں میں نہ گھڑا وہ
کچھ سوچ کر وہ دوڑا
قصبے کو بچھے چھڑا
تھا نہر کا کنارہ
رستہ تھا لمبا چڑا
اشجار جھوٹے تھے
طیور گا رہے تھے
بہتا تھا تیز پانی
کشتے کی تھی جوانی

رستہ میں رک گیا وہ
کھانے کو ہڈی نکالی
دیکھی سمجھو کی ہل
ترجیحی قصور کی ہل
اب کتا ہل پہ آیا
پانی میں کتا پلا
ہڈی یڑی وہ سمجھا
تھا اس کا اپنا سایہ
فورا زقہ لگا
ہڈی تھی جو گونائی
لاچ کبھی نہ کرنا
قناعت میں تم ابھرنا
بن کر عظیم..... جینا
دنیا سے یوں گزرنا

پہلے ہی ناانصاف ہے
قصبے سے بھرا ہوا ہے
یہ تیرا بچا دو بھر
کر دے گا
بس خاموش رہ
بس خاموش رہ

(مہر نسیم، لاہور کنٹ)

غزل

محبت کا روگ لگا کے بہت چپچٹائے
نیند اڑی راتوں کی، یاد تری ستائے
کاش کے محبت کی شدت اتنی ہوا
دل اپنا ٹو بھی سائی مری طرح جلائے
تقاضائے محقق ہے اب دید ہو تمہاری
بہت ہو گیا، جدائی میں بہت دن بتائے
تم آ بھی جاؤ دل کے سونے گلشن میں صدف
زمانے زہر میں بجھے تیر کو بہت چلائے
(نسیم کنیر، صدف، ڈسک)

خاص اعلان

محترم قارئین! ہر شاعر میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعریہ کا تعارف بعد تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/لغزم/پندیدہ شاعری/غزل/لغزم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کو پتہ کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 میں مارکیٹ ریپاز کارڈز نم لاہور پر ارسال کریں۔

کوین برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی

تصویر

منسلک کریں

نام:

تفصیلی قابلیت:

پندیدہ شاعر:

پندیدہ غزل/لغزم:

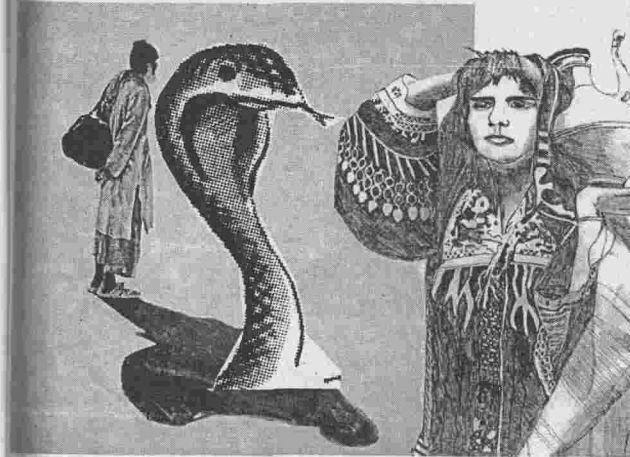
مشاغل:

تاریخ پیدائش/پرچ:

پتہ:

ای میل:

نوٹ: اپنی پندنا پند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔



ناگ دیوتا کا شکار

ہفت مل

اگر اس ناگ کی جگہ کوئی شیر یا بلی ہوتا تو بڑی مشکل سے میرا پہلا حملہ برداشت کرتا اور بھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر اس ناگ نے مجھے بہوت کر رکھا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ وہ میری شکاری زندگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

ایک پر اسرار سانپ کے شکار کا حیرت انگیز واقعہ،
راوی کا اسرار ہے کہ تمام واقعات وہ سن چپے ہیں!

ہوتے۔ وہ جس لڑکی پر حملہ کرتا اس کا انجام بہت افسانہ ہوتا۔ وہ لڑکی بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتی مگر روحانی طور پر اس کے دل میں اس کی دہشت بیٹھ جاتی اور وہ آہستہ آہستہ سوکھ کر پتھر کی طرح کی طرح دم توڑ دیتی۔

آج بھی جب مجھے اس ناگ کا خیال آتا ہے تو کچھ عاری ہو جاتی ہے۔ وہ ناگ جو انسان بننا چاہتا تھا، جس نے گاؤں والوں کا حیران بن کر رکھا تھا، جو نہ جانے کس بات کا انتقام لے رہا تھا۔ اس کے وار گاؤں کی سستیں اور نازک اہماد دھنیزاؤں پر

مجھے اب خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ تین ماہ مسلسل صحت اور جانفشانی کے بعد میں نے کس طرح اس ناگ کا سراغ لگایا۔

میں شیر کے شکار کا شوقین تھا۔ تمام شکاروں سے زیادہ دلچسپ اور خطرناک شکار شیر ہی کا ہوتا ہے لیکن اس ناگ کا شکار شیر کے شکار سے زیادہ دلچسپ اور خطرناک ثابت ہوا۔ رات کی تاریکی میں جب شیر جنگل میں دھاڑتا ہے تو بڑے بڑے سورماؤں اور بہادروں کا پتا پانی کر دیتا ہے لیکن وہ ناگ جو اپنی ہیئت بدل لیتا تھا، شیروں سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ شیر کے شکار میں گزرا ہے۔ میں بھی اتنا ہراساں نہ ہوا تھا جتنا اس ناگ سے ہوا۔ اس قسم کی واردات پہلے کبھی دیکھی تھی نہ کبھی تھی۔ میں بڑے بڑے خطرناک آدم خور شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مار چکا تھا، مگر اس ناگ کا نام سن کر تو مجھے پسینہ آ جاتا۔

میرے پاس میری رہتی تھری ناٹ تھری ہر وقت رہتی تھی۔ اس میں بیک وقت بارہ گولیاں بھرتی تھیں۔ وہ دراصل میں نے جرمنی سے منگوائی تھی۔ میں ہانگ کا کایک کی بنی ہوئی ایک مضبوط تارچ لے کر اس کی نال پر فٹ کر رہی تھی۔ میں رات کی تاریکی میں خوفناک کے خوفناک جنگل میں بھی جا سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری انگلی کی ذرا سی حرکت باقی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔

اپنے ایک عزیز کے بلانے پر میں اس گاؤں میں پہنچا۔ سانپ کے متعلق انوارہ اڑ چکی تھی کہ ایک بہت بڑا سیاہ رنگ کا ناگ جنگل کی طرف رہتا ہے مگر کوئی اور خاص بات نہ ہوئی تھی۔ میرے جانے سے چند روز میں غور تیں مری چکی تھیں، جن کی موت کا اصل سبب کسی کو معلوم نہ تھا۔ خیال عام کیا جاتا تھا

سورج غروب ہونے سے نصف گھنٹہ پیشتر میں واپس لوٹا۔ وہ آدی ہل پر سے جا چکا تھا۔ میں چند لمحوں پہلے پر کھڑا ہوا ہوتا ہوتا شفاف پانی کو دیکھتا رہا۔ پانی چپکے چپکے بہہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پانی کی رفتار اور وقت کی رفتار میں کتنی یکسانیت ہے۔ جس طرح وقت واپس نہیں آتا اسی طرح

میں سوچ رہا تھا۔ وہ آدی ہل پر سے جا چکا تھا۔ میں چند لمحوں پہلے پر کھڑا ہوا ہوتا ہوتا شفاف پانی کو دیکھتا رہا۔ پانی چپکے چپکے بہہ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پانی کی رفتار اور وقت کی رفتار میں کتنی یکسانیت ہے۔ جس طرح وقت واپس نہیں آتا اسی طرح

یہاں سے گزرا ہوا پانی بھی واپس نہیں آ سکا۔ دفعہ میں نے محسوس کیا کہ جنگل میں بھیابک سناٹا چھپا چکا ہے۔ تمام پرندے جو چند لمحے پختہ پختہ رہے تھے اچانک خاموش ہو گئے ہیں۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اچانک میری نظر میں گز دور ایک سیاہ رنگ کے ناگ پر پڑی۔ وہ ناگ ایک بھماڑی کی اوٹ میں بیٹھا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ محسوس کی۔ اس سے آنکھیں ملنے ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ کسی انجانہی قوت نے مجھے ملوث کر دیا ہے۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میری نظریں ناگ پر تھیں۔ میں پوری قوت سے سنبھلا۔ میں نے رائفل کا زرخ گاں کی طرف پھیرا۔ صرف وہ سیکڑے کے لیے میں نے ناگ سے نظریں ہٹا کر نشانہ لیا۔

جب میں نے دوبارہ وہاں دیکھا تو ناگ قاع تھا۔ میں حیران اور پریشان کھڑا رہ گیا۔ اس دن کے بعد میری کی طرف کامیاب میرا معمول بن گیا۔ وہ ناگ مجھے پھر بھی نہ دکھائی دیا البتہ اکثر اوقات مجھے وہ آدمی ہل پر مل جاتا۔ وہ خاموش طبیعت اور پراسرار قسم کا انسان تھا۔ وہ باتیں بہت کم کرتا۔ چند ہی ملاقاتوں کے بعد وہ میرا خاصا بے تکلف دوست بن گیا۔ مجھے اس کا نام اور جائے رہائش کا علم نہ تھا اور نہ میں نے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ مجھے جنگل میں ملتا اور وہیں جدا ہو جاتا۔

وہ پراسرار آدمی میرے ساتھ جنگل میں کافی دور تک چلا جاتا۔ اس کی قربت میں مجھے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہ ہوتا۔ میں اکثر شکار کی خلاص میں دریائے نرے ندیاں چلا جاتا۔ مجھے کسی قسم کا درندہ نہ ملا۔ پھر بھی نہ جانے مجھے اس گاؤں سے اتنی دیکھی کیوں ہو گئی تھی۔ میرے عزیز رشتہ داروں نے مجھے ناگ مارنے کو بلایا تھا مگر اب ناگ کا کہیں نام

دانش نہ تھا۔ البتہ کبھی کبھار اس کی کسی کو جھلک نظر آ جاتی۔ جب میں وہاں جاتا تو وہ غائب ہو چکا ہوتا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ ناگ یہاں موجود ہے کیونکہ میں بذاتِ خود اسے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اس گاؤں میں پورا ہفتہ گزر گیا۔ ہمارے بڑوں میں ایک ہندو گھرانہ آباد تھا۔ ان کی ایک حسین اور جوان لڑکی کامتی تھی۔ کامتی کی آنکھوں میں بجلی کی چمک اور چہرے پر پھولوں کا ٹھکانہ تھا۔ وہ اکثر میرے عزیزوں کے ہاں آ جاتا کرتی تھی۔ چند دنوں سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ پریشان سی رہتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی مگر اس نے مجھے نہ بتایا نہ کئی دفعہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک ہفتے میں سوکھ کر کاٹا بن گئی۔ اس کے والدین پریشان تھے۔ انہوں نے بہت علاج کرایا مگر افادہ نہ ہوا۔ میرے چند دوستوں نے بتایا کہ اس بیماری سے پہلے بھی کسی عورتیں سر جھلک ہیں۔ ایک ہفتہ بعد وہ سسک سسک کر موت کے منہ میں چلی گئی۔

مجھے کامتی کی جواں عمر کی کابھت افسوس تھا۔ افسوس تو سب کو تھا، مگر مجھے یوں محسوس ہوا رہا تھا کہ وہ کوئی گہرا راز اپنے دل میں چھپا کر لے گئی ہے۔ میرے دل میں ایک بے چینی سی گلی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ میرینے کے چہرے پر خوف و ہراس کی پڑ چھائیاں تھیں نہ کہ بیماری کی رنجت۔ میں ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا رہتا کہ وہ کون سا راز ہے جس نے کامتی کو موت کے گھاٹ اتارا۔ وہ کون سا درد ہے جس کے باعث کامتی نے وہ راز بتانے سے گریز کیا اور موت قبول کر لی لیکن مجھے اپنے ارادے میں کامیابی نہ ہوئی۔

گیا۔ اجمیری رات تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ میں صغیر کے مکان پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آدھی رات تک مکان سے کوئی نہ نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور باہر نکلے گا۔ آدھی رات کے بعد میں اس طویل اور سچا انتظار سے واپس ہونے لگا۔ میں بیٹھا بیٹھا گھبرا گیا تھا۔ اب میں آنکھیں می والا تھا کہ اچانک مجھے جنگل کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ میں چونک کر ایک بھماڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ ستاروں کی بجلی بجلی روشنی میں مجھے جنگل کی طرف سے ایک سفید سا سایہ آتا دکھائی دیا۔ جب وہ سایہ میرے قریب سے گزرا تو میں نے غور سے دیکھا اور پچھان لیا۔

وہ سفید سی۔ اگلے دن میں نے صغیر کو گھر بلایا۔ اس کا چہرہ پہلے دن سے بھی زیادہ اداس اور غمزدہ تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوا تھا کہ اسے تپ دق کا مرض تیسرے درجے پر پہنچ چکا ہے۔ میں نے پوچھا ”صغیر تمہیں کون سی بیماری ہے؟“ وہ بولی ”آپ کو وہم ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

میں نے کہا ”نادان نہ بنو، صبح چ تو دامد کس مرض سے روز بروز کمزور ہو جاتی ہو۔“ وہ خاموش رہی۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر کہا: ”صغیر صبح تا نام رات کہاں سے آئی تھی؟“ وہ بولی ”بھائی میں کچھ نہیں سنا تھا“ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی نامعلوم قوت سے بھت زدہ ہے۔ میں نے اسے بہت لمبی دیر اور رائفل دکھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ دیکھو رائفل۔ اس میں بارہ گولیاں بیک وقت بھرتی

کامتی کی موت کو ڈرہ ہفتہ گزر گیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ اب دیکھیں بیماری کس پر حملہ کرنی ہے۔ میں اس راز سے پردہ اٹھانے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ وہ ناگ اب بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ کامتی کی موت کے بعد وہ پراسرار انسان میرے ساتھ گاؤں میں بھی آ جاتا۔ ایک ہفتہ انتظار کے بعد میں نے صغیر کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے وہی آثار دیکھے جو کامتی کے چہرے پر تھے۔ کامتی کے بعد صغیر گاؤں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ناگ کا اہم لڑکی تھی۔ اس کے جسم کے خطوط بہت ناگ کی تھے۔ جن عزیزوں کے ہاں میں بھرا ہوا تھا وہ اس کی رشتہ دار تھی۔

جب میں نے اس کی پریشانی دیکھی تو ایک دن پوچھ لیا مگر اس نے بات ٹال دی، جس سے میرا شوق تجسس بڑھتا گیا۔ میں نے صغیر کی ہر حرکت کا جائزہ لینا شروع کر دیا لیکن میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ صغیر بھی کچھ نہ بتا رہی تھی لیکن اس کی حالت تیزی سے ابتر ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے رات کو صغیر پر پھر اسے کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن شام کے وقت میں جنگل سے واپس آ رہا تھا۔ وہ پراسرار آدمی بھی میرے ساتھ گاؤں میں آ گیا۔ جب ہم صغیر کے مکان کے سامنے سے گزرے تو صغیر دروازے پر کھڑی باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب اس کی نظر میرے ساتھ والے پراسرار آدمی پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ اچانک بدل گیا۔ وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ اس کی اس حرکت سے میرے دل میں شک سا پیدا کیا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر میں عشاء کے وقت گھر سے نکلا اور صغیر کے دروازے کے سامنے باہر کی طرف ایک بھماڑی کی اوٹ میں بیٹھ

کے سر پر گر۔ اس نے چیخ ماری اور گر کر ترے گئی۔
رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں بھاگ کر
دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا اور قہر قہر کا پیٹے لگا۔
وہ باریک سائپ نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ کھرے
تمام افراد بچ ہو گئے۔ صنیہ دم توڑ رہی تھی۔ میں
خوف سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے
دم توڑ دیا۔

میں زندگی میں کبھی اتنا خوفزدہ اور ہراساں
نہیں ہوا تھا جتنا اس ناگ سے ہوا۔ صنیہ کی موت
کوئی ایسی موت نہ تھی جسے میں جلد فراموش کر دیتا۔
میں نے دل میں عہد کر لیا کہ ضرور اس ناگ سے
پنپوں گا۔ میں بھی آدم خورد شیروں سے نہ گھبرایا تھا۔
بے شمار شیروں کا شکار کیا تھا لیکن اس ناگ نے
میرے حواس کھود دیے۔ اگر وہ میرے سامنے ہوتا تو
میں اندھا دھند بارہ گولیاں اس کے وجود میں گزرا
کر دوبارہ رائفل بھر لیتا۔

دوسرے دن میں بڑی مستقل مزاجی سے ناگ
کے مقابلے کو نکلا۔ میں عدی پر پہنچ گیا۔ پل پر وہ
آدی نہ تھا جسے صنیہ نے ناگ بتایا تھا۔ پہلے وہ ہر
روز ہوا کرتا تھا۔ غالباً اسے میرے ارادے کا علم ہو
چکا تھا۔ اس کو طم تو پہلے ہی تھا۔ اس کے باوجود وہ
میرے ساتھ رہتا۔ میں اس کو کئی بار بتا چکا تھا کہ
میں ایک ناگ کو مارنے آیا ہوں۔ جب میں اس کی
طرف دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں مجھے ایک چمک
اور کشش نظر آتی اور مجھے اس سے آنکھ ملانے کی
جرات نہ ہوتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ میرا
معتمد اڑا رہا ہے لیکن میں نے کبھی توجہ نہ دی۔ مجھے
یہ معلوم نہ تھا کہ میں اپنے بدترین دشمن کو دوست بنا
چکا ہوں اور اس کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں اسی کی
خاطر آیا ہوں۔

آج میں سوچ رہا تھا کہ میری بے وقوفی سے

میں بڑے بڑے آدم خورد شیروں کو مار چکا
ہوں۔ تم بتاؤ جنہیں کیا خطرہ ہے تاکہ میں تمہاری
جان بچا سکوں۔ اگر میں مارا بھی گیا تو میرے بعد
پالی میرا اور تمہارا انتقام لے گی۔

صنیہ نے میری طرف دیکھا۔ کوئی غیر مرئی
قوت اسے بولنے سے روک رہی تھی۔ میں نے پھر
کہا، ”دیکھو صنیہ! اگر تم نے مجھے نہ بتایا تو جنہیں
کاشی کی طرح سبک سبک کر مرنے پڑے گا۔
تمہارے بعد نہ جانے کس کی باری آئے۔ اب تم
موت سے ڈر کر وہ راز چھپا رہی ہو جو جنہیں موت
کے منہ میں لے جا رہا ہے۔ اگر تم مجھے بتا دو تو ہو
سکتا ہے کہ میں جنہیں اور گاؤں والوں کو اس مصیبت
سے بچا سکوں۔“

وہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر بولی: اچھا سنو!
میں زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر یہ راز بتانے
لگی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور
میرے قریب آ کر بولی:

”مجھے امید ہے کہ آپ کامیاب ہو جائیں
گے۔ آپ شاید مجھے تو نہ بچا سکیں لیکن گاؤں والوں
کو ضرور بچا لیں گے اور پالی کو یہاں آنے کی
ضرورت نہیں۔ اس کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔ وہ
بہت خوبصورت ہے۔ میری خوبصورتی میرے لیے
وہاں جان بٹنی۔ ہاں تو میں آپ کو اصل راز بتاؤں۔
وہ یہ کہہ کر شام آپ کے ساتھ جو آدی آ رہا تھا
..... وہ انسان نہیں ناگ ہے۔“

یہ الفاظ ابھی اس کی زبان ہی پر تھے کہ یکایک
دروازہ کھل گیا۔ میں نے اور صنیہ نے دروازے کی
طرف دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔ صنیہ کا چہرہ زرد پڑ
گیا۔ وہ بولی ”ناگ آ گیا۔“ میں نے رائفل
اٹھائی، اسی لمحے جیت سے ایک باریک سائپ صنیہ

اچانک راتقل سے دو شعلے نکلے۔ گاؤں کی آواز سے جنگل لرز اٹھا۔ پرندوں نے شور مچا دیا۔ میں نے تارچ جلا کر دیکھا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ میری پریشانی اور بدحواسی کی حد نہ رہی۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں حیران اور پریشان تھا کہ اس نئے دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اگر وہ کوئی درندہ ہوتا تو کبھی کا جہنم واصل ہو چکا ہوتا لیکن اس ناگ نے میری قوت فیصلہ سلب کر لی۔ جب میری قوت فیصلہ نے جواب دے دیا تو میں نے چند روزوں اور جیوں سے مشورہ کیا۔

انہوں نے کہا ”تم پہلے اس کی جاسے رہائش معلوم کرو۔ ملے کے قریب ہی اس کا ٹھکانہ ہو گا۔ یہ ندی کے پلے کے قریب محدود علاقے میں رہتا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے۔ اگر تم نے اس کا مسکن تلاش کر لیا تو سمجھو اس موذی کو مار لیا۔ یہ نیند کی حالت میں قابو آنے کا تیز یہ بھی خیال رکھو تمہاری ذرا سی غلطی یا لغزش تمہارے تمام منصوبے خاک میں ملا سکتی ہے۔ وہ بہت ہوشیار ہو چکا ہے۔ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اس کو تلاش کرنا۔“

گاؤں والے اب اس قدر خوفزدہ ہو چکے تھے کہ سرشام ہی گھروں میں گھس جاتے اور گاؤں میں بے کراں سناٹا چھا جاتا۔ رات کی تاریکی میں ناگ کی خوفناک پھنکاریں سنائی دیتیں، جن سے بچے بوڑھے اور جوان سبھی خوف کھاتے۔ صبح تو یہ ہے کہ میرا دل بھی خوف سے کانپ اٹھتا۔ روز بروز ناگ کا عرصہ بڑھ رہا تھا۔ اب وہ گاؤں کی گلیوں میں بھی آ جاتا۔ یہ سب کچھ رات کی تاریکی میں ہوتا۔ روشنی ہونے سے نکل دے چلا جاتا۔ میں چاندنی راتوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے حکومت کو درخواست بھی دیں مگر شوقانی نہ ہوئی۔ گاؤں والے

راستے میں ٹیلے والی جھاڑیوں کے قریب بیٹھے تو وہ وہاں ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ ہم نے بھاگتے کا ارادہ کیا تو وہ پھنکار کر ہماری طرف لپکا لیکن ہم بھاگ نکلے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سیدے پیٹیں آئے ہیں۔“ میں نے جلدی سے بندوق نمک کی۔ اس میں گولیاں بھریں اور ان کو کرے اس جگہ پینچا جہاں ان کے کہنے کے مطابق ناگ ان کے پیچھے بھاگتا تھا۔ میں نے سراخ لگانے کی بہت کوشش کی مگر اس کی گلیوں اس محدود ٹیلے سے آگے نہ نکلی۔ میں وہ چند جھاڑیاں اچھی طرح دیکھیں مگر ناگ وہاں نہ تھا۔

قریب ایک ماہ اور گزر گیا۔ مجھے کوئی سراخ نہ ملا۔ سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اتنا بڑا جنگل ہونے کے باوجود ندی کے پلے کے قریب محدود علاقے میں رہتا۔ کبھی بھی وہ کسانوں کے کھیتوں کی طرف جا نکلتا۔ کسانوں نے منہ اندھیرے باہر نکلتا بند کر دیا۔ ادھر سرشام گھروں میں دیک جاتے۔ ایک دن میں میں سورج پورے چاند کی مدد روشنی میں کھیتوں سے ہوتا ہوا ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ ہوا ساکن ہونے کی وجہ سے جنگل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ درختوں کے نیچے فضا پر سکون اور فرحت بخش تھی۔ میں ندی کے کنارے کنارے پلے کی طرف آ رہا تھا۔ پلے سے قریب تیس قدم دور دو دھمکے درختوں کے نیچے مجھے ناگ کی خفیف سی جھلک دکھائی دی۔ میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ درختوں کی وجہ سے وہاں خاصا اندھیرا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک جھاڑی کی اوٹ لی۔ پہلے میں نے اپنا دم اور قریب نظر سمجھا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے جھاڑی کے ایک طرف سے دیکھا۔ مجھے ناگ کی جھلک دکھائی دی۔ میں نے اپنے جسم میں کپکپاہٹ سی محسوس کی اور راتقل سیدھی گی۔

گیا تو اسے ناگ کی پھنکار سنائی دی۔ وہ خوفزدہ ہو کر واپس پلٹا۔ جب اس نے ایک پاؤں پلے پر رکھا تو ناگ قریب کی گھنی جھاڑی سے پھنکارا ہوا نکلا۔ لڑکے کی نظر اس پر پڑی تو وہ سکتے کے عالم میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس میں اتنی ہمت نہ پیدا ہو سکی کہ وہ بھاگ کر پلے نمودر کرنا پانچ کر سکی کہ وہ لے لیے پلٹا۔ ناگ اس کے پاس پہنچ گیا۔ ناگ نے جب اسے منہ میں دھاپا تو اس کے منہ سے صرف ایک ہی دلدوز جھج جھج جوڑیدہ فریاد نکلا اور گاؤں میں سنائی دی۔

میں جب وہاں پہنچا تو بہت سے لوگ افرادہ اور طول چہرے لیے واپس آ رہے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تمام واقعہ مجھے سنایا۔ میں خود جائے واردات پر پہنچا۔ چند آدمی میرے ساتھ تھے۔ میں نے وہاں نشانات دیکھنے کی کوشش کی۔ پلے سے تین قدم دور تنک لڑکے کے گھسنے کے نشانوں کے علاوہ صرف سانپ کی لکیر تھی، جو تعاقب کرنے پر چند گھنٹی جھاڑیوں سے گزر کر گھاس پر قابو ہو گئی۔

ناگ زیادہ تر لوگوں کو اپنی ایک جھلک دکھا کر بدحواس کر دیتا۔ اگر کوئی اکیلا دیکھا مل جاتا تو حملہ کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ جب میں وہاں جاتا تو وہ غائب ہو جاتا ہوتا۔ میں دن میں شام کے وقت بندوق صاف کر رہا تھا کہ دو دو جوان لڑکے بدحواس سے بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے چہرے پر وحشت چمک رہی تھی۔ میں نے ان کی حالت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ میرے پوچھنے سے پہلے وہ بولے ”ناگ ہمارے پیچھے بھاگا۔“

”کہاں؟“ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا ”ہم کچھ میٹوں سے واپس آ رہے تھے۔ جب ہم

میرے دشمن کو میرے عزائم کا علم ہو چکا ہے۔ اس انکشاف کے بعد مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ میرا بدترین دشمن بن چکا ہو گا۔ اب وہ کبھی میرے سامنے نہ آئے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی وقت اپنا دار بجا کر مجھ پر حملہ کر دے۔ میں نے اس ناگ کی نسل کے متعلق لوگوں سے بہت حیرت انگیز اور عجیب و غریب باتیں سنی تھیں۔ سانپوں کی یہ خاص نسل جنوبی ہندوستان کے ان پہاڑوں اور جنگلوں میں پائی جاتی تھی جو سب سے بڑے کے رے جنگل پور تک دوڑاتے نہڑا کے دونوں طرف ہیں۔ یہ سانپ عمر کے خاص حصے پر پھنچ کر اپنی مرضی کے مطابق خود کو ہر قسم کے وجود میں ڈھال لیتا ہے، ہر بھس بدل سکتا ہے۔ جوں جوں میں ان ناگوں کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔ میرا خوف بڑھ رہا تھا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ کوشش کے باوجود ناگ دوبارہ نہیں دکھائی نہ دیا البتہ اس نے گاؤں کے بہت سے افراد کو قتل کر لیے۔ گاؤں خوف و ہراس کی لپیٹ میں تھا۔ ان حادثات نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ میرے خلاف ناگ کا یہ اعلان جنگ تھا۔ وہ ناگ مجھے نیند مبارزت دے رہا تھا۔ میری راتوں کی نیند اور دل کا سکون چاہ ہو گیا۔ مجھے اس ناگ کی جستجو تھی۔ فریقین میں باقاعدہ اعلان جنگ ہو چکا تھا۔ میں ہر وقت محتاط رہتا۔ میں نے گاؤں کے والوں کا بھی بہت انتظام کر دیا لیکن اس کے باوجود ایک لڑکا اس کی زد میں آ گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دو جوان لڑکا ہاتھ میں کلبھاری لے کر جنگل کی طرف نکلیاں لینے کی غرض سے نکل گیا۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ بے قری سے ندی کا پل عبور کر کے جنگل میں جا داخل ہوا۔ جب وہ جنگل میں پلے سے دن قدم دور

میرے دم دلا سے ابھی تک وہاں تھے وہ نہ کبھی کے بھاگ چکے ہوتے۔ میں نے ان سب کے سامنے ناگ کو مارنے کا عہد کیا تھا۔ رات کو جب ماحول پرسکون ہو جاتا تو جنگل کی طرف سے خوفناک پتھکارتیں سنائی دیتیں۔ وہ پتدرج پڑتی ہوئی گاؤں میں داخل ہو جاتیں۔ کبھی کبھی میں اندر سے میں اس کی آواز قریب سے سن کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا مگر میں اس کو دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرا دل چاہتا کہ ابھی جا کر اس کو مار ڈالوں مگر رات کی خوفناک تاریکی میں باہر نکل کر اس کا مقابلہ کرنا سراسر حماقت ہی نہیں بلکہ اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ میں صرف اس کو دن کے اُجالے میں تلاشی کرتا۔ اس کی کھیر ہل سے تھوڑی دور تک میری رہنمائی کرتی۔ آگے جا کر کم ہو جاتی۔

ایک دن علی الصباح میں ندی سے گزر کر جنگل میں داخل ہوا۔ اچانک میری نظر ناگ کی کھیر پر پڑی۔ میں نے جھک کر غور سے دیکھا اور فوراً پچپان لیا کہ یہ ایسی موزی کی کھیر ہے۔ میں کھیر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ کھیر کا ایک سرا جنگل میں جا تھا اور دوسرا ہل کے قریب ندی کے کنارے پر آگئی ہوئی گھٹی جھاڑیوں میں جا تھا۔ میں جنگل کی طرف ہولیا۔ کھیر تازہ اور پاشن نہ ہونے کی وجہ سے واضح تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ناگ چند منٹ پہلے یہاں سے گزرا ہے۔ میں کھیر کے ساتھ ساتھ جنگل میں بہت دور تک چلا گیا۔ وہاں سے گھوم کر کھیر اسی ندی کے کنارے پر ہل سے نصف میل دور آگئی۔ اب میرا رخ ہل کی طرف تھا۔

میں نے ناگ کو توڑنا دوسری طرف سے ان جھاڑیوں ہی میں داخل ہو رہی تھی۔ میں ان جھاڑیوں کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اب ناگ سے سامنا ہو گا۔ میں پوری طرح مستعد تھا۔ تھوڑی دیر گزر دویش کا جائزہ لینے کے بعد میں خدا کا نام لے کر جھاڑیوں میں داخل ہوا۔ میں دھڑکنے والی آدھی نامعلوم خوف سے لرزتا ہوا آگے بڑھا۔ سورج نکل چکا تھا۔ دھوپ بڑھ رہی تھی میں دن کی روشنی میں بھی آنکھیں میھاڑ پھاڑ کر آگے بڑھا۔ قریب پانچ قدم چلنے کے بعد پانچ مربع گز زمین صاف نظر آئی۔ وہاں کھیر کے نشان صاف اور گہرے تھے۔ میں ایک قدم آگے آگے بڑھا۔ وہاں جو سنجر میں نے دیکھا اس سے میرے جسم کے روگٹنے کھڑے ہو گئے۔ میرے حواس کم ہونے لگے۔ ناگ کی کھیر اچانک غائب ہوئی۔ اس سے آگے کوئی نشان نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ناگ کسی نامعلوم جگہ میں مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں بدحواس ہو کر واپس مڑا۔

ابھی میں ان جھاڑیوں ہی میں تھا کہ مجھے ناگ کی خوفناک پتھکارت سنائی دی جس سے میری روح لرز اُٹھی۔ درختوں سے پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ گئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ جھاڑیوں کو توڑنا ہوا میری طرف آ رہا ہے۔ میں بھاگ کر باہر نکلا۔ جب میں نے باہر آ کر اپنا جائزہ لیا تو دیکھا کہ میرے تمام کپڑے پیسے سے بھیک چکے ہیں۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کالوں میں تیز نیلیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ندی کے کنارے درختوں کی گھٹی جھاڑیوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مجھے کچھ دیر بعد ہوش آیا۔ جب میرے حواس درست ہوئے تو میں کچھ سوچتا ہوا ہل کی طرف بڑھا۔

میں سوچ رہا تھا "ناگ کا ٹھکانہ ان جھاڑیوں میں ہے لیکن دن کے وقت ناگ کی موجودگی میں وہاں پہنچنا جان بوجھ کر کام ہے۔ اگر کسی وقت ناگ یہاں سے باہر دیکھا تو اس کی عدم موجودگی میں اس کا ٹھکانہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ذرا ہوشیاری اور بھڑکائی کی ضرورت ہے۔"

اگر اس ناگ کی جگہ کبھی شیر یا تھی ہوتا تو بڑی مشکل سے میرا پہلا حملہ برداشت کرتا اور کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ مگر اس ناگ نے مجھے مہموت کر رکھا تھا۔ غالباً وہ مجھ سے کھیل رہا تھا۔ وہ میری دشواری زدگی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ وہ جوں جوں مجھے خوفزدہ کر رہا تھا میرے دل میں اس کو مارنے کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ نہ جانے میرا خیر کس مٹی سے اٹھایا گیا تھا کہ اتنا خوف مجھے بھی باز نہ رکھ سکا۔ مجھے اس قسم کے خطرات سے ایک لذت سی محسوس ہوتی تھی جو شریاؤں کو شراب سے ہوا کرتی ہے!

اب اس ناگ کے ٹھکانے کا پتا لگانا آسان تھا۔ میں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اتفاق سے تیسرے دن مجھے موقع مل گیا۔ شام سے پہلے کوئی تین بجے کے قریب ایک آدمی میرے پاس آیا اور "خسور ناگ اس لینے پر ہے جہاں ان دو لڑکوں کے پیچھے بھاگا تھا۔"

میں نے کہا "تمہیں یقین ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہاں میں نے خود دیکھا ہے وہ مجھے دیکھ کر پتھکا رہا تھا۔"

میں اتنا سنتے ہی اٹھ کر بھاگ نکلا۔ وہ ٹیلہ گاؤں کی دوسری طرف تھا۔ سانپ کا ٹھکانہ دوسری طرف ندی کے پار تھا۔ میرا رخ ندی کی طرف دیکھ کر اس آدمی نے کہا "خسور! ٹیلہ ادھر ہے" میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور جلد ہی ندی عبور کر کے جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔

میری آنکھیں تیزی سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں کانٹوں سے اچھٹا غنیموں میں پہنچتا ہوا جلدی جلدی آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جھاڑیاں کافی پرانی معلوم ہوتی تھیں۔ تھوڑی دور جا کر آگے ایک ڈھلوان آگئی جسے جھاڑیوں کے علاوہ جنگلی بیلیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

چند قدم نشیب میں چلنے کے بعد میں کافی گہرائی میں آ کر چکا تھا۔ اب میرے سامنے اور دائیں بائیں عمودی دیوار تھی، میرے عقب میں وہی ڈھلوان تھی جسے عبور کر کے میں یہاں آیا تھا۔ بائیں طرف بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ میں عمودی دیوار کے قریب جا کر کڑک گیا۔ میں نے چپٹی سے پسینہ صاف کیا۔ راتفل احتیاط سے کپڑی اور چاروں طرف دیکھ کر ہر قسم کی آہٹ سے خبردار ہو کر اس طرف بڑھا۔ خوش قسمتی سے وہاں بندھی۔ فضا میں جس سے دور کی آہٹ یا آسانی سنائی دے سکتی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا تاہم میں جرات سے کام لے کر آگے بڑھا۔ دیوار کے ساتھ چار قدم دائیں طرف چلنے کے بعد مجھے ایک غار دکھائی دیا جس کا منہ کافی بڑا تھا۔ اس غار میں کافی آدمی جا سکتے تھے۔ میں آگے بڑھا۔ اس میں اندر میرا تھا۔ میں نے تارچ جلا کر دیکھا وہ اندر سے کافی کشادہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا لیکن میرے کان باہر سے ہر آہٹ کے منتظر تھے۔ میں دو تین قدم غار کے اندر آگے بڑھا۔

اس بڑے غار کے اندر ایک طرف مجھے ایک اور چھوٹا سا غار دکھائی دیا جسے ہم ناگ کا گھل کہہ سکتے ہیں۔ چند لمبے جائزہ لینے کے بعد میں ناگ کے آگے جانے کے ڈر سے واپس لوٹا۔ غار سے باہر نکل کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جب سے دو مال نکال کر پسینہ پونچھا اور واپس لوٹا۔ آتے وقت میں

نے ایک شہی توڑ کر غار پر سے اپنے پیروں کے تمام نشان مٹا ڈالے اور مطمئن ہو کر واپس آ گیا۔ گھر آ کر میں نے کھانا کھایا اور باگ کے بارے میں سوچنا سوچنا سو گیا۔

رات کے چھلے پہر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ زندگی کا موت کا فیصلہ! میں نے اٹھ کر بندوق اور نارنج دوبارہ میٹ کی۔ آیا وہ صبح کام کر رہی ہیں یا نہیں۔ کہیں وقت پر دھوکہ نہ دے جا جائیں۔ بہر حال ان کی طرف سے مطمئن ہو کر سرج کی نماز سے فارغ ہو کر علی ایچ چاند کی مدھم اور دلفریب روشنی میں موت کے منہ کی طرف چل پڑا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی مست ہوا چل رہی تھی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ جانوروں کے علاوہ انسانوں کو بھی تھک تھک کر سلا یا کرتی ہے۔ میں نے ریڈ کے فلیٹ پہن کر رکھے تھے، جن کی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی۔ پھر بھی میں دے دے قدموں سے چلنا ہوا ان جہازوں میں داخل ہوا جہاں ایک دن قبل باگ کا غار دیکھ چکا تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ آہستہ نشیب عمیق کر چکا تھا۔ عمودی دیوار کے قریب پہنچ کر مجھے کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ ہوا ساکن تھی۔ جنگل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ دور کہیں جانوروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ میرے قدم ڈک گئے۔ میں نے ستائیسویں رات کے چاند کی طرف دیکھا۔ مجھے خیال آیا شاید میں دوبارہ یہ چاند اور ستارے نہ دیکھ سکوں۔ میں موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ میں جلد ہی سنبھل گیا۔ اس قسم کے خیالات اکثر انسان کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ میں نے ذہن سے بزدلانہ خیالات کو جھٹک دیا اور سنبھل کر

غار کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد میں غار کے منہ کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اچانک سانسوں کی آواز بند ہو گئی۔ ایک سر دہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کے خون کا ہر قطرہ جمہد ہو چکا ہے۔ فضا میں خاصی خشکی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد غار سے مجھے دوبارہ آسانی خراؤں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اسے میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ ان خراؤں کا مطلب تھا کہ وہ یہ خبر سو رہا ہے۔ میں دے دے پاؤں آگے بڑھا اور غار کے سینے کے پاس کھڑا ہو کر اندر جھانکنے لگا۔ اندر اندر غار میں نے نارنج کا مٹی دیا۔ راتقل پر فٹ کی ہوئی نارنج سے روشنی کی تیز لکیر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے کاغذ کر دیے۔ وہ باگ بن کر ترپنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد چمکارتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے بدحواسی میں بہت سے فائر جھوبک دیے۔ وہ مجھ سے دو تین قدم دور گرا اور چند لمحوں کے بعد غصہ ہو گیا۔ بندوق کی آواز سے تمام جنگل جاگ اٹھا تھا۔ پرندے شور مچا رہے تھے اور میرے سر پر پتھر گرا رہے تھے۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مشرق سے سرخی بندرتج بڑھ رہی تھی۔ ستارے نامہ پڑ رہے تھے۔ چاند کا حسن چمکا ہوا رہا تھا۔ کائنات کے خاموش وجود میں زندگی کے آمار نمودار ہو رہے تھے۔ میں فوراً وہیں گاؤں کی طرف پلٹا۔ گاؤں والے امید و بیم میں کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے جب انہیں سے خوشخبری سنائی تو انہوں نے خوشی سے مجھے نکھروں پر اٹھا لیا اور اچھلنے لگے۔ اس طرح پہاڑی گاؤں والوں کو خوفناک بلا سے نجات ملی۔



نہیدہ کوثر

ملکی عورت

”ارے وہ دیکھ“ ایک عورت نے اشارہ کیا۔ سب نے دیکھا ملکی عورت جسٹ لگا کر اس کیلپا میں چلی گئی جس کو خدلوں نے گھر رکھا تھا۔ ملکی عورت کے سامنے تو اس کا بھائی تھا۔ وہ آوازیں دے رہی تھی۔ ”برکت ٹوٹا ہوا ہے۔“

ایک عورت کی کہانی جس کے دوجوے سب تک تھے

”جب سے وہ اس بستی میں آئی ہے بستی پر معیتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔“ زلیخا نے دے دے لمحے میں حارجہ کے کان میں کہا۔ ”ہاں بچھ یوٹی لک ہے“ حارجہ نے تائید کی۔ ”صورت دیکھ کتنی معصوم اور بھولی بھالی ہے

لیکن حرکتیں دیکھ تو بے ڈوب“ زلیخا نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔
”کلیے کپڑوں میں ملیوں عورت نے ایک نظر ان دونوں کی طرف دوڑایا اور اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔“
”تاہم اس کا سائیں بہت عرصہ پہلے اس

کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
”قرب بھی ایک عورت نے کہا۔

”رب نواز کے گھر سارا دن کام کرتی ہے
اس نے ترس لھا کر ہی کیا اس کو دے دی ہے۔“

ایک اور عورت نے وضاحت کی۔
”توبہ تو یہ مجھے تو اس کے چہن بھی صحیح نہیں
لگتے۔“ سب عورتوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

سب عورتیں آہستہ آہستہ وہاں سے اٹھ کر
چلی گئیں۔ مگر عورت نے دروازے کی اوٹ سے
جھانک کر دیکھا۔ وہ اپنی کنیا سے باہر نکل آئی۔ وہ
کانی دیر وہاں بیٹھی رہی جہاں کچھ دیر قبل عورتیں
اس پر الزام تراشی کر رہی تھیں۔

وہ حق نواز کے گھر سارا دن کام کرتی اور کبھی
ممانی اس کنیا میں آکر سو جاتی۔ آج پہلی مرتبہ وہ
گھر سے باہر نکل کر اس میدان میں آ بیٹھی تھی
جہاں کام کارج سے فراغت کے بعد اکثر عورتیں
آکھٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ ان سب عورتوں سے
بہت ڈرتی تھی۔ ان کے طعنے اس کا کلیجہ چھلنی کر
دیتے تھے لہذا وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتی تھی۔

مگر عورت وہاں بیٹھی سوچ میں ڈوبی ہوئی
تھی وہ نو سال کی تھی کہ اس کی ماں مر گئی۔ ماں
کے مرنے کے بعد اس نے برکت کی ساری ذمہ
داری سنبھال لی۔ برکت اس کا چھوٹا بھائی تھا وہ
دن رات اس کی خدمت میں جتی رہتی۔

”ریشماں گڑیا سے کیلے گی“ اور اس نے
ہاں میں سر ہلا دیا۔

وہ برکت کو گود میں بٹھائے پر دین کی گڑیا
”کھیتی رہی۔ اسے احساس ہی نہ رہا اور سورج
غروب ہونے کو آگیا۔

”یہ تو یہاں کیا کر رہی ہے“ ابا نے کرخت
آواز میں کہا اور وہ بھائی کو اپنے وجود سے پلٹانے

اندرا آگئی۔ وہ ساری رات خواب میں پر دین کی
گڑیا سے کھیتی رہی۔

پھر ایک روز ابا ہتی دہن لے آیا۔ ریشماں کی
ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا۔ وہ ہر وقت ماں
کے حکم کی منتظر رہتی۔ اس پر بھی نئی ماں اسے
ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی۔ اسے نئی ماں بہت بُری
لگتی تھی۔

”اسے یہاں سے لے جاؤ۔“ ایک دن نئی
ماں نے اس کے بھائی کو پاؤں سے دھکیلتے ہوئے
کہا۔ اس کے اندر باغی ریشماں نے سر اٹھار اور
وہ دین کھڑی رہی۔

”تجھے ستانی نہیں دیا۔“ نئی ماں غصے سے
بولی۔ وہ بے دلی سے وہاں سے چلی آئی۔

اسے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب نئی ماں
نے ابا کے سامنے اسے برا بھلا کہا۔ وہ ساری
رات روتی رہی۔ وہ ابا کے دست شفقت کی منتظر
رہی لیکن ابا نے اس کے سر پر پھٹ بھرا ہاتھ نہ
رکھا۔ وہ اپنی ذات میں گہر ہو کر رہ گئی۔ نہ وہ اب
پر دین کے ساتھ گڑیوں سے کھیتی تھی اور نہ ہی کسی
سے بات کرتی تھی۔ اس کی زندگی میں وہ ساخنہ
بھی آگیا جس نے زندگی کے پتے صحرا میں اسے
باکل اٹلیا کر دیا۔ چھوٹے بھائی کو طیریا نے آگیا
اور وہ چند دن بیمار ہو کر مر گیا۔

”بھائی مر گیا۔“ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ
آیا۔

اب اسے نئی ماں کے ساتھ ساتھ ابا کے وجود
سے نفرت ہو گئی۔ اس کے دماغ نے ایک رات
تنگین فیصلہ کیا اور وہ اس گھر کو ہمیش کے لیے چھوڑ
آئی جہاں سے اب اسے خوف محسوس ہوا کرتا تھا
لیکن باہر کی دنیا میں ابا سے زیادہ خوفناک چہرے
والے مردوں نے اسے بھی ہوئی لڑکی بنا دیا۔

اسے مردوں سے نفرت ہو گئی۔
”یہ کھوئی آج باہر آکر بیٹھ گئی“ زینلہ کی آواز
پر وہ خیالوں سے لوٹ آئی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر
اپنے کپے میں اٹھ آگئی۔
”سارا غلہ اس سے بھگ ہے۔“ صغریٰ نے
کہا۔

باقی عورتوں نے بھی تائید کی جو آہستہ آہستہ
اس کے ارد گرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔

بستی میں بھی عجیب کھرام برپا تھا۔ سب عورتیں
آگے بڑھیں۔
”زینلہ کی کنیا میں آگ لگ گئی۔“ صغریٰ چیخ
رہی تھی۔

”بھرا چپے برکت“ زینلہ نے سینہ کو بی شروغ
کردی۔
”مجھے اندر جانے دو“ زینلہ نے بازو چھڑا کر
اندروں کی طرف بھاگنا چاہا۔

”بی بی صحت نہ کرو ابھی آگ بجھانے والا
ملکہ پہنچنے والا ہے۔“ ایک مرد نے اسے آگے
بڑھنے سے روک لیا۔
”کوئی میرے برکت کو بچائے۔“ زینلہ نے
دشست زدہ ہو کر کہا۔

”اڑو وہ دیکھ“ ایک عورت نے اشارہ کیا۔
سب نے دیکھا مگر عورت جنت لگا کر اس
کنیا میں چلی گئی جس کو شعلوں نے گھیر رکھا تھا۔
مگر عورت کے سامنے تو اس کا بھائی تھا۔ وہ
آواز میں دے رہی تھی۔

”برکت ٹو کہاں ہے۔“
چند ساتوں میں وہ اس بچے کو گود میں
چھپائے باہر نکل آئی۔ کنیا سے باہر آتے ہی وہ
زین پر گر گئی۔ سب اس کی طرف لپکے۔

زینلہ نے اس کی گود سے بچہ چھین لیا۔
”شکر ہے برکت صبح سلامت ہے۔“ وہ
روتے ہوئے بولی۔

”اسے تو دیکھو“ کسی نے کہا۔
اچانک سب کی نظریں مگر عورت کی طرف
اٹھ گئیں۔

”آف خدا یا“ ایک عورت کی چیخ کل گئی۔
مگر عورت کا جسم بری طرح جھس جکا تھا۔
سب عورتیں اس کے ارد گرد اکٹھی ہو گئیں۔
”برکت بچ گیا“ مگر عورت نے ہشکل کہا
اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

”ماں کیسی ہے ٹو“ برکت نے ماں کو
بازوؤں میں لے لیا۔

”ٹو ٹھیک ہے شہر میں تیری پڑھائی کیسی چاہے
رہی ہے۔“ زینلہ نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہے“ برکت نے کہا۔
وہ ماں کے ہمراہ اس گڈڑی پر ہولیا جو اس
کے گاؤں کی طرف جاتی تھی۔
کچھ ہی فاصلے پر زینلہ ڈک گئی۔

”ماں کیا ہوا“ برکت نے بازو سے پوچھا۔
”اوجھر آ جا“ وہ اسے بازو سے ٹھٹھکی ہوئی
ایک پرانی قبر کے پاس لے گئے۔

”ماں یہ کس کی قبر ہے؟“ برکت نے حیرانگی
سے پوچھا۔

زینلہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے
فاتحہ کے لیے ہاتھ پھیلا دیئے۔ زینلہ کے آنسو اس
کی ہتھیلیں کو بھگو رہے تھے۔ قریب ہی کھڑا ہوا
برکت حیرت سے ماں اور پرانی قبر کو دیکھ رہا تھا۔

شوکت افضل

کھلتی ہے آرزو کی کھلی

شوکت افضل صاحبہ سب معمول ایک اور یادگار تحریر قارئین کے لیے لائی ہیں جو انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے اور معاشرتی بلاؤں میں بہتری کا جذبہ بھی چمکاتی ہے۔ شوکت افضل کی زیر نظر تحریر ایک زندہ دل خوش گفتار لڑکی کی کہانی جس کی زندگی میں آنیوالے شیب و فراز اُسے اک عجیب دورا ہے پر لاکھڑا کرتے ہیں۔ زمانے کی چیرہ دستیوں اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹتی ہیں اور بھی انہوں کے بچھڑنے اور ذمہ داریوں کا طوق اس کی خوشیوں اور مزاج کی شکستگی کا قاتل بن جاتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے قارئین اُن کی اس تحریر کو بھی پذیرائی بخشیں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں گے۔

(ایڈیٹر)

جوہی پہلا عریضہ ختم ہوا اور پھر کلاس روم سے باہر نکل، شہر اپنی سیٹ پر سے ہرنی کی طرح ملاحج بھر کر یاسمین کے ڈیک کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جلدی سے بولی۔

”تم... تم یاسمین ہونا؟“ اور دیکھو! میں شہر ہوں۔ شہر تمہاری کلاس فیلو۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے نری سے دبا کر نہایت لاجب اور اشتیاق بھرے لہجے میں بولی:

یاد رکھا کرو سناؤ۔ جس وقت سے آئی ہوں ان کم بخت لڑکیوں سے تمہارے گانے کی تعریف سن سن کر میں تو آف بس تباہ ہی ہو کر رہ گئی ہوں۔

یاسمین نے جرت زدہ ہو کر شہر کو دیکھا جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھی لیکن کس طرح موقع محل سے

بے نیاز ہو کر غایت درجہ بے تکلفی برتتے ہوئے اس کے ڈیک پر ہاتھ ٹیکے اپنی پچھتی ہوئی مسکندہ دینے والی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جبکہ دوسرا عریضہ لینے کے لیے کسی بھی لمحے دوسری میڈم کلاس روم میں قدم رکھنے والی تھی۔

یاسمین کو تک تک دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق اپنے چہرے کی طرف دیکھتے یا کر خود ہی شہر سے کل ہی ہو کر اس کے ڈیک پر ایک ہاتھ سے تال دیتے ہوئے گفتگو کرتی گئی تھی۔ اس کی نظریں یاسمین کا چہرے کا طواف کرتے جا رہی تھیں اور وہ اپنے گول منہل سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے نہایت جذب و سرمستی کے عالم میں کوئی گیت مدہم مدہم لے میں الاپے جا رہی تھی۔ ادھر تمام کلاس ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں



وہ سمجھ گئی۔
 ”ہاں تو پھر یہ کونسا بت بھائی دل کو تیرے؟“
 یاسین جمل کرکتے ہوئے لہجہ میں بولی تو شمرہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتے ہوئے تسکین کر بولی۔
 ”ہیں؟“ وہ نہیں! اسے بھی یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ وہ تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ.....“
 وہ جھینپ کر کچھ کہتے ہوئے رگ گئی۔
 ”اب بات مت بناؤ ری بھیا۔ درنہ کچھ ڈالوں گی تمہاری چٹیا۔“ یاسین اس کی تان کی سی سواکر چٹیا کھانے بازو پر گئی مل دیتے ہوئے بولی۔
 ”ابھی اس دن بھی تم کہہ رہی تھیں کہ میری ای کہتی ہیں مجھے تو نعمر چھوٹی چھوٹی دینیں اچھی لگتی ہیں جن کو خاندان دھڑ چاہے موز لے، چٹکی بزر شاخ کی طرح۔ زیادہ عمر کی لڑکیاں تو سو گئی ہوتی بن جاتی ہیں جس کو جھکاؤ تو جھکنے کی بجائے جج کر ٹوٹ جاتی ہیں۔ بی بی رانی تمہارے تیر بھی ٹھیک نظر نہیں آتے..... ٹھیک ہے کہ لڑا شادی..... کون روکا ہے تمہیں، اکیلا چھوڑ جاؤ گی تو ہم بھی مر نہ جائیں گے اک تمہارے بغیر۔“ یاسین نے بی سے خنڈا سانس بھر کر بولی۔
 ”اے میری جان یا یسین، کیسے چھوڑ سکتی ہوں تمہیں۔ یہ وعدہ کیا ہی رہے گا کہ انھیں ہی بار تیں آئیں گی دونوں کی۔“ ڈن! لاؤ ہاتھ لاؤ۔“ شمرہ نے ہاتھ پڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”دو خس خوشی میں؟“ یاسین نے بدستور ٹھٹکی سے ٹنگ اس کے اپنے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔
 ”اسی خوشی میں!“ شمرہ نے زبردستی یاسین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں دے ہاتھ سے اپنی حواسی لگائیں یا یسین کی آنکھوں میں گڑاتے ہوئے کہا تو اس نے لاجواب ہی ہو کر اپنے سونے کی لڑیوں جیسے دانت چکا دیئے۔

اب تو وہ اپنے لباس کا بھی خیال رکھی۔ بڑی جان لیوا قسم کی خوشبو اس کے آس پاس اڑتی رہتی۔ اس کے کان کی چار دیواری میں قدم رکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کتنی فحش ہے۔ وہ سکول بس سے اتر کر اندر چلتی ہے یسین فرامیج مار کر کسی نئی سنوری خود لڑکی پر آواز دے گی، دور سے اس کے تازی بخش قہقہے سنائی دیتے اور ہر طبقہ ہر خیال سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں، جن کو اس کا انتظار سا ہوتا، مڑ مڑ کر اس کو دیکھتیں اور جب وہ چلتی ملتی، اٹھ کھڑی ہوتی، بھار کے اولیں شکار بھوکے کی طرح ان کے قریب سے گزرتی تو وہ نہایت دلچسپی اور پیار سے اس زندہ دلی کے پیکر کو لطف اندوز ہوتے دلی نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھتیں۔ اس کی مرغزائیں مرغ طبیعت نے سب کے دل موہ رکھے تھے۔ سب کے دل میں اس کے لیے انجانا سا انتظار رہتا۔
 اور پھر اچانک ایک دن شمرہ کا جج نہ آئی۔ اس کی بس کی لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ اس کے والد کا ایکسینٹ فٹ ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال میں دم توڑ گئے ہیں اور اب ان کی میت ان کے گاؤں لے گئے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد شمرہ کا جج آئی تو تمام لڑکیوں نے اسے گھیر لیا اور انھیں کرنے لگیں مگر وہ خاموشی سے آسو بھاری رہی۔ خالی حیرت میں وہ اسی طرح یا یسین کے ساتھ درختوں کے تنج میں گھرے تنج پر جا بیٹھی۔ مگر لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود یا یسین اس کا غم دور نہ کر سکی۔
 ”میرا جی چاہتا ہے، میں بھی چکھو کہ سرور ہوں یا یسین..... جیسے میرے ابو قبر میں جا کر سوئے ہیں۔ وہ تو میری کل کا نانا تھے۔ ان کے بغیر تو بالکل جھل دست ہو کر رہ گئی ہوں۔ میں تو اپنے ابو کے سہارے ہی زندہ بھی یا یسین۔ اب میں کس سے فریاد کروں کہ میرے ابو لوٹ آئیں۔ ہائے ابدا میں آپ کو کہاں تلاش کروں۔ کہاں جاؤں کیا کروں؟“ یہ کہتے کہتے شمرہ کے دل سے اٹھنے والے غم کے بگولوں نے اس کے منہ سے بندن توڑ دیئے اور وہ لہجوں سے رونے لگی..... ”ابو چلے گئے۔ یا یسین ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ میں یہاں آرام سے بیٹھی ہوں اور وہ منوں مٹی کے تیلے ہے۔ بس اور اکیلے پڑے ہیں۔“ یکدم شمرہ ایسے خرنے لگی جیسے اسے آگ کے شعلوں نے اپنے خرنے میں لے لیا ہو۔ یا یسین نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور پھر یا یسین کے بھی آسو بہنے لگے۔ وہ ابھٹکی سے شمرہ کو سرسہلائی اور رہ رہی۔
 دن گزرتے دن گزرتے ایک شمرہ وہ پہلی شمرہ نہ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پہلی شمرہ وہیں کہیں اپنے ابو کے پاس پیچھے ہی چھوڑ آئی ہے۔ وہ تو شاید کوئی اور ہی چٹکی روح تھی جس نے پہلے شمرہ کے جگر میں پناہ لے رکھی تھی۔ اب تو کسی کو شمرہ کے نہ وہ خوش باش و چست فہرے اور خشک سانی ڈنڈی اور نہ ہی اس کے ٹھٹکے ہوئے قہقہے کا جج کی چار دیواری میں کو جج۔ اب تو اس کے مدھ بھرے کیتوں کے لیے لڑکیوں کے کان ترس ہی گئے تھے۔
 باپ کی بے وقت موت نے شمرہ کو عمر سے پہلے ہی بے حد تنہا بنا دیا تھا کیونکہ اب اسے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ گھر میں تمام بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ تین بہنیں تھیں اور دو کسن بھائی تھے۔ سب میں بڑی ہونے کی وجہ سے وہ ماں کے زیادہ قریب آگئی۔ وہی شمرہ کی اسی جاس کی جلد شادی کر دینے کے خواب دیکھ رہی تھی اب سہارے کے لیے شمرہ کی مرہون مت تھی۔ شمرہ کا باپ ایک قناعت پسند اور صابر شاکر قسم کا آدمی تھا جس نے بھی اپنے موجودہ حالات کے خول سے نکل کر اوپر جانے کی خواہش یا کوشش نہ کی۔ وہ زیادہ

ہاتھ پاؤں مار کر دولت سمیٹنے کا قائل ہی نہ تھا۔ جو عزت سے مل جاتا اسی کو نصیبت جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کے دوسرے لوگوں نے وقت کا ساتھ دے کر بہتی لگاکا میں ہاتھ دھوئے مکرشمسہ کے باپ نے کسی جھوٹے تعلیم (Claim) کے سہارے نہ تو جائیداد بنائی نہ ہی اپنے چھ بچوں کے لیے لمبا چوڑا بینک ٹیلیٹ چھوڑا۔

شمسہ کا خاندان کافی اونچا اور جدی پشتی شرفا میں سے تھا۔ وقتی طور پر کبھی رشتہ داروں نے ہمدردیاں دکھائیں مگر ان ماں بیٹیوں کو پتہ تھا کہ زندگی بھر کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ شمسہ نے خودداری اور نجابت کا ورثہ اپنے آباؤ اجداد سے پایا تھا اور قدرت نے اسے ذہانت کے زیور سے آراستہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا عزم کر لیا اور پھر اس نے خود کو نئے حالات کے سانچے میں ڈھال کر خود کو پڑھائی میں گم کر دیا کیونکہ اس کے خیال میں تعلیم اور صرف تعلیم ہی ایک ایسا سہارا تھا جو آگے چل کر جلد ہی اس کے گھریلو مسائل کا ایک آسودہ حل ہو سکتا تھا اور وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی سرپرستی کر سکتی تھی۔

زندگی نے شمسہ ایسی جذباتی اور زندہ دل لڑکی سے کیسا مذاق کیا تھا۔ دنیا کی رعنائیاں حسب سابق اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں مگر اس کے لیے اب زندگی محض جدوجہد اور ملل کا نام بن کر رہ گئی تھی۔ اس کی دوست یا بہنیں جو کہ پہلے پہل شمسہ کے منہ سے اس کی شادی کے پیغامات کا نام سن کر ہی جل کر کونکھ ہو جایا کرتی تھی اب اپنے آنے والے پیغامات کی بات شمسہ سے چھپا جاتی۔ ان دونوں نے تو ساتھ ساتھ شادی کرنے کا عہد کر رکھا تھا اور جبکہ یہ عہد اب پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا تو یا بہنیں خود کو شمسہ کے سامنے مجرم محسوس کرتی تھی۔ شمسہ کی

سب شوخیاں تو اپنے ابو کے دم قدم سے تھیں۔ وہ اس کے سر پر سایہ دار شجر کی طرح قائم تھے اور اب جب سے یہ سایہ اٹھ گیا تھا، شمسہ کی زندگی تو محض ایک تپتے ہوئے ریگستان کی مانند تھی۔ چنانچہ شمسہ کو بھی اور کالج کی باقی لڑکیوں کو بھی پتہ ہی چلا تھا جب یا بہنیں کے شادی کے دعوتی کارڈز کالج میں تقسیم ہونے لگے۔

شمسہ نے نہایت مہر اور سکون سے یا بہنیں کے شگن مٹائے، اپنے ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی، دلن بنایا اور خشک آنکھوں سے دھڑکتے سینے سے لگا کر اسے رخصت کیا۔ یا بہنیں رونے لگیں مستقبل کے موہم خواب آنکھوں میں سائے بیا کے دیں سدھار گئی اور پھر ان سہیلیوں کے درمیان کچھ عرصہ ملاقات کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہی رہ گیا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ایک ساتھ کھلی ہوئی سہیلیاں بیاہ ہو جانے کے بعد اور کبھی کے مسافر کنارے گلنے کے بعد قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ خطوط کے ذریعے ہی یا بہنیں کو معلوم ہوتا کہ اب شمسہ اپنے ذہن کے وہ در پتے بند کر چکی ہے جہاں سے ماضی کی مسکراتی رنگ تصویریں بھاروں کی پر چھائیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے ماضی کے شیش بھالحات کی یاد کو کسی بے حد معمول چیز کی طرح دل کے دور دراز کونوں میں قید کر کے رکھ دیا ہے تاکہ وہ پھر یہ حسرت و زکرا سے اپنے مقصد سے دور نہ کریں۔ اب وہ اپنی تحریروں میں ایک جذباتی و شیرازہ نظر نہ آنی تھی بلکہ ایسے معلوم ہوتا جیسے اسے اندر ماما کا نور روشن ہے۔ وہ چھوٹے بہن بھائیوں کو ماں سے کم نہ جانتی تھی اور ان کے مستقبل کے لیے اتنی فکر مند رہتی تھی کہ ان کی نگہداشت میں اپنے آپ کو بیکسر بھلائے بیٹھی تھی۔

بی اے کرنے کے بعد ٹریننگ لے کر شمسہ نے

دس و تدرس کا پیش اپنا لیا کیونکہ جلد سے جلد اس کے اختیار میں یہی بات تھی جس سے وہ معاشی طور پر بالکل بھی دست ہونے سے پہلے پہلے تو قفل ہو سکتی تھی۔ اب تک تو انٹرنس پالیسی اور پرائیویٹ فئز نے کافی ساتھ نبھایا تھا۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی مزید تعلیم بھی پرائیویٹ طور پر جاری رکھی اور پھر چند سالہ تجربے کے بعد اسے ایک سرکاری جوینر سکول کی پرنسپل بنا دیا گیا اور یہ اس کی عملی مہارت اور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت اور انعام تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے اتنے عمارت طے کر لیے۔ اس دوران اس کی ایک چھوٹی بہن کی شادی ہو گئی اور دوسری بہن بھی کوالیفائیڈ ہو کر لوکل باؤنڈ کے آفس میں ڈیوٹی پلٹ آفیسر کی پوسٹ پر لگ گئی۔ چھوٹے دو بھائی اب مختلف درجوں میں پڑھ رہے تھے۔

انسان معاشی مسائل سے دوچار ہوتا دینا میں جیسے اکیلا رہ جاتا ہے۔ ہر چیز ہنگامی اور بے روش نظر آتی ہے لیکن اب جا کر جو شہر نے آسودگی کا سانس لیا اور جس خول میں وہ کئی سالوں سے دبکی ہوئی تھی اس خول سے قدرے سر نکال کر بار بار جھانکنا تو دنیا سے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔ وہ تو بدصورتی میں سے بھی حسن تلاش کر لیتی اور قبول اس کے یہ دینا تو ہمیشہ سے پیارے پیارے لوگوں اور

پیاری پیاری حسین چیزوں سے بھری ہوئی ہے۔ اصلی فطرت کو انسان جتنا بھی دبا کر اس پر مصنوعی خول چڑھا دے وہ سامنے آنے سے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ ذرا سی شہد پاتے ہی شہر کا پرانا ذوق لطیف پھر ایک بار انگڑائی لے کر بیدار ہوا۔ اب جب بھی یاسین سیکے آتی اس کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ کا دکاتشیز پر چل جاتی۔

اور آج وہ ایک شاعرے میں فیض ملک کے مشہور جوان خورشاعر طارق کا کلام سن رہی تھی۔ طارق اپنی خوبصورت آواز میں ترنم سے شہر سناتے ہوئے فضا میں ایک بحر مہر روایت بکیر رہا تھا۔ یاسین بار بار بکھریوں سے شہر کو دیکھے جا رہی تھی جس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی ساری کی ساری روح سچ کر اس کے کانوں اور اس کی آنکھوں میں ساہمی ہو۔ شہر کا چہرہ وہ قدر جذبات سے تیتھرا رہا تھا اور آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ یوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ لیے وہ طارق کو جیسے بلک جھپکے بغیر دیکھ رہی تھی۔ قریب ہی کوئی صاحب بیٹھے اپنی بھاری بدست آواز میں بار بار داد دیتے ہوئے اس طرح داغ داغ (واہ واہ) کہتے، جس طرح کوئی کتا تیندھ میں بھونک رہا ہو۔ یاسین بار بار فنی ضبط کرتے ہوئے شہر کی توجہ اس کی طرف دلاتی مگر وہ تو جیسے گرد و پیش سے بے نیاز ایک ہی چہرے اور ایک ہی آواز میں گم تھی۔

غزل ختم ہوئی اور تالیوں کی زبردست گونج جوبھی اسے ہوش و حواس کی منزل پر لاتی اس کے لبوں سے یہ فقرہ پھل پھوٹا۔

”اُف جاہ کر دیا بخت نے۔“

اور یاسین کی بے اختیار فنی گئی تھی۔

مشاعرہ ختم ہوتے ہی لڑکے لڑکیوں نے طارق کو آؤ گراف کے لیے اپنے ترنم میں لے لیا۔ شہر بھی ادھر ہی کو لپک کر اسے رش میں طارق تک پہنچنا محال تھا۔ آخر یاسین نے شہر کا ہاتھ چکرایا۔

”اب واپس چلو شہر..... پھر سکی۔ یہاں تو ہماری دال تھی نظر نہیں آتی اور منارو رہا ہوگا۔“ اس نے کہی۔

شہر نے اس طرح چمک کر یاسین کو دیکھا جیسے اس کی آنکھیں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چل تو دی لیکن اس کی

چال سے مطمئن ہوتا تھا جیسے وہ تیندھ میں چل رہی ہو۔ اس رات شہر کو دیر تک تیندھ نہ آئی۔ اسے اس شاعر طارق کا کلام بے حد پسند تھا اور اس کے پاس اس کے چند مجموعہ کلام بھی تھے لیکن آج اسے پہلی دفعہ نفس و فیس دیکھنے کے بعد وہ بری طرح اس کے دل و دماغ پر چھا کر رہ گیا تھا۔ اس کے مجموعہ کلام کو سننے پر گھر کے دو بھائی نے کتنی دیر پورے چاند کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کے بارے میں یہ سوچیں رہی۔

”کیا وہ کسی اس وقت چاند کو دیکھ رہا ہوگا۔“ طرح طرح کے رنگین خیالات اسے خوابوں کے ان دیکھے جڑوں میں لیے لیے بھر رہے اور پھر شہر کے شوق کی دنیا اس کی بدلی کردہ ہر دم طارق کے بارے میں سوچتی رہتی۔ آخر اس کے دل نے صلاح دی کہ طارق کو کھل لکھے۔ راتوں کو وہ کتنی کتنی دیر تک ٹیلیپ جلا کر غلوڑی سٹے ہاتھ لٹکائے سوچ سوچ کر کچھ طارق کے نام لکھی مگر پھر پاؤ ڈالتی۔ آخر کار تھک کر بستر پر جا گرتی اور سو جاتی۔ گڑیا کی طرح پلکوں کو زخار پر مگراتے اٹھاتے ہوئے نہایت دل سوز لے میں اس کے شہر گنگنائی رہتی۔

اور پھر ایک دن وہ دل و جان میں آ کر جانے والی ایک نازک سی تحریر لکھ کر پوسٹ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

طارق کا تعلق ایک نہایت خوشحال گھرانے سے تھا۔ اس کے پاس اعلیٰ تعلیم ڈگریں تھیں اور ایک اعلیٰ گریڈ پوسٹ پر فائز بھی لیکن طبیعت میں مزاج، ذہن اور دور رس روایت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور پھر اسے شاعر بنانے میں ذہانت اور غیر معمولی حافظہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ دنیا کی ہر خوبصورت چیز اسے متاثر کرتی۔ حسین نظارے، حسین چہرے اس کے خیال میں ایک تاقابلہ

بیان کی کیفیت پیدا کر دیتے اور یہی کیفیت اس کے شاہکار شعروں میں ڈھلنے کا باعث بنتی۔ والدین، بہنوں اور دوستوں کے والدہانہ چارنے اسے احساس تقاض میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس کی معمولی سی مزاحیہ بات کو بھی اس قدر سراہا جاتا، اتنی اہمیت دی جاتی کہ وہ خود پسند ہو کر رہ گیا۔

وہ معمولی اور محسوس کی جان تھا اور صورت شکل بھی خدا نے خوب بنائی تھی..... لڑکیاں تو ویسے بھی اس کی مردانہ جاذب شخصیت سے متاثر رہتی تھیں مگر اس کے معیار پر کوئی پوری نہ آ سکتی۔ جب بھی کوئی اس کی فنی چھٹی پاؤہ مشاعرے میں نظر عام پر آتا اس کی مداح لڑکیوں کے خطوط کے ڈھیر لگ جاتے۔ اب وہ شادی کی عمر پر آچکا تھا۔ مگر ماں، بہنوں کے اصرار کے باوجود اپنے ذہن کو شادی کے نقطہ پر مرکوز نہ کر پاتا۔

شہر کا خط کھولتے ہی طارق نے جیسے آگہی کا ساواں آسمان چھو لیا۔ وہ نازک سی تحریر ایک تیر تیر کش کی طرح اس کے جگر میں ترازو ہو کر رہ گئی۔ اس نے بے تابی سے خط کو الٹ پلٹ کر لکھنے والی کا

اتہ پتہ ڈھونڈا مگر پائی ہوئی۔ داد بیدا بن گئی۔ ہزار چا کر خط کا جواب دے، کوئی ملاقات ہو، کوئی بات ہو مگر بات نہ بن سکی۔ چنانچہ ہر غزل دل بے زبان بن گئی۔ داد و تحسین کے ڈوگرے برستے رہے مگر وہ تحریر جس کو کھڑے ترنم بھی پھر نظر نہ آتی۔ طارق کی تمام زندہ دلی ہوا ہو کر رہ گئی اور ایک ہی وطن ذہن میں سا گئی۔ اس ایک خط نے اس کی پرسکون زندگی کے سارے نظم و ضبط کا شیرازہ بکیر کر رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی اب تک اپنے مرغوب ترین مشاغل اور معمولات کے نیچے تنہا انداز میں بڑے سکون و طمانیت سے گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں وہ سب کچھ تھا جس کا انسان اپنے حال یا مستقبل کے

لیے تصور کر سکتا تھا شرمسہ کی تحریر ایک طوفانِ بلا تھی ثابت ہوئی جس نے اس کا سب کچھ تہہ بالا کر کے رکھ دیا۔ وہ دن بدن اس کے خیال میں دنیا و دنیا میں سے بچا نہ ہوتا گیا۔ زندگی اور دوری نظر آنے لگی۔

میں طارق تھا کہ جیسے ہی وہ خاندان کے کسی نقشہ میں جا چکا، کزنز کی بیویاں اسے دیکھتے ہی پہلو بدلتے اور کسے لکھتیں اور اس میں دھجکی لینے والی نظروں سے دیکھتیں۔ طارق ان کے وہ لے لیتا کہ وہ کانوں تک سرخ ہو جاتا۔ اسے چھپڑا، اسے طنز کے تیر، لڑائیوں، بالیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکنے لگتے اور وہ آپس میں کھسک پھسک کرنے لگ جاتیں۔ کوئی بھابھی چھپڑتی۔

”ارے طارق بھائی! کر لو تا تم بھی شادی، کیوں نہیں کر لیتے شادی؟“

”ارے بھئی کرتا کیوں نہیں شادی۔ کوئی کروائے تو کروں تا شادی۔“ وہ مصروفی بخندنی آہ بھرتے ہوئے سینے پر ہاتھ باندھ کر کہتا۔

”تو پھر ہم ہی ڈھونڈیں تمہارے لیے کوئی؟“ وہ کہتیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں، مگر اتنا نہیں رہے۔“

ادھر زمر کی ہنسی عورت ہو۔ صدم و صلوٰۃ کی پابند اور ایماندار ہو، چور چکار نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ میں دھڑے سے والیں آؤں تو آگے سے گھر کا صفایا۔ طارق دونوں ہاتھ پھیلا کر کہتا۔

”اور ہاں یہ دھیان بھی ضرور رکھنا۔ آگے جیسے کوئی نہ ہو۔ تاکہ چھ دن تو تسلی رہے۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہتا۔

”ارے ارے یہ تم اپنی بیوی کا نقشہ کھینچ رہے ہو یا ملازمہ کا؟“ کرن بائی قہقہہ مار کر ہنس پڑتی۔

”یہ تو اس دن تمہاری امی مجھے ملازمہ کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ ایسی کوئی عورت نظر میں ہو تو

میری طرف بھیج دینا کیونکہ میری نوکرائی چلی گئی ہے۔“

ساری محفل ہنسنے لگ جاتی اور وہ منہ پکا کئے مردوں کے پاس جا بیٹھتا لیکن اس وہی طارق تھا کہ محفلوں میں بھی کھو گیا کھو یا رہتا۔ یہی نہیں تو اس کا اثر اس کی افسرانہ کارکردگی پر بھی پڑنے لگا۔ توجہ اور یکسوئی جس سے وہ دفتری امور سر انجام دیتا تھا، آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی۔ وہ فون پر بھی بات کرتے کرتے ہانسنے پھنسنے میں اور قصور میں اس طرح گم ہو جاتا کہ بعض دفعہ اپنی اس خود فراموشی پر خود ہی حیران رہ جاتا۔ وہ اکثر راتوں کو چونک چونک کر اٹھتا اور آہ بھر کر قلم کاغذ پر لکھنے بیٹھ جاتا۔

”کیا خبری ایسے موسم بھی آئیں گے خیند کی پریاں اڑ جائیں گی خواب سہانے ٹھکر جائیں گے وقت کا دھارا بہتا رہا۔ آج پھر وہ رنگین قلموں سے راستہ بچ کر مایک کے سامنے اسنے دل سوختہ کی آواز فضا میں بکھیر رہا تھا۔ آج وہ شرمسہ کے شہر میں دوبارہ آیا تھا۔ شرمسہ کے خط والے لاف پر لگے ٹکٹ کو غور غور سے دیکھنے کے بعد جو نام اس کی سمجھ میں آیا تھا وہ یہ کہ وہ اسے شہر سے آیا تھا اور اس کے دل کو ایک بے نام سی گئی تھی کہ اس کے دل کی آواز آج ضرور اس تک پہنچے گی۔ وہ بے تابی سے بھرے پینڈال کی طرف بار بار نگاہیں دوڑاتا تھا۔ اس کی خوبصورت وافر وہ آنکھیں بار بار شرمسہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے جسم کا ایک ایک قطرہ خون شرمسہ پکارا تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے شرمسہ کی صدا اڑ رہی تھی۔ وہی اس کا دروخی، وہی اس کا درواں تھی۔ طارق کی روح پکار رہی تھی۔

”تم میری رگ چاں سے بھی قریب ہو کر مجھ سے کس قدر دور ہو شرمسہ! کیا میں تمہارے شہر سے

ناکام و نامراد ہی چلا جاؤں گا؟ کیا یہ چٹائی کے کانٹے جو میری روح میں کسب کیے ہیں بھی پھول نہ بن سکیں گے؟“ اس کی آواز میں آنسو اور سسکیاں مستور تھیں۔ شرمسہ بھی وہیں موجود تھی لیکن وہ یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ سب کچھ طارق اسے ہی مخاطب کر کے کہہ رہا ہے۔ وہ تو ویسے بھی اس کی شیدائی تھی۔ اس کا دھان دھان آنکھیں بین گئی تھیں جن کے راستے وہ اپنے شاعرانہ اپنے محبوب طارق کو اپنے آپ میں سمولینا چاہتی تھی۔

آج وہ اکیلی آئی تھی اور یہ عزم کر کے ہی آئی تھی کہ طارق سے ملے بغیر نہ جائے گی۔ جب اس کے دھواں کی بھیڑ چھٹ گئی تو وہ چائے کی میز پر اسے اکیلا پا کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور آؤ گراف یک اس کے سامنے پڑھا کر بولی۔

”میرا نام شرمسہ ہے، بی! اور میں آپ کی پرانی دھاب ہوں۔“

جوہنی طارق نے نظر اٹھا کر شرمسہ کی طرف دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا ہو۔ چائے کی چٹائی اس کے ہاتھ سے گرے گئی۔ اس کی آنکھیں بھٹی بھٹی ہوئی تھیں دوپارہ بچنے لگی۔

”الہ! تو اپنی تحریر سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔“ طارق دہرایا ہو پڑا۔

”الہ! طرف وارانہ کنگلی باغ سے دیکھ کر شرمسہ کھرا کر گلیں بھمکے لگی۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ شرمسہ! کہیں اور بتاؤ کہاں لوگی؟“ وہ سرگوشی میں انتہائی بے قراری سے پوچھا۔

”ملائی پلو..... پلیز!“

شرمسہ نے فروں سی ہو کر کرائی پر س کھولا اور رز زلے ہوئے ہاتھوں سے اپنے گھر کا ایڈریس والا ایک پتانا

لفافہ نکال کر اسے چھپا دیا اور بولا۔

”آپ اس ایڈریس پر میرے گھر چلے آئیے گا۔ کل کبھی وقت..... میں انتظار کروں گی۔“

دوسرے دن چھٹی تھی۔ شرمسہ زرا دیر سے اٹھی تھی۔ ہاتھ روم سے نہا کر نکلی ہی تھی کہ دروازے کی کھنکھنی بجی۔ اس کا دل دھڑک اٹھا اور وہ تیری کی طرح لپکی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی طارق کھڑا تھا۔ اس کے بے چین چہرے میں ایک تیر! وہ اسے اندر لے آئی محفل کے بعد گلابی رنگ کے جوڑے میں وہ خود بھی جسم ایک تہ و تازہ گلاب نظر آ رہی تھی۔ چنچہ پر گیلے سیاہ بالوں کے روشنی پھولوں کا ایک الجھا ہوا ڈھیر پڑا تھا جس میں سے پانی کے قطرے شبنم کی طرح ٹپک رہے تھے۔ طارق نے ان بالوں کی حیران کن لمبائی کو دھجکی سے دیکھا۔ اب تک طارق نے سینکڑوں چہرے دیکھے تھے جو سن کا شکار رہوں گے لیکن اس لڑکی کا اعجاز ہی نرالا تھا جس کی تحریر نے ہی معنائیں کی طرح طارق کو اس کے خول سے باہر نکھلا تھا۔ اس کی سادگی میں، اس کے ہر انداز، ہر گھٹن میں..... اس کی سرشت، اس کی حسانت میں، اس کی سمرات، اس کی گفتگو میں اسے وہی لڑکی نظر آ رہی تھی جس کی تلاش میں آج تک اس نے کئی قریب آئی ہوئی ٹوئیکوں کو ٹھکرایا تھا۔ اسے دیکھ کر طارق کو یوں محسوس ہوا جیسے قدرت نے اسے صبر کا خضاب چھل عطا کیا ہے اور اس کی عمر بھی تلاش آج مکمل ہو گئی ہے۔

”اوہ! تم اتنا عمدہ مجھ سے کیوں چھپی رہیں؟“ طارق نے بے تابی سے کہا۔

”محفل.....“ شرمسہ چھلکاتی آنکھوں سے شرمیں سمرات ہونے والے ہونٹوں پر اٹھی رہ کر بولی۔

سامنے بیٹھی شرمسہ کو طارق نہایت دھڑکی سے سستی ہی دھیر دیکھا اور وہ سرخ ہو کر پسینے پسینے ہوتی

”اوہ میں سمجھ گئی۔“ شمسہ کچھ سکرا کر بولی۔
”لیکن میں کیا سمجھوں، جناب عالی؟“ طارق
نے ذرا جھک کر کہا۔

”بس سمجھ لیجئے، جو دل میں آئے۔“ شمسہ
قدرے شوقی سے بولی۔

”دل کی کیا بات کرنی ہو تم، یہ تو دیوانہ ہے۔“
طارق نے قدرے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ”تم
بتاؤ نا.....؟“

طارق کی اس بات پر شمسہ ایک نثری گھنٹیوں کی
سی ہنسی ہنس پڑی اور پھر شرما کر سرخ ہوتے ہوئے
بولی۔

”آف! میں نے کہہ جو دیا۔ جو جی میں آئے
سمجھ لیجئے۔“ شمسہ نے پچھلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر
کہا۔

”پھر پتہ ہے، میرے جی میں کیا آتا ہے؟“
طارق اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا آتا ہے؟“ شمسہ کچھ شرما کر کچھ خوفزدہ سی
ہو کر بولی۔

”میرا جی یہ چاہتا ہے کہ میں تمام زندگی
تمہارے شانوں پر بٹھری ہوئی ان سیارہ گھٹاؤں کی رم
جسم میں بھیکے ہوئے گزار دوں۔“ طارق نے قریب
آ کر شمسہ کی طرف جھکتے ہوئے انگلی سے اس کے
بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”آپ بڑے خراب ہیں۔“ شمسہ ناز سے اٹھلا
کر بولی۔

”میں بے تکلفی کی معافی چاہتا ہوں شمسہ لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ بیٹے تمہارے میں سے وہی لمحے اپنے
ہیں جو اپنے پیاروں کے کس سے آشنا ہوں۔“ وہ
سر آدھ پھر کر بولا۔

”زندگی بڑی ظالم شے ہے شمسہ۔ اسے کسی نہ
کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اگر انسان

رہی اسے میں شمسہ کی چھوٹی بہن سیارہ کولڈ ڈرنک
کے دو گلاس ٹرے میں رکھے اندر آئی اور قریبی میز پر
رکھ کر چلی گئی۔

”لیجئے نا۔“ شمسہ ان نگاہوں کی تپش سے
گھبراتے ہوئے بولی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے۔ کیا میں کوئی
عجائب گھر کی چیز ہوں؟“

”دراصل مجھے یقین نہیں آ رہا کہ بیچ بچ تم ہی
میرے سامنے ہو۔ میں تو راتوں کی سلیٹی تنہائیوں
میں جاگ جاگ کر کہا کرتا تھا۔

۔ کا کا سب تن کھائیو، چن چن کھائیو ماس
دو دنیاں مت کھائیو، انہیں بیا ملن کی آس
شمسہ کے سینے میں ایک نئے احساس کی دکھ
بھری ٹیس سی اٹھی اور اس کے تن بدن کو جھنجھوڑ گئی،
دل نے جیسے ٹھوکر کھائی ہو۔ اس کی آنکھوں میں
شدت جذبات سے آنسو آگئے جنہیں شعور نے
پلکوں کی دہلیز پر ہی روک لیا مگر اس نے اپنا ہونٹ
کاٹ لیا۔ طارق کٹکھینوں سے شمسہ کے ردعمل کو دیکھ
رہا تھا۔ اس سے شمسہ کی یہ کیفیت چھپی نہ رہی۔ وہ
مضطرب سا ہو گیا۔ اس کے دل میں ایک دوسو سے
نے سر اٹھایا اور پھر کسی ان دیکھی قوت نے اس کے
کانوں میں سرگوشی کی۔

”کیا یہ کسی اور سے وابستہ تو نہیں ہو چکی؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہیں انجانے میں میں نے
تمہاری ذات سے کچھ غلط توقعات تو نہیں وابستہ کر
لیں؟“ طارق نے جھپکتے ہوئے شمسہ کو مخاطب کیا۔

”کیا مطلب؟“ شمسہ خشک گلے سے آنسوؤں
کا گھونٹ نکل کر بولی۔

”بعض باتیں خود بخود ہی سمجھ جانے کی ہوتی
ہیں۔ وہ کہی نہیں جاتیں۔ اس طرح انکا حسن کھوجا جاتا
ہے۔“ طارق سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے بولا۔

بارت کی۔ طارق نے اپنے تمام خاندان اور گھر والوں کے بارے میں بتایا اور شہر نے اپنے تمام حالات بلا کم و کاست طارق کو بتائے۔ یونہی باتیں کرتے کرتے طارق نے شہر سے کہا۔

”شہر ایک بات بتاؤ۔ تم جو اس طرح میرے ساتھ چلی آئی ہو اگر میں کوئی بہرہ و پیاپی ہوتا تو پھر کیا ہوتا؟“

”کیا مطلب؟“ شہر زبردستی بولی۔

”یعنی اگر میں کوئی بُرا آدمی ہوتا۔ ارے یہی منہ کھولے میری طرف کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میری بات کی سمجھ نہیں آ رہی؟ دیکھو میں اصل میں ڈریکولا ہوں اور اب اس وقت انسانی روپ بدل کر تمہیں بھلا کر ساتھ لے آیا ہوں۔ اور اب بڑے مزے مزے سے تمہاری سرسری راج جس کی سی گردن میں دانت کاڑھ کر تمہارا بیٹھا بیٹھا گرم خون پینے والا ہوں۔“ طارق نے لکھنت دونوں ہاتھوں کے نیچے اوپر اٹھائے۔ دانت کھوسے اور منہ سے خوفناک آواز نکالتے ہوئے جھپٹ کر شہر کو کندھوں سے پکڑ لیا اور اس کی گردن کی طرف منہ بڑھانے لگا۔ شہر کی چیخ نکلی لیکن اسے اور وہ اپنی پوری قوت سے اس کی گرفت سے نکل بھاگی اور فدرے دور جا کر دوسرے پتھر پر جا بیٹھی۔ طارق نہایت گفتگو سے قہقہے لگنے لگا۔

”ڈریکولینا۔ بس یہی ساری بات تھی۔ ارے آ جاؤ کچھ نہیں کہتا۔“ طارق نے اسے بلایا۔

”اوں ہوں۔ نہیں آئی۔ آپ کہا جائیں گے۔“

شہر نے ناراضگی سے کہا۔

”ارے یہی نہیں سمجھ لکھا تا۔ بگلی دیکھو۔ میں بالکل بندہ ہوں۔ کچھ اور نہیں ہوں۔“

وہ آہستہ سے اس کے پاس جا کر بیٹھا اور شہر نے عظام ہی ہو کر طارق کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ وہاں مدھم گیتوں کی گونج تھی اور دکت کی

دیکھا وہ وہ تو ایسا آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، طارق صاحب! جھوٹ کے بادل جگ کے سورج کو ہمیشہ چھپا کر نہیں رکھتے۔ یہی مذہبی توجہ ظاہر ہو رہی جاتا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نہایت کی راہ ہمیشہ جگ بولنے میں ہی ملتی ہے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں یونہی الہی البرہی کی وجہ سے آپ کے ساتھ آٹھ کر آئی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے طارق صاحب! میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں دنیا کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ایسی ہی وہ وفات کے بعد میں بیٹا بن کر اپنی گھر گئی کی کرتی ہوئی چھت کا ستون بنی ہوئی ہوں۔ میں ایک کیرئیر گرل ہوں۔ میرا دن میں کئی مردوں سے واسطہ پڑتا ہے اور اب میں مختلف مدارج کے لڑکے کے شعور کی ایسی منزل پر آ کر رہی ہوئی ہوں جو کھو۔ لے کھرے میں تیز کھاتی ہے۔ زندگی نے مجھ سے بہت کچھ جین کر شعور کی دولت، شناخت کی قوت عطا کی ہے۔ میں نے اپنے طور پر غلط انسان کا انتخاب نہیں کیا ہے لیکن اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میری منزل میں یا راستے کا وہ سنگ میل ہیں جس پر انسان تھک کر چند لمبے سستالیتا ہے یا وہ سان۔ اور درخت جس کے نیچے کوئی راہ چلتا مسافر چلائی روپ سے بیخ کر پناہ لے لے، تھوڑی دیر کے لیے۔“

”شہر۔“ طارق نے والہانہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہی؟“

”غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہی ہو؟“

”ہوں۔“

”پتہ ہے تیرے نام کا کیا مطلب ہے؟“

”ہاں!“۔ جیس، سورج ہی کو تو کہتے ہیں۔“

”تم مجھ سے جدا نہ ہونا، ورنہ دیکھ رہی ہونا یہ سورج کی رخصتی کا منظر۔ اس طرح ہر طرف لہو سا

دیکھا وہ وہ تو ایسا آپ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی، طارق صاحب! جھوٹ کے بادل جگ کے سورج کو ہمیشہ چھپا کر نہیں رکھتے۔ یہی مذہبی توجہ ظاہر ہو رہی جاتا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نہایت کی راہ ہمیشہ جگ بولنے میں ہی ملتی ہے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ میں یونہی الہی البرہی کی وجہ سے آپ کے ساتھ آٹھ کر آئی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے طارق صاحب! میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں دنیا کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ ایسی ہی وہ وفات کے بعد میں بیٹا بن کر اپنی گھر گئی کی کرتی ہوئی چھت کا ستون بنی ہوئی ہوں۔ میں ایک کیرئیر گرل ہوں۔ میرا دن میں کئی مردوں سے واسطہ پڑتا ہے اور اب میں مختلف مدارج کے لڑکے کے شعور کی ایسی منزل پر آ کر رہی ہوئی ہوں جو کھو۔ لے کھرے میں تیز کھاتی ہے۔ زندگی نے مجھ سے بہت کچھ جین کر شعور کی دولت، شناخت کی قوت عطا کی ہے۔ میں نے اپنے طور پر غلط انسان کا انتخاب نہیں کیا ہے لیکن اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ میری منزل میں یا راستے کا وہ سنگ میل ہیں جس پر انسان تھک کر چند لمبے سستالیتا ہے یا وہ سان۔ اور درخت جس کے نیچے کوئی راہ چلتا مسافر چلائی روپ سے بیخ کر پناہ لے لے، تھوڑی دیر کے لیے۔“

گھر نظر آ رہا ہے۔ اگر ہم ایک نہ ہو سکتے تو میرے ارمانوں کا بھی ایسے ہی خون ہو جائے گا۔“

”خدا کے لیے طارق ایسی بات منہ سے مت نکالیں۔“

شہر نے اس کے لیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اور پتہ ہے طارق کا کیا مطلب ہے؟“

”تو کوئی نہ والا تارا، جس کی قسم خداوند کریم نے قرآن مجید کی سورۃ طارق میں کھائی ہے۔“

”آف تاجہ کر دیا مجھے آپ نے تارے۔ بس آج کے بعد میں آپ کو تارای کہوں گی۔ تارا۔۔۔۔۔ میری قسمت کا تارا۔۔۔۔۔ جھلک کر روشن تارا!“ شہر آنکھیں بند کر کے کھوئی گئی۔

سورج اب اپنا سفر تمام کر کے آفتاب میں سر چھپا رہا تھا اور آفتاب کی لالہ رنگ پر یاں دریا کی لہروں پر ناچ رہی تھیں۔ اب اندھیرا ہونے ہی والا تھا طارق اور شہر نگاہوں میں پیار کے ہزاروں چراغ روشن کئے وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ جدائی کا یہ مرحلہ انتہائی تکلیف دہ تھا تاہم دھڑکتے دلوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ساتھ گزارے ہوئے ان بیٹھیاں ملحقات کو اپنی روح کے گوشوں میں کسی مقدس امانت کی طرح سنبھالے پھروں پر پاؤں رکھتے۔ دو لگے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ اوپر ”تو رست ان“ کی طرف چل دیے۔

جن دونوں طارق شہر کی تلاش میں سرگرداں و پریشان تھا اس کے گھر والے بھی سخت حیران و پریشان تھے۔ ان کے استفسار پر وہ بھی ان کو خاطر خواہ جواب نہ دے پایا تھا۔ آخر انہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید شادی کے بعد طارق کی ادائیگی ختم ہو سکے اس کے لیے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا اور آخر کار ایک امیر کیرئیر گھرانے کی لڑکی جو ابھی ابھی باؤس

جانب ختم کر کے ڈاکٹر بنی تھی انہیں پسند آئی تھی اور انہوں نے طارق کی بات وہاں ٹھہرا دی۔۔۔۔۔ جب وہ شمر سے مل کر آیا تو بے حد خوش تھا۔ اس کا خوشگوار موزا دیکھ کر بہنوں نے اسے گھیر لیا اور یہ خوشخبری سنائی سنتے ہی اس کی دنیا تھوڑا دھولا ہو گئی اور وہ سرگرم تھا مگر بیٹھ گیا۔ ابھی تو اس نے اربانوں کے سبکدوش بہار آفرین شبتان میں قدم ہی رکھا تھا کہ خزاں میں دیے پاؤں چلی آئی۔

”بھئی۔۔۔ بھئی یہ نہیں ہو سکتا۔“ طارق نے دل سے فیصلہ کیا اور دونوں بہنوں کو ساتھ لیے یہی سدا اپنی اہی کے پاس جا بیٹھا۔

”ای آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے آپ کی بتائی ہوئی کئی کئی لڑکی اب تک حامی نہیں بھری کیونکہ وہ میرے معیار پر پورا نہ آتی تھی اور شادی تمام زندگی کا معاملہ ہوتا ہے۔ کوئی ایک دو دن کی بات تو ہوتی نہیں چنانچہ میں اپنے معیار کی لڑکی تلاش کرتا رہا۔ میں خود اس کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ خوش قسمتی سے وہ لڑکی مجھ لگتی ہے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھ بپھر کی لیڈی ڈاکٹر سے میری بات طے کر دی ہے۔ امی میں ہرگز اس سے شادی نہیں کروں گا۔“ طارق نے جتنی اعزاز بھی اپنے کی بات سن کر امی سے پہلے تو تعجب سے بیٹے کی بات سن کر پھر جس سے سرگرا ہوئی۔

”آخر ہمیں بھی تو پتہ چلے تمہاری پسند کی لڑکی ہے کون؟ کسی ہے اور کس خاندان سے ہے وہ۔“

”وہی تو آج میں آپ کو بتانے لگا تھا۔“ قدیم شرفا کا خاندان ہے اگرچہ زیادہ دولت مند گھرانہ نہیں لیکن باعزت گزرا رہا ہے۔ لڑکی ہے حد حسین ہے، ذہین ہے۔ آج کل ایک جوئیر سکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔“ طارق نے بتایا۔

ہاں آں۔۔۔۔۔ ماں نے طنز سے ہنسا ہنسا۔

”خاندان تو پھر نہیں سے معلوم ہو گیا کہ بیٹی سے استانی گیری کروائی جا رہی ہے۔“

”ای آپ کو تو کم از کم اس طرح نہ کہنا چاہیے۔ برا وقت تو بادشاہوں پر بھی آجاتا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس لڑکی کا اخلاق اور بلند حوصلگی ہے کہ اس نے باپ کی اچانک بے وقت موت کے لیے بعد اپنی بیوہ اور اکل چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اپنا آپ قربان کر کے اپنی تعلیمی استعداد اور کچھ داری سے گھر کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا۔“

”نہج ہے نہج۔ اس نے تو اپنے کنبے کے لیے قربانی دی مگر بیٹا ہم کیوں ایک بڑے گھرانے کی ڈاکٹر لڑکی اور اتنا بڑا جینز چھوڑ کر اس کے لیے قربانی دیں۔ دیکھو طارق تمہیں ہمارے ساتھ ہر حال میں تعاون کرنا ہوگا۔“ امی نے رعب سے کہا۔

طارق کا سر گھومنے لگا۔

وہ بولا ”دیکھئے امی جی! اگر آپ اس وقت کو قربانی سمجھتی ہیں تو پھر میں بھی آپ کے اس لالچ اور خود غرضی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے کو تیار نہیں۔ میں اپنی مرضی کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ یہی تو ہمارے معاشرے کی برائی ہے کہ دولت اور ہنجر کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ نو دو لیٹے روساے سفید پوش قدیم شرفا کے حقوق پر ڈاکٹر ڈال رکھے ہیں اور ان کی (جیور) کی حق پرستی ہو رہی ہے۔ ذہانت، شرافت کو تو آپ بھی لوگ کوئی وقعت ہی نہیں دیتے۔ جیسی تو برائیاں اور غلط رعیتیں رواج پا رہی ہیں۔“ طارق نے سنجیدگی سے اختیار کر کے کہا۔

”اوہو! تو کیا تم نے ہی معاشرے کی غلط رعیتیں اور تمام برائیاں دور کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“

ماں نے طنز سے لہجہ نہیں کہا۔

”ایک آدمی دینا سے تمام برائیاں ختم نہیں کر سکتا

سامنے یہ میرے جواہرات کیا چیز ہیں۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر احساس کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ جس کے پاس یہ نہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے گدھے کے گلے میں جتنی گھنٹیاں اور منکوں کے ہار باندھ دو، اسے کیا پتہ۔ اسے تو گھاس کھانے اور دو لٹیاں چھانٹنے سے مطلب ہے۔ تم کسی لڑکی کو جو اپنے بیٹے کی لڑکی کا گلا گھونٹنے پر تیار ہو، لالچ کی بجلی ایک حد ہوتی ہے۔“ طارق ذرا گرم ہو کر بولا۔

”یہ سب فضول باتیں ہیں بیٹا۔ جب تم اچھی خاصی زندگی گزار لو گے تو پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ اس دنیا میں ہر شخص اپنے کو آگے بڑھانے، اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لیے دوسرے کا گلا کاٹنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ رہ گئی لالچ والی بات تو میرے ساتھ بھی دو بیٹیاں ہیں۔ اس گھرانے سے رشتہ جوڑنے کے بعد جو سوسائٹی میں ہمارے وقار اور شائستگی میں اضافہ ہو گا اس کا خوشگوار اثر ان کے مستقبل پر بھی پڑے گا۔“

”آپ سوسائٹی کے جس وقار اور شائستگی کا ذکر کر رہی ہیں امی، اسے تو شرفا کا متوسط طبقہ دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ آج آن پر جان دینے والے قدیم شرفا اپنی سفید پوشی میں سر چھپانے سسک سسک کر وقت گزار رہے ہیں۔ تو کیوں؟ اس لیے کہ آپ جیسے لوگوں کی سوچ کے انداز ہی بدل گئے ہیں۔ خیر جو بھی ہے امی۔۔۔۔۔ آپ ذرا یہ تو سوچیں کہ وہ لڑکی میری برسوں کی تلاش کا حاصل ہے۔ میری محنت ہے۔“ طارق کی آنکھوں سے چلتے خواہوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔

”چاہتا کہ چند بکتا ہی سچا اور منہ زور کیوں نہ ہو، دنیا اور قانون کی نظروں میں باجائز تعلقات کا نام ہے میرے بیٹے! آئندہ ایسے الفاظ منہ سے نکال

مگر اپنی کوشش سے کم از کم ایک برائی کو تو وہ ختم کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔“ طارق نے کہا۔

”مگر بیٹے یہ مت بھولو کہ دنیا دولت اور طاقت کے آگے جھکتی ہے۔“ ماں نے لاجوابی ہو کر کہا۔

”مگر آپ بھی یہ بات مت بھولیں کہ دولت اور طاقت مستقل رہنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ آج کل کے دو لیٹے لوگ ماں کی دولت کو خدا جیسے بیٹے ہیں اور اس کے حاصل کرنے کو مقدس حیات خیال کرتے ہیں۔ ان کے دل میں دے کر وہ کچھ دے کر دے

ہیں۔ ان کے ضمیر کی روشنی بجھ گئی ہے لیکن ایک انگلی کل آدمی کے احساس مختلف ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک مال و دولت کی کوئی قدر و حیثیت نہیں ہے۔“

طارق نے جواب دیا۔

”امی جان کر لینے دیں نا شادی بھائی جان کو جہاں ان کی مرضی ہے۔ ہمارے لیے تو جو بھی آئی ہماری پیاری بھائی ہی ہوگی اور پھر آخر ایک استانی سے شادی کر لینے میں عیب ہی کیا ہے؟“ طارق کی چھوٹی بہن فرزانہ نے ٹھٹھکے ہوئے کہا۔

”تم چپ رہو امی!“ دوسری بہن رخسانہ بولی۔

”تمہاری وہ بات ہے، آپا جی سلام، ہم تمہاری جوتی کے غلام۔ اور اگر اس نے بات ہے بات پر اپنی اٹھا کر کہہ دیا سفینہ آپ ان دنوں تو پھر کیا کرو گی؟“

ارے جیسی ہی ہم تو ڈاکٹر بھائی لائیں گے۔ اپنا ٹھیکہ کھولے گی تو دولت برے کی اور پھر باہر کے کسی ڈاکٹر کی محتاجی بھی ختم ہو جائے گی اور یہ ہے بڑا جینز بھی لائے گی ساتھ۔ میں تو اس سے ڈانٹنے کی انگوٹھی لوں گی جوڑے کے ساتھ۔“

”شرم کرو رخسانہ! مجھے معلوم نہ تھا تمہارے اتنے گھٹیا خیالات ہوں گے۔ تم نے انسان سے زیادہ ان پجروں کو وقت دے رکھی ہے لیکن تم سوچو تو سہی کہ جو کچھ تمہیں خدا نے دے رکھا ہے اس کے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر نہیں فرمایا کہ ”اعلم لیتنی“ یعنی علم تو رہے اور اسے حاصل کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور وہ ہستی یعنی استاد جو اس علم سے اس نور سے ہمارا سید منور کرتی ہے، قوم کے نو بہاولوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے، اس کا تو رجبہ اتنا بلند کیا گیا ہے کہ اساتذہ کو انبیاء اور صالحین کا ہم پیشہ قرار دیا گیا ہے۔ استاد ہی ایسی عظیم ہستی ہے جس کی تعلیم و تربیت سے آج انسان چاند ستاروں پر کندیس ڈال رہا ہے اور پھر حقیقت یہ ہے کہ جن ڈاکٹروں کو ہم اساتذہ پر ترجیح دے رہے ہیں کیا ان کا بھی تمام ٹیلنٹ بنیادی طور پر اساتذہ ہی کا مروہ بن منت نہیں ہے۔ اباجی! اگر ہم اسی طرح اساتذہ کے پیشے کو حقیر خیال کرتے رہے تو آئندہ آنے والی نسلوں کا کیا ہو گا۔ جب کوئی درس و تدریس کا پیشہ اپنانے پر تیار نہ ہو گا تو نئی نسل کو نقصان کی پیمان کون کرے گا؟“

طابق کی امی نے اس کے ابو کو تمام بات بتائی اور سمجھانے کی تاکید کی۔ انہوں نے بچے کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس رشتے کی اونچ نیچ کے بارے میں سمجھانا چاہا۔ کچھ مالی منفعت..... کچھ سوسائٹی میں وقار..... کچھ برادری میں اونچی ناک کا حوالہ دیا۔

”میری کچھ میں نہیں آیا اباجی! کہ آپ مجھے ایک نامہ چھوٹا بیچ کر اسے اصول میرے دماغ میں شونے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ اگر شرمہ بیٹم ہے اور دولت میں رہیں خاندانوں کا مقابلہ نہیں کرتی تو یہ بات اس کے ماتھے کا کلک کیسے بن گئی اور اسے پیادہ کر لانے سے آپ کی ناک کیسے چٹنی ہو جائے گی؟“ کیا ہمارے رسول ﷺ غریب نہ تھے، یم نہ تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی کو کتنا خیر دیا تھا؟ آپ مسلمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن اپنے پی ﷺ کی پیروی کرنے سے انکار کرتے ہیں اور پھر اگر شرمہ کا پیشہ معاشی یا درس و تدریس ہے تو یہ کام اس قدر گھناؤنا اور گھٹیا کیسے بن گیا کہ آپ اس لوہی کی برصلاحت پر پانی پھیرے دے رہے ہیں۔ کاش آپ ایک دفعہ اس سے مل کر ہی دیکھ لیتے۔ آپ کا تو مجھ سے زیادہ تجربہ اور علم ہے، کتنی عبادت کرتے ہیں۔ کیا

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر نہیں فرمایا کہ ”اعلم لیتنی“ یعنی علم تو رہے اور اسے حاصل کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے اور وہ ہستی یعنی استاد جو اس علم سے اس نور سے ہمارا سید منور کرتی ہے، قوم کے نو بہاولوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتی ہے، اس کا تو رجبہ اتنا بلند کیا گیا ہے کہ اساتذہ کو انبیاء اور صالحین کا ہم پیشہ قرار دیا گیا ہے۔ استاد ہی ایسی عظیم ہستی ہے جس کی تعلیم و تربیت سے آج انسان چاند ستاروں پر کندیس ڈال رہا ہے اور پھر حقیقت یہ ہے کہ جن ڈاکٹروں کو ہم اساتذہ پر ترجیح دے رہے ہیں کیا ان کا بھی تمام ٹیلنٹ بنیادی طور پر اساتذہ ہی کا مروہ بن منت نہیں ہے۔ اباجی! اگر ہم اسی طرح اساتذہ کے پیشے کو حقیر خیال کرتے رہے تو آئندہ آنے والی نسلوں کا کیا ہو گا۔ جب کوئی درس و تدریس کا پیشہ اپنانے پر تیار نہ ہو گا تو نئی نسل کو نقصان کی پیمان کون کرے گا؟“

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹے۔ استاد کی عظمت سے مجھے بھی کب انکار ہے لیکن ایک کاروباری آدمی ہمیشہ اپنے نفع نقصان کو پیش نظر رکھ کر بات کرتا ہے۔ دیکھو نا ایک ڈاکٹر اپنے ایک ہی کیس میں استاد کی پورے مہینہ کی محنت کا جتنا کم لیتا ہے۔“ طارق کے باپ نے کہا۔

”بھیا فرمایا آپ نے اباجی لیکن اس میں اساتذہ کا اپنا کیا قصور ہے؟ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ اساتذہ کو ان کی خدمات کا بیش بہا معاوضہ ادا کرے اور ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹروں پر بھی یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ وہ خلق خدا کی کمال اُتارنے سے باز آ جائیں۔ جب تک ایک ڈاکٹر طالب علمی کے دور میں ہوتا ہے خلق خدا کی خدمت کی رٹ لگاتے رکھتا ہے لیکن ڈاکٹر بننے ہی تو اس کا رویہ منہی ہو جاتا ہے۔ آپ جیسے لوگ ہی تو

خاموش تماشا بن کر معاشرے میں پیدا کی ہوئی
برائیوں کو پھینکے کا موقع دیتے ہیں ابھی۔ اور پھر
گستاخی منافق، مجھے تو ان لالچی لوگوں سے نفرت
ہے جو میری کے مال پر نظر رکھتے ہیں، چاہے دینی
طور پر مبالغہ نہ ہونے کے باعث تمام زندگی
روتے روتے ہی کیوں نہ گزار دیں۔ مجھے خدا
نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور میں اپنے زور بازو
سے کاموں کا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ ابھی جو کوئی اس
دنیا کے بسنے والوں کو دکھ سکھ بٹاتا ہے وہی عقیم
ہے اور اسی کے پاس اصلی اور سچی روحانی خوشی
ہوتی ہے مگر آپ تو میری اس تمام گفتگو کو ایک
شاعر کی فک سمجھ رہے ہوں گے کیونکہ آپ سب
کی آنکھوں پر تو روشندہ کے جھجک لست کی پٹی
بندھ چکی ہے لیکن اگر آپ نے مجھے رضامندی
سے اجازت نہ دی تو پھر میں خود ہی یہ قدم اٹھا
لوں گا کیونکہ زندگی میں نہ گزارنی ہے۔ آپ
نے نہیں۔“ طارق نے بے حد آزدگی سے اپنا
فیصلہ سنایا۔

”تم بے شک اس سے شادی کر لو لیکن میں
اسے اپنے گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔ وہ مجھی بھی
میرے گھر میں بڑی بھوکا تمام نہ پاسکی۔ نہ کسی
عزت کی حقدار ہوگی۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ
ایک غیر لڑکی کے لیے تم ماں کی نافرمانی کرو گے۔
آج سے میں تمہاری ماں نہ تم میرے بیٹے ہو۔ نہ
ہی میں تمہیں دودھ کی تیس دھاریں بخشوں گی۔“

طارق کی اسی دروازے میں کھڑی یہ تمام گفتگو
سن رہی تھی، یکدم اندر آگئی۔ طارق کے والد دم
بخورہ گئے۔ طارق کی باتوں نے تو ان کی آنکھیں
کھول دی تھیں اور وہ کسی اور انداز سے سوچ رہے
تھے لیکن بیوی کی ناقص خدمت نے ایک عجیب صورتحال
پیدا کر دی تھی۔

”بیٹے!“ انہوں نے طارق کو مخاطب کیا۔
”عورت ساس کے روپ میں ہمیشہ ظالم ہوتی
ہے۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں پرانی عورت اس کا
نازوں سے پالا بیٹا نہ چھین لے اور بدستی سے
تمہارے معاملے میں تو ابتدا ہی ایسے حالات سے
ہو رہی ہے کہ تمہاری ماں کی اتنا کھسکتا مل رہی
ہے۔ عورت کی نفسیات بھی ایک چکر ہی ہے۔ تم
نے آغاز ہی میں اس کی اتنا اور مذہب ملکیت کو کھینچ
کر دیا ہے جبکہ عورت اپنی سلطنت میں دوسری ملک
کو دیکھنا کسی صورت گوارا نہیں کر سکتی۔ بیٹے یہ
عورت، جس کے ماں کے روپ میں پاؤں تلے
جنت ہوتی ہے، جب اس کی اتنا بخور ہوئی ہے تو
پھر یہ اولاد کی زندگی جہنم بنانے سے بھی نہیں
چوکتی۔ بیٹا میری بات مان ہی لو۔ یہ تیل منڈھے
نہیں چڑھے گی۔ تمہاری تمام زندگی رستہ نشی میں
گزر جائے گی۔ روز کے رو لینے سے ایک دن رو
لینا بہتر ہے۔ ایک ہی دن رو کر صبر کرو۔ آخر
مرے ہوئے بھی میرا ہی جاتا ہے۔“

”نہیں ابھی! میں نے اس کے سامنے اپنے
اس نام کی قسم کھائی ہے جس کی خداوند کریم نے بھی
قرآن مجید میں قسم کھائی ہے۔ میں اس کے ساتھ
بے وفائی نہیں کر سکتا۔ ایک احقنا خدا کے آگے
تجسیر و ذال کر اس کا دل نہیں تو مسکدہ کا کس
آپ لوگوں نے مجھے جہنم دینے کی اتنی بڑی قیمت
مجھ سے طلب نہ کی ہوگی۔“

وہ یکدم اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا اور
پاؤں چٹتا ہوا کار کی طرف بڑھا مگر گاڑی لاک تھی
اور ڈرائیور چالی سمیت غائب تھا۔
”امیر خان..... امیر خان آ آ.....“ وہ غصے
سے چلا کر پکارا۔ اسے آگس سے دیر ہو رہی تھی۔
اپنے ارد گرد کو نہ پا کر طارق تیز تیز قدموں سے

طارق اسے لے کر اس کی امی سے چلے جاتا آیا۔
”بیٹے! میں تمہارے جذبات و احساسات کی
قدر کرتی ہوں۔“ ساری صورتحال سن کر وہ پولیس
”اگرچہ ہم زیادہ دولت مند نہیں ہیں لیکن ہم نجیب
الطریقین ضرور ہیں اور کافی اونچے خاندان سے تعلق
رکھتے ہیں۔ آج تک ہمارے خاندان میں اس قسم
کی شادی نہیں ہوئی۔ ہم نے شمرے کے باپ کے
مرنے کے بعد بھی نہایت عزت اور شرافت سے
زندگی گزارا ہے اور اب میں نہیں چاہتی کہ کوئی
ہم پر اٹلی اٹھائے۔“ وہ ڈھنڈی آہ بھر کر پولیس
”بیٹے تقسیم ہند کے دور میں بادشاہ فقیر ہو گئے
اور فقیر بادشاہ..... ایک افراتفری اور نفسانسی کا
دور تھا جو آکر چلا گیا مگر خاندانی شرفاء کے لیے پھر
وہ بات نہ بن سکی۔ بعض لوگوں نے ذاتی مفاد کے
لیے کسی قسم کے کردار ادا کئے جن کے لیے خاندانی
شرفاء کے ضمیر تیار نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ قدیم
خاندانی رؤساء منظر عام سے ہٹ کر کہیں پردہ چلے
گئے اور عام اور پچھلا طبقہ اپنی ذات اور نسل تبدیل
کر کے سامنے آ گیا اور اس طرح احساس کتری کا
ظکار ایک نو دولتیا طبقہ وجود میں آیا۔ جس کی اخلاقی
اقدار کی حد پچھرا اور ظاہری نام و نمود پر ہی آخر ختم
ہوتی ہے۔ میرے بیٹے! پرانے خاندان مٹ
گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی
آندھنیوں کی بجائے چڑھ گئیں۔ انقلاب زمانہ کے
ہاتھوں سونے کے برتنوں میں کھانے والے لوگ
تجائے کہاں کہاں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے نکل
گئے اور آج یہ عالم ہے کہ

۔ اوجھے کے ہاتھ تیز
باہر باندھوں کے بہتیر
جسے دیکھو اپنی ہی ذلتی بجائے جا رہا ہے۔
”آپنی آکر یہ آپ کے ہاں خاندانی مسئلہ ہے تو
سرواٹ کوائر کی طرف چل پڑا۔ ساتھ کے کوائر
کے سامنے کھیلنے والی اور جع دار کے بچوں نے حیرت
سے اس لال بھسکا چہرے والے صاحب کو دیکھا
اور وہاں سے کھٹک کڑے ہوئے۔ وہ کوائر کے
کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا سامنے چارپائی کے
پچھے سے دو انگلیں باہر نکلا آ رہی تھیں۔ اس نے زور
سے آواز دی تو امیر خان یک دم گھبرا کر کھڑی کہتا ہوا
ریس کھینکڑ کھینکڑاتے ہوئے چارپائی کے پیچھے سے
نکل آیا اور باہر نکل گیا۔“
”کیا یہاں کر رہے تھے؟“ طارق نے دھاڑ کر
پوچھا۔
”جی..... جی..... وہ..... خیر کا بچہ..... چوہا
..... میرا منظر لے کر چارپائی کے پیچھے گھس گیا تھا
..... میں تین دن سے اسے ڈھونڈ رہا تھا اور یہ اسے
مڑے مڑے سے کھا رہا ہے جی۔ یہ دیکھئے نا صاحب
جی۔“ اس نے اپنا منظر کھول کر دکھایا جس میں چابجا
سورج ہو چکے تھے۔ طارق نے امیر خان کی طرف
دیکھا۔ بالوں اور ناک پر چارپائی کے پیچھے سے مٹی
لگ جانے کی وجہ سے وہ بخند نظر آ رہا تھا۔
”خدا کے لیے امیر خان بھی تو انسان بن جایا
کر۔“ آگس نے جان میں دیر ہو رہی ہے۔ چلو جلدی
کر۔“
اس نے جب سے پچاس کا نوٹ اس کی طرف
اچھال دیا۔
”یہ اور لے لینا بازار سے۔“
آندھ ویک اینڈ پر طارق پھر شمرے کو ملنے گیا اور
تمام سرگزشت شانے کے بعد شمرے سے بھی کھد دیا
کہ میں والدین کو شال کے بغیر دوستوں کی برات لا
کر تم سے شادی کر لوں گا اور ہم علیحدہ مکان میں
ریں گے۔ شمرے بات سن کر پوری جان سے کانپ
گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں خنڈنے ہوئے گئے، تب

☆☆☆